موت کی تاریخ

انسان کے سب سے بڑے خوف کا ثقافتی، سائنسی اور نفسیاتی مطالعہ

تحقیق و ترجمہ: یاسر جواد

موت کی تاریخ

تحقیق و ترجمہ: یاسر جواد

موت کی تاریخ

انسان کے سب سے بڑے خوف کا ثقافتی، سائنسی اور نفسیاتی مطالعہ

تحقیق و ترجمہ
یاسر جواد

نگارشات پبلشرز
24- مزنگ روڈ، لاہور۔ فون 042-37322892 فیکس 042-37354205
e-mail:nigarshat@yahoo.com
www.nigarshatpublishers.com

نام کتاب: موت کی تاریخ
تحقیق و ترجمہ: یاسر جواد
ناشر: آصف جاوید
برائے: نگارشات پبلشرز، 24۔مزنگ روڈ، لاہور
Ph:0092-42-37322892 Fax:37354205
مطبع: حاجی حنیف پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ: عبدالستار 0333-4900629
سال اشاعت: 2011ء
قیمت: -/250 روپے

فہرست

ادب اور آرٹ

تاثرات

دیباچہ

انسان کی کائنات میں موت بھی زندگی جتنا ہی ایک عام اور ہمہ گیر 'عمل' ہے۔ ماہرین نفسیات اور ڈاکٹر اِسے ایک واقعہ کی بجائے عمل قرار دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ نیوکلیئر بم میں مرنے والوں کی موت بھی یک دم واقع نہیں ہو جاتی۔ اگر نفسیاتی حوالے سے بات کی جائے تو یہ عمل اور بھی طویل، پوری زندگی پر بھی محیط ہو سکتا ہے۔

موت کو انسان نے ہمیشہ سے ایک ہی انداز میں نہیں لیا۔ اب عموماً موت کی وجہ معلوم ہوتی ہے، جبکہ پچاس برس پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا۔ قبل ازیں موت اہل خانہ کے درمیان واقع ہوتی تھی، لیکن اب اکثر ہسپتال کے بستر پر ڈاکٹروں اور آلات کے درمیان آتی ہے۔ اِسی طرح آرٹ، فلسفہ، ادب، ثقافت وغیرہ میں بھی موت کا مفہوم اور اظہار بدل گیا ہے۔ بیسویں صدی کے آخری دو عشروں میں ایکشن فلموں نے موت کو ایک زیادہ رومانٹک اور شاندار انداز دیا؛ مگر بنیادی فلسفہ کافی حد تک وہی ہے: کہ گناہ یا جرم ہی موت تک پہنچاتا ہے، یا پھر نیک مقصد کی خاطر موت قبول کرنا احسن ہے۔ اِن دونوں تصورات کے ڈانڈے ہمارے ماضی بعید کی داستانوں اور قصوں سے جا ملتے ہیں۔ یہ قصے کسی نہ کسی صورت میں ہمارے شعور اور لاشعور کا حصہ ہیں۔

موت کو سمجھنے اور اس کی جانب 'درست' رویہ اختیار کرنے کا معاملہ ہنوز بحث طلب ہے۔ ہم سب 'ہزاروں سال' جینا چاہتے ہیں۔ اور اکثر اسی خواہش کے تحت ہم نے ماضی کے ہیروز اور کچھ افسانوی کرداروں کی زندگیاں کافی طویل بیان کیں۔ ہندوستان میں بیسویں صدی کے نصف اول تک اوسط عمر تیس برس سے زیادہ نہیں تھی، لیکن دیوتاؤں کو کروڑوں سال کی عمر کا حامل تصور کیا

گیا۔ ہم سبھی کے اندر ایک لافانی، تاابد قائم رہنے والی ہستی کا تصور موجود ہے۔ ہم بھی اُس میں سما کر ہمیشہ کے لیے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس مابعد الطبیعیاتی خواہش نے طبعی تناظر کو بھی تقریباً مکمل طور پر اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چنانچہ موت کا تصور کافی حد تک حیات بعد الموت کے تصور کے ساتھ منسلک ہے۔ درحقیقت اِن دونوں کے درمیان کوئی خطِ امتیاز کھینچنا کافی مشکل ہے۔ ہمارا مقصد اسی مشکل کام کی ایک ابتدائی سی کوشش کرنا ہے۔

زیرِنظر کتاب کے پہلے حصے میں موت کے مختلف تصورات اور نظریات کا مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرا حصہ نفسیاتی تحقیقات اور بحثوں پر مشتمل ہے۔ تیسرے حصے میں ادب اور آرٹ میں موت کی تصویر کشی پر مختصر مضامین شامل ہیں، جبکہ چوتھا حصہ ایک سائنس دان کی موت کے مراحل کی خودنوشتہ کہانی اور موت کے متعلق اہم لوگوں کی آرا پر مبنی ہے۔

مغربی دنیا میں یہ بحثیں زور وشور سے جاری ہیں کہ مرتے ہوئے شخص کی جانب کیا رویہ اختیار کیا جائے؟ کیا بچوں کو موت کے متعلق بتانا چاہیے یا نہیں؟ کیا موت کا مابعد الطبیعیاتی تصور ہمیں تقدیر پرستی پر مائل کرتا ہے؟...... یقیناً یہ بحثیں بہت اہم ہیں، کیونکہ یہ ہمارے نظریۂ دنیا کی تشکیل اور ترقی میں حصہ دار ہیں۔ میرے خیال میں ضرورت اِس امر کی ہے کہ موت کو بھی پیدائش جیسے ایک فطری عمل کی طرح دیکھا جائے۔ کائنات میں سب کچھ فانی اور جاری عمل ہے۔ اگر موت بھی واقعی ایک عمل ہے تو کیا ہم کائنات کی 'لافانی' روانی (چاہے اُس کی کوئی بھی صورت یا نام ہو) کا ہی ایک حصہ ہیں؟!؟!

یاسر جواد

حصہ اول

نظریات

1

موت: ثقافتی اور سائنسی پس منظر

موت کی سادہ سی تعریف یوں کی جا سکتی ہے: ''تمام زندہ نامیوں میں انجامِ کار حیاتیاتی عوامل کے رک جانے کا نام موت ہے۔'' انسانی موت کی حالت ہمیشہ سے ہی پراسراریت اور توہم کے پردے میں لپٹی رہی ہے۔ اس کی دوٹوک تعریف متنازعہ ہے اور ثقافتی و قانونی نظاموں کے مطابق بدلتی رہتی ہے۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں موت ایک عجیب و غریب مقبول موضوع بن گئی۔ حیرت انگیز طور پر اس وقت سے پہلے موت زیادہ تر سنجیدہ سائنسی اور کچھ حد تک فلسفیانہ قیاس آرائیوں کا موضوع بنی رہی۔ حیاتیاتی تحقیق میں اسے نظر انداز کیا گیا اور طبیب کے مشاہدات و تجربات سے ماورا ہونے کے باعث عموماً طبی پریکٹس میں اسے فالتو اور غیر ضروری خیال کیا جاتا رہا۔ تاہم، جدید دور میں موت کا مطالعہ ان تمام فکری نظاموں میں ایک بنیادی توجہ کا موضوع بن گیا ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک بوڑھی خاتون نے کسی اخبار کے وفیات والے صفحے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا تھا، ''آج کل بہت زیادہ لوگ مرتے ہیں۔'' یہ محض ایک فضول رائے نہیں تھی۔ بہت سے جرائد اب نہ صرف مرنے والوں کی فہرست دیتے بلکہ اُن کی موت کی وجہ بھی بتاتے ہیں، کبھی کبھی تو کافی تفصیل سے۔ وہ ایسے موضوعات پر آزادانہ گفتگو کرتے ہیں جو صرف ایک پشت قبل نہایت نازک اور نجی خیال کیے جاتے تھے۔ ٹیلی ویژن کے نمائندے مرنے والوں کے رشتہ داروں اور کبھی کبھی آخری سانسیں لیتے ہوئے شخص سے بھی سوالات کرتے ہیں، اور فلمیں بہیمانہ انداز میں قتل کے

مناظر دکھاتی ہیں۔ اب موت ٹیبوز کے حلقے سے باہر نکل آئی ہے۔ اِن معاملات پر توجہ دینے کی عام آمادگی اور اِن کے متعلق زیادہ بہتر طور پر معلومات حاصل کرنے کی خواہش ثقافتی رویوں میں ایک تبدیلی کی عکاسی کرتی ہے ...... بالکل اُسی طرح جیسے پہلی عالمی جنگ کے بعد سیکس پر گفتگو کھلِ عام ہونے لگی تھی۔

علم الموت (Thanatology) مختلف معاملات پر غور کرتا ہے: مثلاً نظریۂ روح کا ثقافتی پس منظر، ابتدائی تہذیبوں کی تجہیز و تدفین کی رسوم، قرونِ وسطیٰ میں قبرستانوں کے لیے مختص کردہ جگہیں اور ایسے شخص کی موت کی تعریف کرنے میں ملوث نظری مشکلات جس کا دماغ تو مردہ ہو گیا ہو لیکن جس کی سانس اور دل کی دھڑکن مصنوعی طریقے سے جاری ہو۔ یہ سیل کی موت، موت گرفتہ شخص کی دیکھ بھال وغیرہ کے حیاتیاتی مطالعہ کا احاطہ کرتا ہے۔ موت کی تعریف کے حوالے سے قانونی اور طبی مشکلات اور صعب العلاج مریضوں (اور اُن کے اہلِ خانہ) کی جانب سے علاج جاری رکھنے سے انکار کے حقوق کے باعث ڈاکٹر وکیلوں کی طرح اور وکیل ڈاکٹروں کی طرح اور دونوں فلسفیوں کی طرح سوچنے پر مجبور ہیں۔ رومن مصنف پلائنی اکبر نے اپنی کتاب "Historia Naturalis" (فطری تاریخ) میں لکھا کہ "انسانوں کی قوت اِدراک اِس قدر غیر قطعی ہے کہ وہ موت کا بھی تعین نہیں کر سکتے۔" چیلنج بدستور موجود ہے، لیکن اگر انسان اب بھی کوئی جواب مہیا نہ کر سکے تو اِس کی وجہ کوشش میں کمی نہیں ہوگی۔

موت کا مفہوم:

اِس موضوع پر متعدد حوالوں سے بات کی جا سکتی ہے۔ مثلاً ہم اِسے تاریخی، شاعرانہ، علمی و ادبی، تصویری، آرٹسٹک اور سماجی تناظر میں دیکھ سکتے ہیں۔ جنگ میں مرنے والوں کی لاشوں اور اُن کے کٹے ہوئے اعضا کی تصویر کشی نے قدیم مصری آرٹ میں کافی نمایاں حیثیت حاصل کی۔ تیرہویں صدی قبل مسیح میں حتیوں کے خلاف مصری بادشاہ رعمسیس دوم کی ایک مہم اور بالخصوص جنگ کدیش کو اُنیسویں اور بیسویں سلطنت کے بالائی مصری معبدوں میں بڑی ہول ناک تفصیل کے ساتھ ریکارڈ کیا گیا۔ اشوری آرٹ نے بھی جنگ جوؤں کو پیش کیا۔ ساتویں صدی قبل مسیح کے بادشاہ اشور بنی پال نے عربی بادشاہت کے خلاف مہم میں زبردست قتلِ عام کیا، لہٰذا گِدھوں کو لاشوں کی آنکھیں نوچتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ موت کے مفہوم کی نہایت ٹھوس انداز میں یہ تصویر

کشی غالباً بنیادی طور پر پراپیگنڈا مقاصد کے لیے تھی۔ نیز اِس کا مقصد فاتحین کی خود اعتمادی کو بڑھانا اور مفتوحین میں خوف و ہراس پیدا کرنا تھا۔ موت کے دیوتا بہت سی ابتدائی ثقافتوں میں موجود تھے، لیکن قدیم مصر کو چھوڑ کر کہیں بھی یہ کوئی اہم آرٹسٹک اظہار نہیں پا سکے۔ یونان اور روم دونوں میں کچھ مشہور سنگ تراشوں نے کچھ حیرت انگیز مقابر بنائے، لیکن اصل میں قرونِ وسطیٰ کی عیسائیت نے ہی اِس رجحان کو تقویت دی۔ غالباً اِس کا مقصد زندہ لوگوں کے دل میں مرنے والے کی یاد کو پائیدار بنانا تھا۔ ڈھانچے کی صورت میں موت کو پیش کرنے کا رجحان وسیع پیمانے پر قرونِ وسطیٰ کے مسیحی آرٹ میں ہی نظر آتا ہے۔ (دیکھیں "جدید آرٹ اور موت")

ایک اور انداز مختلف نظریہ ہائے حیات بعد الموت میں موت کے مفہوم پر غور کرتا ہے۔ انسان واحد ایسی نوع ہیں جو اپنے مردوں کو منظم انداز میں ٹھکانے لگاتے ہیں۔ موت کی رسوم و رواج کا مطالعہ مردے کی موجودگی میں مذہبی عقیدے اور عوامی دستور کے درمیان تعلق میں ظاہر ہوتا ہے۔ اِس نکتۂ نظر کی ابتدا اُن مختلف ثقافتوں (مثلاً فنیقی، قدیم یہودی، ہومری، اپی قوری، رواقی) میں موت کے مفہوم کے ساتھ ہوتی ہے جن میں صرف ایک سایہ نما حیات بعد الموت کا تصور کیا گیا یا جن میں حیات بعد الموت پر یقین ہی نہیں کیا جاتا۔ یہ نکتۂ نظر دیگر روایات (مثلاً سومیری - عکادی) کا تجزیہ بھی کرتا ہے جن میں بکثرت ابہام اور تنازعات موجود تھے؛ اور ایسی ثقافتوں کا مطالعہ بھی شامل ہے (مثلاً قدیم مصری، زرتشتی، ہندو، آرفک، افلاطونی، عیسائی، فریسیائی یہودی اور اسلامی) جن میں ایک "طبعی قسم کی" حیات بعد الموت یا روح کے لافانی پن کا عقیدہ مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔

تاریخی اور معادیاتی دونوں طریقے ایک مشترکہ فائدہ رکھتے ہیں: اُن سے پہلے موت کی ایک تعریف نہیں کرنا پڑتی۔ وہ موت کو ایک بہ آسانی متعین کردہ تجربی حقیقت کے طور پر لیتے ہیں اور اِن کے لیے بحث یا مزید توضیح کی ضرورت نہیں۔ لیکن جدید طب اور حیاتیات میں ایک تصوراتی بحران پیدا ہوا، ایسا بحران جو اِس احساس کا نتیجہ ہے کہ موت کی تعریف ...... جسے ہزاروں برسوں کے دوران بس یونہی لیا گیا ...... از سرِ نو جانچ پڑتال کی متقاضی ہے۔ حیاتیاتی نکتۂ نظر سے موت کے موضوع پر بات کرنا شاید سب سے زیادہ مشکل اور بجا طور پر جرأت آزما ہے، اور یہ ہمارے جدید دور کی نہایت اشد ضرورتوں کی عکاسی کرتا ہے۔

بہت سی لغات موت کی تعریف ''زندگی کی معدومیت،'' ''ہستی کا خاتمہ'' یا ''حیاتیاتی وظائف کا مکمل خاتمہ'' کے طور پر کرتی ہیں۔ چونکہ خود ''زندگی'' کی کوئی تعریف کرنا بھی مشکل ہے...... اور چونکہ ہر شخص اپنی معلومات کی بنیاد پر چیزوں کے متعلق سوچتا ہے...... لہٰذا موت کی تعریف کی راہ میں حائل مسائل فوراً واضح ہو جاتے ہیں۔ زندگی کی مفید ترین تعریفات وہ ہیں جو فعالیت اور کارکردگی پر زور دیتی ہیں، چاہے فزیالوجی، مالیکیولر بائیالوجی اور بائیوکیمسٹری، یا جنیٹک قوائیت کی سطح پر۔ ان وظائف کے ناقابلِ تلافی نقصان کو ہی موت سمجھنا چاہیے۔

آئندہ صفحات میں موت کی حیاتیاتی تعریف تلاش کرنے کے دوران بار بار پیش آنے والے مسائل پر بات کی گئی ہے۔ اس کے بعد انسانی موت کے ساتھ تعلق میں ان مسائل کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے یہ مضمون دو بڑے نکات اُٹھاتا ہے: (1)۔ کسی فرد کی موت کے لیے دماغ کی موت بنیادی اور کافی وجہ ہے؛ اور (2)۔ دماغ کی موت کا فزیالوجیکل مطلب دماغ کے تنے (Brain Stem) کا مردہ ہو جانا ہے۔ ہم یہ بھی غور کریں گے کہ تاریخ کی مختلف ثقافتوں میں انسانی موت کا کیا مفہوم لیا جاتا رہا ہے۔ ایسا کرنے کے ذریعہ یہ دکھانے کی کوشش کرتا ہے کہ دماغ کے تنے کی موت حیاتیاتی اور فلسفیانہ دونوں اعتبار سے ایک موزوں تصور ہے۔

حیاتیاتی مسائل:

آیا آپ انفرادی سیلز کی موت، چھوٹے کئی سیلز والے نامیاتی اجسام کی موت یا کسی انسان کی موت کو لیں، لیکن ایک ہی جیسے مخصوص مسائل سے بار بار سامنا ہوتا ہے۔ طبعیات دان موت کی entropy (انقطاعِ توانائی) میں تبدیلی اور تھرموڈائنامکس کے دوسرے قانون کے حوالوں سے متعین کرنے کی کوشش میں مشکلات سے دوچار ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہسٹالوجسٹ (خوردبین سے ٹشوز کا مطالعہ کرنے والا) ایک الیکٹرون مائیکروسکوپ کے ذریعہ مرتے ہوئے ٹشو کو دیکھ سکتا ہے۔ پوپ پائیس XII نے 1957ء میں اینستھالوجسٹس کی ایک بین الاقوامی کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے یہ سوال اُٹھایا تھا کہ انتہائی نگہداشت وارڈ میں روح جسم سے حقیقتاً کب نکلتی ہے۔ نسبتاً زیادہ سیکولر رجحانات رکھنے والے فلسفیوں نے درین اثناء غور و فکر کیا ہے کہ انسانی فطرت میں کونسی ایسی لازمی چیز ہے جس کے زیاں کو موت سے تعبیر کیا جا سکے۔ اعضاء کا عطیہ دینے کا فیصلہ کرتے وقت

یہ چیز خاص طور پر اہمیت حاصل کر لیتی ہے۔

موت: ایک عمل یا واقعہ:

امریکی ڈاکٹر اور مصنف اولیور وینڈل ہولمیس نے کہا ہے، ''زندہ رہنے کا مطلب فعالیت ہے۔'' لیکن کیا موت پورے نامیاتی جسم (یا خلیے) کی فعالیت ختم ہو جانے کا نام ہے؟ یا یہ نامیاتی جسم یا خلیے کا بہ حیثیتِ مجموعی فعالیت سے محروم ہو جانا ہے، یعنی ایک بامعنی اور خود مختار حیاتیاتی اکائی نہ رہنا؟ دونوں سوالات کے درمیان فرق کا ادراک کرنا موت کے متعلق بہت سے جدید تنازعات کو سمجھنا ہے۔ دو گرفتگی کو بیان کرنا واضح طور پر ایک کہیں زیادہ وسیع حلقے سے تعلق رکھتا ہے: تہذیبیں منتشر ہو جاتی ہیں لیکن اُن میں شامل معاشرے بدستور زندہ رہتے ہیں۔ معاشرے بکھر جاتے ہیں لیکن اُن کے شہری زندہ رہتے ہیں؛ افراد مر جاتے ہیں لیکن اُن کے خلیے بدستور تحول جاری رکھتے ہیں؛ اور خلیے مردہ ہو جاتے ہیں لیکن اُن سے خارج ہونے والے اینزائمز فعال ہی رہتے ہیں۔

اگر فطرت منضبط اور منظم ہوتی تو اس قسم کے مسائل پیدا نہ ہوتے۔ تقریباً تمام صورت ہائے حالات میں موت ایک واقعہ کی بجائے ایک عمل ہے۔ نیوکلیئر دھماکے کے شکار لوگ بھی بلبلہ پھٹنے کی طرح ایک دم نہیں مر جاتے۔ ایک نہایت ''کلاسیکل'' موت شاید موت کو بہترین انداز میں بطور عمل پیش کرتی ہے۔ دل کی دھڑکن رک جانے کے کئی منٹ بعد ایک منی الیکٹروکارڈیوگرام ریکارڈ کیا جا سکتا ہے۔ تین گھنٹے بعد بھی پائیلوکارپین ڈراپس ڈالنے جانے پر آنکھوں کی پتلیاں ردعمل دے سکتی ہیں اور پٹھے بار بار تھپتھپائے جانے پر کھنچ سکتے ہیں۔ دل کی دھڑکن رک جانے کے چوبیس گھنٹے بعد بھی مردے کی جلد کا نمونہ لے کر کسی اور کی پیوندکاری ممکن ہے۔ جبکہ دل کی دھڑکن قطعی طور پر رکنے کے 72 گھنٹے بعد شریان کا ٹکڑا کاٹ کر کسی اور مریض کو لگایا جا سکتا ہے۔ ہمارا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آکسیجن کی فراہمی بند ہونے کے بعد سیلوں کی زندگی کا دورانیہ کافی مختلف ہے۔

اسی طرح کے لیکن زیادہ سنگین مسائل اُس وقت سامنے آتے ہیں جب دماغ تو مردہ ہو جائے لیکن دل اور دیگر اعضاء کو مصنوعی طور پر ٹھیک ہی رکھا جائے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان حالات میں نامیاتی جسم کو بحیثیتِ مجموعی مردہ قرار دیا جا سکتا ہے، چاہے اُس کے سیلز کی اکثریت ابھی زندہ ہی ہو۔

ناقابلِ واپسی موڑ:

موت کو ایک عمل قرار دینے سے مراد یہ نہیں ہے کہ یہ عمل ایک متواتر اور مساوی شرح سے آگے بڑھتا ہے، یا یہ کہ اس کے اندر "ناقابلِ رجعت موڑ" موجود ہیں۔ اصل چیلنج اِن مواقع کو مختلف حیاتیاتی نظاموں کے لیے زیادہ درستگی کے ساتھ شناخت کرنا ہے۔ کلینکل سطح پر خون کی گردش کے ناقابلِ تنسیخ طور پر خاتمے کو صدیوں سے ہی حتمی مرحلہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس نے نامیاتی جسم کے لیے بہ حیثیتِ مجموعی ایک عملی اور درست کسوٹی مہیا کی ہے۔ نیا پہلو یہ جان کاری ہے کہ خون کی گردش کا رکنا موت کا میکنزم ہے نہ کہ موت کا فلسفیانہ تصور؛ کہ دل کی دھڑکن کا رکنا صرف تبھی مہلک ہے جب یہ اتنی دیر تک رہے کہ دماغ کے تنے میں اہم مراکز مردہ ہو جائیں؛ اور یہ کہ دماغی تنے کا کوئی متبادل نہیں ہے۔

ناقابلِ رجعت مرحلے کا تعین کرنے میں ناکامی نے سارے زمانوں کے دوران میڈیکل پریکٹس پر دلچسپ اثرات مرتب کیے ہیں۔ قدیم یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس کے مطابق اہلِ تھریس اپنے مُردوں کو دفنانے سے قبل تین دن تک رکھتے تھے۔ رومن نسبتاً زیادہ عرصے کے لیے رکھتے تھے؛ رومن مصنف سرویئس نے ورجل کی شرح میں لکھا ہے کہ "اُنہوں نے آٹھویں دن لاش کو جلایا اور نویں دن راکھ قبر میں دفن کی۔" اکثر خون کے جامد ہو جانے کا یقین کرنے کے لیے ایک انگلی کاٹ کر دیکھی جاتی تھی۔ سولہویں صدی کے فلیمش طبیب آندریاس ویسالیئس کو 1564ء میں سپین سے عجلت میں فرار ہونا پڑا۔ وہ ایک امیر آدمی کی لاش کا پوسٹ مارٹم کر رہا تھا کہ اُس میں زندگی کی علامات ظاہر ہو گئیں۔ یہ ہسپانوی عدالتِ احتساب کے عروج کا دور تھا۔ ویسالیئس کو صرف اس شرط پر معافی ملی کہ وہ یروشلم میں Holy Sepulchre کی زیارت کرے گا۔

زندہ دفن کیے جانے کا خوف طویل عرصہ سے انسان کے ذہن میں منڈلا رہا ہے۔ مثلاً اُنیسویں صدی کے دوران میڈیکل تحریروں میں "زندہ قبروں" کا ذکر ملتا ہے۔ نتیجتاً یہ مطالبہ کیا جانے لگا کہ لاش سے بو آنے کو موت کی حتمی تشخیص خیال کیا جائے۔ موت اور بعد از موت حالات کے موضوع پر امریکی مصنف ایڈگر ایلن پو کی کہانیوں کی اشاعت کے باعث اِس قدر سراسیمگی پھیل گئی کہ ایک روسی کاؤنٹ کارنیس کارنیک نے مخصوص قسم کا ایک تابوت پیٹنٹ کروایا۔ اگر "لاش" تدفین کے بعد دوبارہ ہوش میں آ جاتی تو جھنڈوں اور گھنٹیوں کے ایک نظام کے ذریعہ

باہر سے کسی کو مدد کے لیے بلا سکتی تھی۔ اشتہارات میں اِس کی قیمت "نہایت معقول، صرف پچیس شلنگ" بتائی گئی۔

صدی کے اختتام پر سنسنی خیزی کے دلدادہ پریس نے بار بار لکھا کہ "مٹی تلے بہت سے بدنما راز دبے ہوئے ہیں۔" شاید اِن دعووں کی کچھ نہ کچھ بنیادیں بھی ہوں گی: طاعون، ہیضہ اور چیچک کے دوران غشی اور ظاہری موت کافی عام تھی۔ ہسپتال بھرے پڑے تھے اور انفیکشن پھیلنے کا خطرہ بہت زیادہ تھا۔ اخباری رپورٹس کے نتیجے میں موت کی توثیق کے حوالے سے زیادہ سخت قوانین بنائے گئے۔ یو۔ کے میں موت کی تاریخ رجسٹر کرنے کو 1874ء میں لازمی قرار دیا گیا، اور اُس دور میں بھی ڈاکٹر کے لیے لاش کا معائنہ کرنا ضروری نہیں تھا۔

بیسویں صدی کے نصف آخر نے انتہائی نگہداشت کے حوالے سے کافی ترقیوں کا تجربہ کیا اور حتمی موت کے نقطے کے حوالے سے نئے تنازعات اُبھرے۔ اب جدید ٹیکنالوجی نے مصنوعی طریقوں سے تنفس، دل کی حرکت، خوراک اور ڈیالیسس دینے کے ذریعہ دماغ کی موت کے بعد بھی جسم کو "زندہ" رکھنا ممکن بنا دیا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کی اِن مصنوعات کے باعث موت کے مختلف اجزا کے درمیان لاتعلقی پیدا ہو گئی ہے۔ لہٰذا اب سے اہم واقعہ...... یعنی دماغ کی موت...... دیگر افعال مثلاً تنفس اور دل کی دھڑکن وغیرہ سے پہلے واقع ہوتا ہے نہ کہ بعد میں۔ اس قسم کے کیسز نے عملی اور تصوراتی دونوں قسم کے نتائج پیش کیے ہیں، لیکن اگر گردن کٹنے کے دوران پیش آنے والی صورتِ حال کو زیادہ بہتر انداز میں سمجھا جاتا تو کم از کم تصوراتی مسائل تو نہ پیدا ہوتے۔

انتہائی نگہداشت یونٹس کے دور سے طویل عرصہ پہلے ہی "دھڑکتے دل والی لاشیں" عام چیز تھیں۔ 1930ء کی دہائی کے وسط میں بنکاک سکوائر میں سرِعام گردن کاٹنے کے ایک واقعہ کی فوٹوگراف اِسی قسم کی ایک مثال پیش کرتی ہے۔ مجرم کو ٹکٹکی سے باندھا گیا اور اُس کا سر کٹا ہوا ہے، لیکن گردن میں شریانوں سے بدستور خون اُبل رہا ہے جو دل کی دھڑکن جاری رہنے کی علامت ہے۔ لیکن شاید ہی کوئی شخص سر کٹے مجرم کو زندہ قرار دے گا۔ یہ خوف ناک مثال تین نکات پر زور دیتی ہے: یہ اِس حقیقت کی حمایتی ہے کہ موت ایک واقعہ نہیں بلکہ ایک عمل ہے؛ اِس کے مطابق اِس عمل میں ایک حتمی نقطہ موجود ہے؛ یہ بہ حیثیتِ مجموعی نامیاتی جسم کی موت اور پورے نامیاتی جسم کی موت کے درمیان فرق واضح کرتی ہے۔ نتائج پر غور کرتے ہوئے آپ دماغی موت کو سمجھنے کی

جانب اولین قدم اُٹھاتے ہیں۔ مجرم کا سر طبعی طور پر تن سے جدا ہو گیا۔ دماغی موت ایک طرح سے فزیالوجیکل اعتبار سے سر کٹ جانے کے مترادف ہے: یہ اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب کھوپڑی کا اندرونی دباؤ شریانوں کے دباؤ سے بڑھ جائے، اور یوں دماغ کو خون کی سپلائی بالکل اُسی طرح منقطع ہو جائے جب سر کٹتا ہے۔ یہ مثال اِس قضیے کے تعارف کا کام دیتی ہے کہ دماغ کی موت فرد کی موت کے لیے ایک لازمی اور کافی شرط ہے۔

1968ء میں سڈنی میں 22ویں ورلڈ میڈیکل اسمبلی کے موقعہ پر اِن ایشوز پر معتبر انداز میں بحث کی گئی۔ اسمبلی نے کہا کہ ''کلینکل دلچسپی الگ الگ خلیوں کی محفوظ بنائی گئی حالت میں نہیں بلکہ کسی شخص کے مقدر میں ہے۔ مختلف خلیوں اور اعضا کی موت کا نقطہ اتنا اہم نہیں جتنا کہ اِس عمل کے ناقابلِ تنسیخ ہونے کا قطعی پن ہے۔'' جدید میڈیکل سوچ پر اِس بیان کا اثر بہت عمیق تھا۔ ''بحیثیتِ مجموعی نامیاتی جسم کی کارکردگی کا ناقابلِ تنسیخ نقصان'' موت کی تسلیم شدہ کلینکل کسوٹی بن گیا۔

اِس سیکشن میں پیش کیے گئے کچھ اختلافات کی وجہ لسانی نوعیت کی ہو سکتی ہے۔ انگریزی سمیت بہت سی زبانوں میں لفظ 'موت' مختلف طریقوں سے استعمال ہو سکتا ہے۔ مثلاً کنسائز آکسفورڈ ڈکشنری موت کو مرنے اور مردہ دونوں حوالوں سے بیان کرتی ہے۔ 'تکلیف دہ موت' اور 'دھیرے دھیرے موت' جیسے تاثرات دکھاتے ہیں کہ یہ اصطلاح اول الذکر مفہوم میں کتنی زیادہ استعمال ہوتی ہے۔ بہت سے لوگ مرنے سے ڈرتے مگر بڑے صبر و استقامت کے ساتھ مردہ ہونے کے امکان کا سامنا کرتے ہیں۔ موت کے متعلق بحث میں گڑبڑ پیدا کرنے والی ایک اور چیز وہ ہے جسے عظیم انگریز ریاضی دان اور فلسفی الفرڈ نارتھ وائٹ ہیڈ نے ''غیر موزوں درستگی پر بھروسہ'' قرار دیا تھا۔ یہ اُس وقت ہوتا ہے جب آپ کسی تجرید کو اِس طرح لیں جیسے وہ بذاتِ خود مادی چیز ہو۔ مثلاً تشبیہاتی انداز میں سوال کیا جا سکتا ہے کہ ''اے موت، تیرا ڈنک کہاں ہے!'' لیکن اِس قسم کے سوالات محض ماہرِ حیاتیات کو گڑبڑا ہی سکتے ہیں۔

اُنیسویں صدی کے اختتامی برسوں سے لے کر دورِ حاضر تک سیلز کے بڑھنے کا انداز جاننے پر بہت زیادہ تحقیق کی گئی ہے۔ سیلز کی موت کے انداز اور وجہ کا سوال کافی حالیہ دور کا ہے۔ ''سیل کی موت'' کی اصطلاح پہلی مرتبہ 1979ء میں میڈیکل لٹریچر کی ایک انڈیکس ''Index Medicus''

میں استعمال ہوئی تھی۔

پیتھالوجی کی زیادہ تر نصابی کتب میں سیل کی موت کو عموماً مجموعی طور پر سیلوں کے ایک گروپ کی موت قرار دیا گیا ہے۔ یہ ایک ابنارمل نامیاتی صورت ہے جس کا سراغ خوردبین کے ذریعہ کسی ٹشو میں لگایا گیا۔ ملحقہ سیلز کے گروپس کو متاثر کرنے والی تبدیلیوں کی وجہ عموماً ایکسیڈنٹ، چوٹ یا بیماری خیال کی گئی ہے۔ سیل کی موت کی ماحولیاتی وجوہ میں آکسیجن سے محرومی، شدید جسمانی حرارت اور ایسے زہریلے مادوں کی موجودگی شامل ہیں جو سیلوں کے اندر میٹابولک عوامل کو روک دے۔

ثقافتی پس منظر

ساری تاریخ میں مخصوص ثقافتی پہلوؤں نے موت کے متعلق انسانوں کے تصورات کو متاثر کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ مختلف معاشروں میں ''زندگی بخش سانس'' اور موت کے وقت ''روح کے جسم سے نکلنے'' کے بارے میں متنوع خیالات ملتے ہیں۔ یہ تصورات قابلِ غور ہیں کیونکہ (1) وہ عوامی عقیدے کے اہم عناصر پر روشنی ڈالتے ہیں؛ (2) کیونکہ ابتدائی عقائد اور موجود عقائد کے درمیان طے کیا گیا سفر پیش کرتے ہیں؛ اور (3) کیونکہ دماغی تنے (brain-stem) اور اعضا کی پیوند کاری کے فلسفیانہ جواز کے متعلق معاصر بحثوں میں مخصوص پرانے نظریات کا کافی عمل دخل ہے۔ چنانچہ آئندہ صفحات میں ہمارا مقصد موت کے جدید تصور کا موازنہ مخصوص ثقافتی تصورات کے ساتھ کرنا ہے۔ موت سے متعلقہ رسوم و رواج کا ذکر ایک علیحدہ باب میں کیا جائے گا۔

قدیم مصر:

قدیم مصر میں غالب دو نظریات نے دیگر ثقافتوں میں تصورِ موت پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ اوسائی رس کی اسطورہ میں مجسم پہلا نظریہ مرنے اور دوبارہ زندہ ہونے والے ایک منجی یوتا کا ہے جو اپنے کچھ پجاریوں کو لافانیت کا تحفہ دے سکتا ہے؛ اِس حیات بعد الموت کی جستجو سب سے پہلے فراعین اور پھر کروڑوں عام لوگوں نے کی۔ دوسرا تصورِ موت کے بعد حساب کتاب کا ہے جس میں مرنے والے کی زندگی کے حالات ہی اُس کے انجام کا تعین کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مصری معاشرہ مُردوں، دیوتاؤں اور زندہ لوگوں پر مشتمل تھا۔ قدیم مصریوں نے اپنی تاریخ کے ادوار کے

دوران موت کے متعلق سوچ بچار کرنے اور حیات بعد الموت کی تیاریاں کرنے پر کافی زیادہ وقت صرف کیا۔ مقبروں کی وسعت، متاثر کن کردار اور جلال اِس خبط کی شہادت دیتے ہیں۔

جسم کو طبعی طور پر محفوظ رکھنا حیات بعد الموت سے متعلق تمام پریشانیوں میں مرکزی حیثیت کا حامل تھا: اہلِ مصر عملی لوگ تھے اور جسم کے بغیر وجود کا نظریہ اُن کے لیے قطعی نا قابلِ قبول رہا ہوگا۔ شخص کے اجزا کو کثیر، رقیق اور پیچیدہ تصور کیا گیا: نیز خیال تھا کہ موت کے وقت وہ مختلف انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔ کسی شخص کا طبعی جسم اُس کا 'خت' تھا...... یہ اصطلاح خلقی انحطاط کا مفہوم رکھتی ہے۔ 'کا' کسی فرد کا ثنیٰ یا ہم زاد تھا: یہ شخص کی تمام خوبیوں اور خامیوں سے متصف تھا۔ قطعی طور پر یہ بتانا ناممکن ہے کہ زندگی کے دوران 'کا' کہاں رہتا، لیکن ''اپنے 'کا' کے پاس جانا'' عموماً موت کا مترادف جملہ تھا۔ 'کا' طاقت اور خوش حالی کا مفہوم رکھتا تھا۔ موت کے بعد یہ کھانے، پینے اور ''لوبان کی مہک سے خوش ہونے'' کے قابل تھا۔ اِسے کھانا کھلانا پڑتا، اور یہ کام پجاریوں کے مخصوص گروپ کو سونپا گیا۔ 'کا' متوفی کو راحت اور تحفظ دیتا: ہیروگلفی رسم الخط میں اِس کی علامت بانہیں پھیلائے کھڑے آدمی جیسی ہے۔

'با' (جس کا ترجمہ اکثر 'روح' کیا جاتا ہے) اعلیٰ اور ارفع کے تصورات کا حامل ہے۔ یہ جسم میں حلول کرنے یا اُس سے باہر نکلنے کا اہل تھا۔ غالباً اِس کی فعالیت کا مفہوم واضح کرنے کی خاطر اِسے انسان کے سر والے عقاب کے طور پر پیش کیا گیا۔ 'با' جذباتی طور پر مردہ جسم سے منسلک رہتا، کیونکہ وہ اِس کی فلاح کا ذمہ دار تھا۔ اِسے عموماً مقبرے کے دالان کے اِرد گرد اُڑتے یا کسی قریبی درخت پر بیٹھے ہوئے دکھایا گیا۔ اگرچہ اِس کی طبعی بنیاد صحیح طرح واضح نہ کی گئی، لیکن یہ محفوظ بنائے گئے جسم کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

دیگر اہم اوصاف فرد کی 'خو' (روحانی ذہانت)، 'سخم' (طاقت)، 'شے ہت' (سایہ) اور 'رین' (نام) تھے۔ چھٹی سلطنت (2345 تا 2182 ق م) کے بادشاہ پپی اول کے ہرم میں درج کیا گیا ہے کہ مردہ بادشاہ کس طرح ''اُس فولاد میں سے گزرا جو آسمان کی چھت ہے۔ چیتے کی کھال اوڑھے ہوئے پپی اپنے جسم سمیت آگے گیا، وہ اپنے نام کے ساتھ خوش ہے اور اپنے ثنیٰ کے ساتھ رہتا ہے۔'' مردے کی تصاویر لافانیت کے لیے بلیو پرنٹس تھیں۔ برعکس طور پر کسی شخص کا نام محو کر دینا اُس فرد کو ابد کے لیے تباہ و برباد کر دینا تھا...... یعنی تاریخی ریکارڈ سے نکال دینا۔ سوویت

یونین اور چین میں سٹالن اور ماؤ پسندوں نے اِنہی مقاصد کے تحت بالکل یہی حربے اختیار کیے۔ تاہم، اُنہوں نے ''بعد از موت بحالی'' کا تصور بھی وضع کیا۔

مصریوں کے خیال میں جسم کی کارکردگی میں دل ایک مرکزی کردار ادا کرتا تھا۔ دل کو دیے گئے اہم کردار نے غالباً سیاسی اور مذہبی حوالوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اَیبرس پیپرس (تقریباً 1550 ق م کا ایک میڈیکل انسائیکلوپیڈیا) میں بتائے گئے نام نہاد حقائق درحقیقت محض قیاسات ہیں۔ یہ اِس اعتبار سے حیرت انگیز ہے کہ کتنے زیادہ مواقع پر حنوط کرنے کے دوران جسموں کو کھولا جاتا تھا۔ بالکل درست طور پر خیال تھا کہ نالیوں کا ایک نظام دل سے ''تمام اعضا'' تک جاتا تھا اور ''دل ہر ایک عضو کی وریدوں کے ذریعہ بات کرتا تھا۔'' لیکن وریدوں میں ہوا، خون، آنسوؤں، پیشاب، تھوک، بلغم، مادۂ منویہ اور کبھی کبھار فضلے پر مشتمل ایک مواد بھی بہتا ہوا تصور کیا گیا۔ حنوط کاری کے عمل کے دوران دل کو ہمیشہ اُس کی فطری جگہ پر یا بالائی دھڑ میں ہی رکھا جاتا۔ مشہور مستشرق سر والس بَج کے مطابق، مصریوں نے دل کو ''زندگی اور ہستی کا ماخذ'' خیال کیا، اور اِسے کوئی بھی نقصان پہنچنے کے نتیجے میں ''دوسری موت'' واقع ہوتی جس میں ہر چیز (کا، با، خو اور رین) تباہ ہو جاتی۔ کچھ مقبروں کی تحریروں میں پرزور التجا ملتی ہے کہ ''ہمیں دوسری موت سے بچا۔''

جسمانی دل کے لیے 'اِب' لفظ استعمال کیا گیا جو اُسے نہ صرف سوچ، ذہانت، یادداشت اور دانائی بلکہ شجاعت دکھ اور محبت کی تجسیم بھی بناتا ہے۔ آنی پیپرس کے مشہور منظر اور دیگر جگہوں پر دکھائی گئی تصویروں میں اِب کو ہی تولا جاتا تھا۔ مردے کے ناکردہ گناہ گنوانے (منفی اعتراف) کے بعد دل کو 'ماأت' (یعنی راستی اور سچائی) کے پر کے برابر تولا جاتا تھا۔ اِس آزمائش کو کامیابی سے عبور کر لینے والا مردہ اوسائی رس سے متعارف ہوتا (بلکہ خود ہی ایک اوسائی رس بن جاتا)۔ ناکام مردے کو 'اَم مت' (مردار خور) چیر پھاڑ کر کھا جاتا۔ نیا جنم کبھی بھی پرانے دنیاوی جسم میں نہیں بلکہ ایک نئے وجود (ساہو) میں ہوتا۔ اِس نئے وجود کے جراثیم پرانے جسم میں سے ہی آتے اور روح اُس کے اندر حلول کر جاتی تھی۔

مصریوں نے ہمیشہ اِس بات کا خیال رکھا کہ مردہ دوبارہ سانس لینے کے قابل رہے۔ ہری ادب ''منہ کھولنے'' کی رسم بیان کرتے ہیں جس کے تحت یہ مقصد پورا کیا جاتا۔ ممی کو قبر میں اُتارنے کے فوراً بعد مخصوص پجاری اس کا جسم سیدھا کرتے، چہرے کو کلہاڑا نما اوزار Adz سے

چھوتے اور اعلان کرتے کہ "ہورس نے منہ اپنی اُسی چھوٹی انگلی سے کھول دیا ہے جس سے اپنے باپ اوسائی رس کا منہ کھولا تھا۔" 'کا' یا 'با' سے متعلقہ مخصوص عقائد کے حوالے سے اس رسم کو بامعنی انداز میں بیان کرنا مشکل ثابت ہوا ہے۔

قدیم مصر سے ملنے والے کسی بھی طبی ریکارڈز میں دماغ کا زیادہ ذکر نہیں ملتا۔ زندگی اور موت دل کے معاملات تھے، البتہ یہ تعلق کبھی کبھار فضول تھا...... مثلاً کہا گیا "دل کی وریدیں فضلے سے آلودہ ہو جانے پر ذہن مر گیا۔" دماغی تنے (Brain Stem) کی جانب اشارہ کرنے والا واحد عجیب وغریب بیان صرف ایبرس پیپرس میں ہے: "زندگی بائیں کان سے جسم میں داخل ہوتی اور دائیں کان کے راستے نکل جاتی ہے۔"

یہ بات واضح ہے کہ مصری لوگ اپنے مردوں کو جلاتے کیوں نہیں تھے: ایسا کرنے کے باعث اگلی زندگی کے تمام امکانات ختم ہو جاتے۔

میسوپوٹیمیا:

موت کی جانب میسوپوٹیمیائی (سومیری، بابلی اور اشوری) رویے مصریوں کی نسبت کافی مختلف تھے۔ وہ واضح اور دوٹوک تھے: بیماری اور موت گناہ کا نتیجہ تھیں۔ یہ نکتۂ نظر بعد ازاں اپنی بے رحم منطق اور سادگی کے ساتھ یہودیت کے راستے عیسائیت میں آیا۔ اگرچہ میسوپوٹیمیا میں مُردوں کو دفنایا جاتا تھا، لیکن جسموں کو محفوظ رکھنے کے لیے کوئی اقدامات نہ کیے گئے۔

میسوپوٹیمیائی اسطوریات میں دیوتاؤں نے انسان کو مٹی سے بنایا، لیکن مٹی میں خاص طور پر ذبح کیے گئے ایک دیوتا کا گوشت اور خون شامل تھا۔ چنانچہ، خدا تمام لوگوں میں موجود تھا۔ انسانیت کی تخلیق کا واحد مقصد دیوتاؤں کی خدمت کرنا، اُن کی خاطر محنت کرنا تھا۔ ناراض دیوتا مدد کا ہاتھ واپس کھینچ لیتے اور پھر شیطانوں کو کھلا چھوڑ دیتے۔ کوئی بدخواہ شخص اِن شیطانوں سے کام لے سکتا تھا۔

سومیری-عکادی سوچ کے مرکزی تانے بانے میں حیات بعد الموت کے لیے کوئی اُمید نظر نہیں آتی۔ گل گامش کی داستان میں عمر رسیدہ لوک ہیرو اپنی موت کے امکان سے آسیب زدہ ہو کر اُتنا پشتیم سے ملنے روانہ ہوتا ہے جو اپنی بیوی سمیت لافانیت حاصل کرنے والا واحد فانی انسان تھا۔ وہ شراب پلانے والی دوشیزہ سِدوری سے ملتا ہے جو اُسے مشورہ دیتی ہے کہ حال سے

بھرپور فائدہ اُٹھائے کیونکہ "جس زندگی کی تمھیں تلاش ہے وہ کہیں نہیں ملے گی۔" حیات بعد الموت کے بارے میں کوئی رائے موجود نہیں؛ اچھے اور برے دونوں لوگوں کے لیے ایک سا ہی انجام منتظر ہے۔ موت کو خوف ناک فسردگی کی صورت میں تصور کیا گیا جو انسانی یا الوہی رحم کے ذریعہ نجات کی اُمید سے کم نہیں ہوتی۔ درحقیقت ابتدائی میسوپوٹیمیائی تصورِ شیطان میں مردے سب سے زیادہ ہیبت ناک ہستیاں تھے۔ "عشتار کا تحت الثریٰ میں نزول" نامی ایک اسطورہ میں زرخیزی کی دیوی کُر-نو-گی-تا (ناقابلِ واپسی سرزمین) میں جانے کا فیصلہ کرتی ہے جہاں مردے تاریکی میں رہتے، مٹی کھاتے اور پرندوں کے پروں جیسا لباس پہنتے ہیں۔ وہ دربان کو دھمکاتی ہے: "اگر تم نے میرے لیے پھاٹک نہ کھولا تو میں اِسے اُکھیڑ پھینکوں گی۔ میں مردوں کو اوپر لے آؤں گی جو زندوں کو کھا جائیں گے۔" اس پس منظر میں یہ بات حیرت انگیز نہیں کہ مردے کو جذبۂ خوف کے تحت نذرانے پیش کیے جاتے تھے: خوش نہ کیے جانے پر وہ واپس آ جاتے اور ہر قسم کا نقصان پہنچاتے تھے۔

اہلِ بابل جسموں کی چیر پھاڑ نہیں کرتے تھے، اور بیماری و موت کے متعلق اُن کا نکتۂ نظر جسمانی یا طبعی کی بجائے روحانی نوعیت کا تھا۔ اُنہوں نے اعضاء کی کارکردگی پر خیال آرائی نہ کی بلکہ بہ حیثیت مجموعی جذبات اور ذہنی صلاحیتوں کی مسند سمجھا۔ اُن کے خیال میں دل عقل کا مرکز تھا، جگر مؤثر پن کا، معدہ مکاری کا، رحم جذبۂ ہمدردی کا اور کان و آنکھیں توجہ کا۔ سانس اور زندگی کو ایک ہی جیسا سمجھا گیا۔ عکادی لفظ napistu "گلے"، "سانس لینے" اور "زندگی" کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا تھا۔

یہودیت:

بائبلی یہودیت کی شرعی تحریروں میں مخصوص غیر معمولی افراد اور اُن کے دیوتاؤں کے درمیان تعلقات کا ذکر ہے۔ بیان کردہ واقعات کو ایک قومی تقدیر کا اظہارِ خیال کیا گیا۔ یہودی معادیات اِس اعتبار سے بے شکل ہے: اس کی مرکزی دلچسپی قوم کی تقدیر ہے نہ کہ موت کے بعد فرد کے حالات۔

کلاسیکی یہودیت میں کتاب کا اختتام موت پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ کتاب واعظ میں ہے: "کیونکہ زندہ جانتے ہیں کہ وہ مریں گے پر مردے کچھ بھی نہیں جانتے اور اِن کے لیے اور کچھ اجر نہیں کیونکہ اُن کی یاد جاتی رہی ہے۔" (5:9) انسانوں کی موت بھی جانوروں کی موت جیسی ہے:

''کیونکہ جو کچھ بنی آدم پر گزرتا ہے وہی کچھ حیوان پر گزرتا ہے۔ایک ہی حادثہ دونوں پر گزرتا ہے۔ جس طرح یہ مرتا ہے اُسی طرح وہ مرتا ہے۔ہاں سب میں ایک ہی سانس ہے اور انسان کو حیوان پر کچھ فوقیت نہیں کیونکہ سب بطلان ہے۔سب کے سب ایک ہی جگہ جاتے ہیں۔سب کے سب خاک سے ہیں اور سب کے سب پھر خاک سے جا ملتے ہیں۔'' (واعظ: 3:20-19) صرف زندگی ہی اہم ہے: ''زندہ کتا مردہ شیر سے بہتر ہے۔'' (واعظ: 9:4) حتیٰ کہ ایوب کبھی کبھی یہوائی مسلک سے متجاوز ہونے کے باوجود آخر میں سرکاری عقیدے کی توثیق کرتا ہے: ''انسان مر کر پڑا رہتا ہے.....جیسے جھیل کا پانی موقوف ہو جاتا ہے اور دریا اُترتا اور سوکھ جاتا ہے۔ویسے ہی آدمی لیٹ جاتا ہے اور اُٹھتا نہیں۔جب تک آسمان نہ ٹل جائے وہ بیدار نہ ہوں گے اور اپنی نیند سے جگائے جائیں گے۔'' (ایوب: 14:12-10)

تاہم اِس قسم کے نظریات ہمہ گیر تصور سے کافی دور تھے۔آثارِ قدیمہ کے ریکارڈ بتاتے ہیں کہ مختلف نسلی عناصر نے مل کر یہودی قوم بنائی اور نئی برادری میں اپنی اپنی قبائلی روایات شامل کیں جن کی بنیاد عموماً حیات بعد الموت پر یقین میں تھی۔موسیٰ اور یرمیاہ دونوں نے تجہیز و تکفین کے دساتیر سے یہی عقائد مراد لیے۔فال گیری سرکاری طور پر ممنوع ہونے کے باوجود کافی عام تھی۔ کتاب سموئیل میں ساؤل نے اَیندور کی جنوں کی آشنا عورت سے درخواست کی کہ ''سموئیل کو میرے لیے بلا دے۔'' (1-سموئیل: 28:20-3) اِس کا مطلب ہے کہ مُردوں یا کم از کم کچھ ایک مردوں کو موت کے بعد بھی کسی جگہ پر موجود خیال کیا جاتا تھا، غالباً شیول میں ''یعنی تاریکی اور موت اور سایہ کی سرزمین۔'' (ایوب: 10:21) شیول میں اچھے اور برے ایک ہی جیسے انجام سے دوچار ہوتے (جیسا کہ بابلی پاتال یا تحت الثریٰ میں بھی ہوتا تھا)۔

باطنی اور افلاطونی خیالات نے بھی یہودوی تصورِ موت پر کافی گہرا اثر ڈالا۔غالباً اِنہیں پہلی صدی عیسوی میں لکھی گئی ''سلیمان کی دانش'' نامی کتاب میں نہایت واضح انداز میں پیش کیا گیا۔ مصنف زور دیتا ہے کہ ''فانی جسم روح کو بوجھل کر دیتا ہے۔'' پہلی صدی عیسوی کے یہودی مؤرخ فلاویئس جوزیفس نے ''یہودی جنگ کے تاریخ'' میں لکھا ہے کہ کس طرح موت، حیات بعد الموت اور روح کے انجام کے متعلق عقائدانہ جھگڑے مختلف دھڑوں کے خیالات میں مجسم تھے۔ سدوی بدستور ایک بنیاد پرستانہ اور پرانا یہوائی عقیدہ اختیار کیے ہوئے تھے، جبکہ فریسی لافانی

روحوں کی بات کرتے تھے۔ایسینیوں کے خیالات ابتدائی عیسائیوں سے ملتے جلتے تھے۔

معبد کی تباہی (70 عیسوی) پر اور بالخصوص رومنوں کی آخری مدافعت ختم ہونے کے بعد (135 عیسوی) ربانی تعلیمات اور تفسیر آہستہ آہستہ معدوم ہونے لگی۔انہوں نے یہوداوی پرنس کے دور میں ترقی پائی جس نے فلسطین میں یہودی برادری کے پیٹریارک کے طور پر اپنی حکومت کے دوران (220-175ء) ربانی قانون کا مجموعہ ''مِشنہ'' مرتب کیا۔اگلے کوئی چار سو برس کے دوران ربانی تعلیمات کو فروغ ملا اور نتیجتاً اولین فلسطینی تالمود لکھی گئی اور بابلی تالمودوں کی نئی تفسیر ہوئی۔سول و مذہبی دستور کے اِن ضابطوں کا مقصد زندگی کے ہر پہلو کا تعین کرنا تھا، بشمول مُردوں کی جانب رویے کا۔لافانیت اور تجسیم نو کے تصورات اِس قدر واضح ہو گئے کہ خدا کو ''مردے کو دوبارہ زندہ کرنے والا'' کہا جانے لگا۔

ربانی یہودیت کے پیش کردہ نظریات میں سے ایک نہایت عجیب نظریہ ''Luz نامی ہڈی'' کا تھا۔ربی اوشائیا نے توثیق کی کہ انسانی جسم کی ریڑھ کی ہڈی کے اٹھارہویں مہرے سے نیچے ایک ہڈی موجود ہے جو کبھی نہیں مرتی۔آگ، پانی یا کوئی بھی اور عنصر اِسے تباہ نہیں کر سکتا، اور نہ ہی کوئی چوٹ اِسے توڑ سکتی ہے۔خدا تجسیم نو کرتے وقت اِس ہڈی کو استعمال کرتا ہے، اِس میں سے دیگر ہڈیاں نکل کر نیا جسم بناتی ہیں۔ہڈی کا نام بادام کے لیے قدیم آرامی لفظ Lus سے ماخوذ ہے۔ ایک بار شہنشاہ ہیدریان نے ربی جوشوا ابن چانن سے پوچھا تھا کہ خدا آنے والی دنیا میں لوگوں کو کس طرح دوبارہ مجسم کرے گا۔ربی نے جواب دیا تھا: ''ریڑھ کی ہڈی میں موجود Luz ہڈی سے۔'' اُس کے پاس اِس ہڈی کا ایک نمونہ موجود تھا جو پانی میں ڈالنے سے نرم نہ ہوتی اور آگ میں ڈالنے سے جلتی نہیں تھی۔ہتھوڑے کی ضرب سے بھی اُسے کوئی نقصان نہ پہنچتا۔عربوں نے اِس ہڈی کو الذبران کا نام دیا تھا۔1543ء میں ویسالیس نے ثابت کیا کہ اِس قسم کی کوئی ہڈی موجود نہیں تھی۔

موجودہ میڈیکل تنازعات کے جواب میں راسخ العقیدہ یہودیوں کی آرا کی بنیاد بائبلی اور تالمودی اخلاقی اصولوں پر ہے۔اول، ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہیے جو موت کا عمل تیز کر دے۔ زندگی بے پناہ اہمیت کی حامل ہونے کے باعث اِس کے چند ثانیے بھی انمول ہیں۔حادثاتی موت کو قتل سے کچھ ہی کم سمجھا جاتا ہے۔جب مریض آخری سانسیں لے رہا ہو تو بستر کو ہلانا نہیں چاہیے، کیونکہ یہ بھی موت کو جلدی لانے کا باعث بن سکتا ہے۔یہودی انجیوگرافی یا ٹشو کا نمونہ حاصل

کرنے کے لیے ورید میں سوراخ کرنے وغیرہ کو بھی گناہ سمجھتے ہیں۔ تاہم، سیکولر میڈیکل پریکٹس میں اِس نوعیت کے مسائل پیدا ہونے خلافِ قیاس ہیں۔

ہندومت:

غالباً 1500 قبل مسیح اور بعد کے دور میں لکھے گئے رگ وید کے بھجنوں میں ایک "تخلیق کا گیت" موجود ہے۔ اِس میں کہا گیا ہے: "موت موجود نہیں تھی، اور نہ ہی کوئی لافانی چیز وجود رکھتی تھی۔" دنیا مکمل خلا تھی، ماسوائے ایک چیز کے جو بے سانس تھی، مگر اپنی فطرت میں سانس لیتی تھی۔ زندگی میں تنفس کی اہمیت کا یہ اولین بیان ہے۔

بعد ازاں، تقریباً 600 قبل مسیح کے اُپنشدوں میں ایک مربوط اصول کی جستجو ریکارڈ کی گئی ہے جو اِنسان کے متنوع وظائف ...... مثلاً گفتار، سماعت، عقل ...... وغیرہ کی تہہ میں کارفرما ہے۔ زندہ جسم کا ایک لازمی وصف سانس لینے کی قابلیت (آن) تھی۔ اُن کا "پران" (سانس) اِس قدر حیات بخش تھا کہ اِس کے بند ہونے پر جسم بے جان ہو جاتا۔ روح کے لیے سنسکرت لفظ "آتماں" (آتما) دراصل "آن" سے ہی ماخوذ ہے۔ انفرادی ذات یا روح کی بنیاد سانس کے تصور پر رکھی گئی۔

روح کا ہندو تصورِ موت سے متعلقہ بیش تر ہندو رسوم میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ "ڈسکوری آف اِنڈیا" میں جواہر لال نہرو ہندومت کو ایک ایسے عقیدے کے طور پر بیان کرتا ہے جو "مبہم، کسی واضح صورت سے عاری، کثیر پہلو اور سب انسانوں کے لیے سب کچھ" کا حامل تھا۔ مذہب کے تجویز کردہ دستور یقیناً متضاد اقدامات کے حامل نظر آتے ہیں۔ تاہم، ہندومت کی بے مثال خوبی یہ ہے کہ اِنہیں بطورِ تضادات نہیں لیا جاتا۔ ایک مشترکہ دھاگا نہایت تجریدی فلسفیانہ قیاس آرائیوں اور بھوتوں پر بچگانہ یقین کو مربوط کیے ہوئے ہے؛ عدم تشدد کے لیے گہرے احترام کے باوجود خونیں قربانیاں پیش کی جاتی ہیں؛ ایک طرف شدید رہبانیت کی بات کی گئی اور دوسری طرف تنترمت کی شہوانیت موجود ہے۔ مہذب پن کی مختلف سطوح پر یہ سب سچائی کی انسانی تفہیم کو وسعت دینے اور ایک کائناتی شعور حاصل کرنے کی کوشش کی نمائندگی کرتی ہیں۔ دانش ورانہ رجحانات کے حامل کسی ہندو کے لیے صرف براہمن ہی حقیقی ہے اور کائناتی شعور کی تحصیل انسانوں کو براہمن کے ساتھ وصال کی اجازت دیتی ہے۔ انفرادی روح (آتماں) محض اِس کائناتی سرچشمے کا جز ہے...... جیسے مٹی کے گھڑے میں عارضی طور پر بند کی گئی ہوا اور باہر کی بے پایاں خلا

کے درمیان تعلق موجود ہوتا ہے۔

ہندومت میں موت کی رسوم کسی بھی اور مذہب کی نسبت زیادہ اہم ہیں۔ ایک سطح پر وہ واضح مذہبی قضیوں سے ماخوذ ہیں۔ ہر ہستی کے مقدر میں لاتعداد مرتبہ دوبارہ جنم لینا (سمسار) لکھا ہوا ہے، اور کسی شخص کے کرم (اچھے اور برے اعمال) زندگی کی طوالت اور ہر نئے جنم کی صورت کا تعین کرتے ہیں۔ اِس جنم میں بوئے گئے ہر بیج کی فصل اگلے جنم میں کاٹنا پڑے گی۔ خوف ناک دوبارہ جنم سے بچنا حتمی نجات (موکش) حاصل کرنا ہے۔ موکش صرف رشی اور ولی یا ایسے لوگ ہی پا سکتے ہیں جو وارانسی (بنارس) میں مریں اور جن کی راکھ گنگا میں بہائی جائے۔ بصورتِ دیگر لاتعداد مرتبہ دوبارہ جنم کا چکر جاری رہتا ہے۔

تاہم، موت کی ہندو رسوم مقامی دساتیر کے ساتھ ساتھ عوامی اعتقادات اور خوفوں کی بھی عکاسی کرتی ہیں۔ چنانچہ ہر خطے اور ہر فرقے کی رسوم میں فرق ہے۔ بہت سی رسوم کی بنیاد منودھرم شاستر پر ہے۔ ہندوؤں کا کہنا ہے کہ ہر انسان کو 120 سال طویل عرصۂ حیات تفویض ہوا ہے...... ایک ایسے ملک کے لیے نہایت انوکھا نظریہ جہاں بیسویں صدی میں بھی اوسط عمر 30 سال تھی۔ موت کو ایک عمل تصور کرنا ہندوؤں کے لیے ہرگز مشکل نہیں۔ قدیم ویدک دیوتاؤں کے حوالے سے اسطوریاتی عقائد کے مطابق کانوں پر قادر دیوتا آنکھوں، ہاتھوں اور ذہن پر حکم ران دیوتاؤں سے پہلے رخصت ہوتے ہیں۔

راسخ العقیدہ ہندو موت کو قریب آتے دیکھ کر "اوم" کا ورد کرنے لگتے ہیں۔ اگر آخری سانس نکلنے کے وقت ہونٹوں پر یہی لفظ ہو تو موکش ملنا لازمی خیال کیا جاتا ہے۔ جب کسی بیمار یا زخمی کی موت یقینی ہو جائے تو اُسے چارپائی سے اُٹھا کر زمین پہ بچھائے ہوئے گدے پر ڈال دیتے اور سر منہ موڑتے ہیں۔ زمین اور چھت کے درمیان فاصلے کو زمین اور آسمان کے درمیان پرصعوبت علاقے کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے، اور چارپائی پر مرنے والے افراد موت کے بعد بدروحیں بن جاتے ہیں۔ زمین پر کسی جگہ گنگا جل چھڑکتے، تل وغیرہ بکھیرتے اور گائے کے گوبر کا لیپ کرتے ہیں۔ موت گرفتہ شخص کو موت سے عین پہلے اُس پر لٹا دیا جاتا ہے۔ گنگا اور جمنا کے مقامِ اتصال (الٰہ آباد میں) سے لیا گیا پانی اُس کے منہ میں ٹپکاتے ہیں...... پانی میں تلسی کا ایک پتا بھی ڈالا گیا ہوتا ہے۔ اِس کے بعد پیشانی پر سفید مٹی (گوپی چندن) ملتے ہیں۔ شوہر سے پہلے مرنے والی عورت کو

اس قدر بھاگیوان سمجھا جاتا ہے کہ اُس کے چہرے اور بالخصوص پیشانی پر سرخ رنگ لگاتے ہیں۔ کبھی کبھی موت کی تصدیق کرنے کی خاطر پیشانی پر تھوڑا سا گھی ڈالتے ہیں...... اگر وہ نہ پگھلے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ جسم ٹھنڈا ہو چکا ہے۔ البتہ جدید تحقیق اس دلچسپ طریقہ کار کو درست قرار دینے سے قاصر ہے کیونکہ ہائپوتھرمیا میں تمام حالات بالکل موت جیسے ہوتے ہیں۔ مردہ جسم کو عمر کے حساب سے مختلف رنگوں کے صاف کپڑوں میں لپیٹ دیا جاتا ہے۔ گھر میں عزیز و اقارب لاش کے گرد دائیں سے بائیں رخ کو پھیرے لگاتے ہیں، جبکہ ارتھی کے گرد اُلٹے پھیرے لگائے جاتے ہیں۔

لاش کو آگ کے دیوتا اگنی کی بھینٹ سمجھا جاتا ہے۔ ویدوں کے مطابق ہند یورپی لوگ اپنے مُردوں کو دفنایا کرتے تھے۔ یہ موضوع کافی بحث مباحثہ کا باعث بنا ہے کہ ہندو اور بودھی اپنے مُردوں کو جلاتے کیوں ہیں۔ اِس کی مختلف توضیحات پیش کی گئیں: کہ یہ تطہیر کا بہترین ذریعہ ہے، کہ اس طرح روح حتمی طور پر فانی جسم میں سے نکل جاتی ہے، کہ آبادی زیادہ ہونے کی وجہ سے قبرستانوں کے لیے جگہ کافی نہیں تھی، یا یہ کہ جسم کو مکمل طور پر نیست و نابود کرنا مقصود تھا۔ متوفی کے گھر کے چولہے سے آگ کو ایک کالے برتن میں رکھ کر شمشان بھومی تک لیجایا جاتا ہے۔ اِس برتن کو ارتھی کے عین سامنے رکھ دیتے ہیں اور دونوں کے درمیان اور کوئی چیز موجود نہیں ہونی چاہیے۔ بہت عرصے تک عورتوں کو جنازے کے ہمراہ جانے کی اجازت نہ دی گئی، اور صرف برہموں کی بیویاں ہی چتا کے گرد پھیرے لگا سکتی تھیں۔ شمشان بھومی میں سب سے بڑا بیٹا یا پوتا چتا کو آگ لگاتا (مردہ عورت کے پیروں اور مردہ مرد کے سر کی طرف)۔ شدید حرارت کے باعث اکثر کھوپڑی چٹخ جاتی اور روح کو رہا کر دیتی ہے۔ اگر ایسا خود بخود نہ ہو تو لکڑی کے ایک لٹھ سے کھوپڑی کو خود توڑا جاتا ہے۔ دیگر روایات کے مطابق روح ناک، آنکھوں اور منہ کے راستے باہر نکلتی ہے۔

جب بچے کی موت قریب ہو تو اُسے زمین کی بجائے ماں کی گود میں ڈالا جاتا ہے۔ دو سال سے کم عمر بچوں کو جلانے کی بجائے دفن کرنے کا رواج ہے۔ ارتھی کے ساتھ شمشان بھومی جانے والے عزیز و اقارب کو تین روز تک ناپاک تصور کیا جاتا ہے۔ اعلیٰ ذات کے ناگروں میں جب کوئی حاملہ عورت مر جائے تو پیٹ میں سے بچے کو نکال کر دفنا دیتے جبکہ ماں کو جلاتے ہیں۔

سنیاسیوں اور رشیوں کو بھی جلانے کی بجائے دفن کیا جاتا ہے...... عموماً سیدھی بیٹھی ہوئی

حالت میں...... اور اردگرد نمک ڈال دیتے ہیں۔ کوڑھیوں اور چیچک کا شکار ہونے والے افراد کو لٹا کر دفناتے تھے۔ چیچک کا تو تدارک ہو گیا، لیکن اب کوڑھ کے مریضوں کو عموماً جلایا ہی جاتا ہے۔ اگر کوئی ہندو اسلام یا عیسائیت قبول کر کے اپنی ذات یا ورن کو توڑ دے تو اُس کی ارتھی جلانے کی رسم ادا کی جاتی ہے؛ اُس کے رشتہ دار غسلِ طہارت کرتے اور پھر کبھی اُس شخص کا نام زبان پر نہیں لاتے۔

موت اور تجسیم نو کے درمیانی وقفے میں پیش آنے والے حالات ہندومت پر لکھے گئے مضامین میں شاذ ہی زیرِ بحث لائے جاتے ہیں۔ یہ افسوس ناک ہے کیونکہ اِن واقعات کا ادراک مذہب کی کچھ رسوم کی وضاحت میں مدد دیتا اور انسانی ترجیحات کی بے مثال بصیرت مہیا کرتا ہے۔

موت کے فوراً بعد روح طبعی جسم میں نہیں رہتی بلکہ انگوٹھے جتنے سٹرکچر (لنگ سریر) میں چلی جاتی ہے۔ موت کے دیوتا یم کے دو خادم اِسے فوراً قابو میں لے لیتے اور ابتدائی شناختی کارروائی کے لیے یم کے پاس لیجاتے ہیں۔ بعد میں روح کو جلد از جلد متوفی کی رہائش گاہ میں لوٹا دیا جاتا ہے جہاں یہ دہلیز کے آس پاس ہی منڈلاتی رہتی ہے۔ ضروری ہے کہ موت کے واپس آنے سے پہلے پہلے ارتھی جلا دی جائے تا کہ وہ جسم میں دوبارہ داخل نہ ہو سکے۔ دسویں دن عزیز و اقارب موت کی ناپاکی (مرتکا سوتک) سے آزاد ہو جاتے ہیں، اور کرم دھرمی اور ایک پروہت پہلا شرادھ دیتے ہیں۔ یہ جسم سے عاری روح (پریت) کے گرد ایک طبعی جسم (یتن سریر) دوبارہ تشکیل دینے کی جانب پہلا اقدام ہے۔ کسی دریا کے کنارے روایتی انداز میں پاک کی گئی جگہ پر ایک چھوٹی سی خندق کھودتے اور وشنو کو یاد کرتے ہیں۔ جو کے آٹے میں کھانڈ، شہد، دودھ، دہی، گھی اور تل گوندھ کر دس گولے بنائے اور باری باری مٹی میں رکھے جاتے ہیں۔ پہلا گولا رکھتے وقت پروہت کہتا ہے (اور متوفی کا بیٹا دوہراتا ہے): ''اس سے سر بنے۔'' اِسی طرح دوسرا گولا رکھتے وقت ''اِس سے گردن اور کندھے بنیں؛'' تیسرا گولا رکھتے وقت ''اس سے چھاتی بنے'' کہا جاتا ہے...... دسویں گولے کے لیے یہ درخواست کی جاتی ہے کہ روح ہضم کرنے کے قابل بنے اور یوں نئے جسم کی بھوک اور پیاس مٹا سکے۔ نامکمل اور غلط طریقے سے انجام دی گئی رسوم کے سنگین نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ پھر جو کے گولے خندق میں سے اُٹھا کر دریا میں پھینک دیے جاتے ہیں۔ موزوں مواقع پر دیگر شرادھ بھی ادا ہوتے ہیں؛ ہر ذات میں ان کی نوعیت مختلف ہے۔ ان میں سے ایک رسم کا مقصد روح کو اجدادی روح (پتری) بنانا ہے۔ رسوم مکمل ہو جانے پر روح دنیا سے

نکلی اور یم کی بادشاہت کی جانب ایک سال طول پر مصائب سفر پر روانہ ہوتی ہے۔ اب متوفی کے گھر والے باقاعدہ تطہیر کرتے ہیں۔ مرد اپنے سر مونڈتے جبکہ عورتیں بال دھوتی ہیں۔ تب خاندان کے سرپرست دیوتا کی مورتی کو واپس لایا جاتا ہے۔ برہمنوں، پڑوسیوں اور بھکاریوں میں کھانا تقسیم کیا جاتا ہے...... حتیٰ کہ مقامی گایوں کو بھی کھانے کے لیے تازہ گھاس دیتے ہیں۔ سب لوگ سکھ کا سانس لیتے ہیں: شرادھ ادا نہ کیے جانے کی صورت میں پریت بھوت بن سکتا ہے جو زندہ لوگوں کو خوف زدہ کرتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں آسیب زدہ لوگوں کے حوالے سے خوف بھی اسی نوعیت کا تھا۔

دریں اثنا روح اپنے نئے جسم کے ساتھ سفر جاری رکھتی، ایک گائے کی دم پکڑ کر ویتارنی دریا پار کرتی ہے (خون اور غلاظت سے بھرا ہوا یہ خوف ناک دریا یم کی بادشاہت کی سرحد ہے)۔ دنیا میں عزیز و اقارب کے انجام دیے ہوئے شرادھ روح کو آگے بڑھنے میں مسلسل مدد دیتے ہیں۔ وہ برہمن کو جوتے، چھتریاں، کپڑے اور نقد رقم دیتے ہیں تاکہ اِن کا فائدہ متوفی کو پہنچ سکے۔ ان رسوم کے دوران رشتہ دار سینے پرونے سے اجتناب کرتے ہیں، کہ کہیں سوئی پتری کے گلے میں نہ چبھ جائے اور وہ دوبارہ سانس لینے یا کچھ پینے کی قابلیت نہ کھو بیٹھے۔ ایک سال بعد پتری اپنے یقین سریر میں یم کے دربار میں پہنچتی اور اپنے اعمال کی بنا پر سورگ یا نرک میں بھیجی جاتی ہے۔ یہ عمل مکمل ہو جانے پر وہ ایک اور جسم (کَرَن سریر) میں داخل ہوتی ہے جس کی ہیئت کا دار و مدار فرد کے اعمال پر ہے۔ نیا جسم کوئی پودا، کاکروچ، پیٹ کا کیڑا، چوپایا انسان بھی ہو سکتا ہے۔ جینیوں کے برعکس ہندوؤں کا خیال ہے کہ روح جس جسم میں بھی داخل ہوا اُسی میں بس جاتی ہے۔

اسلام:

تخلیق، موت، قبر کی زندگی اور نوعِ انسانی کے انجام کے حوالے سے غالباً کسی بھی مذہب نے اسلام سے زیادہ گہرائی میں بات نہیں کی۔ تاہم، ایک رائے کے مطابق اسلام میں اِن مسائل کی کوئی دوٹوک اور منظم اپروچ نہیں ملتی۔ مدینہ میں مسلمان برادری کو دیگر مذہبی اثرات سے سابقہ پڑنے پر ہی اِس قسم کے مسائل پر تفصیل سے بحث کی گئی، جیسے...... نیند اور موت کا تعلق، سانس کی اہمیت، روح کب اور کیسے جسم سے نکلتی ہے۔ مقبول عام مسلم عقائد کی بنیاد اور بھی بعد کی روایات پر ہے۔ یہ چودھویں صدی کی ''کتاب الروح'' میں ریکارڈ کیے گئے ہیں جو حنبلی ماہر دینیات محمد ابن

ابی بکر ابن قیم الجوزیہ نے لکھی۔

موت کے حوالے سے تمام قرآنی تعلیمات کا بنیادی قضیہ اللہ کی قدرتِ مطلق ہے: وہ انسانوں کو تخلیق کرتا، اُن کی زندگی کا دورانیہ متعین کرتا اور اُنہیں مارتا بھی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے: ''پھر جب تم پہنچو اپنی جوانی کے زور کو اور کوئی تم میں سے قبضہ کر لیا جاتا ہے اور کوئی تم میں سے پھر چلایا جاتا ہے ضعیفی کی عمر تک تاکہ سمجھنے کے پیچھے کچھ نہ سمجھنے لگے۔'' (5:22) دوزخ کی سزا اور نجات کا تعین بھی پہلے سے ہو چکا ہے: ''اللہ بھٹکاتا ہے جس کو چاہے اور سجھاتا ہے جس کو چاہے۔'' (8:35) جن لوگوں کو اللہ بھٹکا دیتا ہے اُن کے متعلق قرآن کہتا ہے: ''سو کون سمجھائے جس کو اللہ نے بھٹکایا اور کوئی نہیں اُن کا مددگار۔'' (29:30) اللہ نے بہت سوں کے مقدر میں ناکامی لکھ دی ہے: ''اگر ہم چاہتے تو سجھا دیتے ہر جی کو اُس کی راہ لیکن ٹھیک پڑ چکی میری کہی بات کہ مجھ کو بھرنی ہے دوزخ جنوں سے اور آدمیوں سے اکٹھے۔'' (13:32)۔

اِس تناظر میں فرد کا انجام (موت کے انداز اور وقت سمیت) قطعی طور پر پہلے سے طے شدہ نظر آتا ہے۔ اسلام کا لغوی مطلب ''چھوڑ دینا'' خدا کی مرضی کے سامنے مطلق اطاعت کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ لیکن تقدیرِ متعین کے حامل لوگوں کے لیے خطا کے راستے پر چلتے رہنے والوں یا خدا کی مرضی کو مسترد کرنے والوں کا اختیار کیا ہے؟ اور اگر اُنہیں کوئی اختیار نہیں تو انبیاؑ کے مشن کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟ اِس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ آنحضرت ﷺ کے وصال کے کچھ ہی عرصہ بعد مسلمانوں کے ہاں آزاد ارادے اور طے شدہ تقدیر کے حوالے سے سوالات اُبھر کر سامنے آنے لگے۔ اسلام کے اندر یہ علمی و دینیاتی بحثیں صدیوں تک جاری رہیں۔

زندگی کے مفہوم اور روح کی نوعیت کے حوالے سے سوالات پر قرآن و حدیث دونوں میں بس کہیں کہیں ہی ذکر آیا ہے۔ قرآن کے مطابق جب مقامی یہودی رہنماؤں نے آنحضرت ﷺ سے اِن مسائل کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے جواب دیا کہ ''روح امرِ ربی ہے،'' اور ''انسان کو بس تھوڑا ہی علم دیا گیا ہے۔'' ''انسانیت کو ''کھنکھناتے سنے ہوئے گارے سے'' تخلیق کیا گیا جس میں اللہ نے ''اپنی روح پھونکی۔'' (15:29-28) ہر انسان کے اندر ایک قوائی روح ''نفس'' موجود ہے۔ یہ انفراد کے ساتھ اگر مشابہ نہیں تو منسلک ضرور ہے، اور یہ منطقی شعور کی مسند بھی ہے۔ عربی زبان کے الفاظ ''نفس'' (بہ معنی سانس) اور ''نفیس'' (بہ معنی قیمتی) کے درمیان ممکنہ تعلق کا حوالہ دینا

دلچسپی سے خالی نہیں۔

متعدد جگہوں پر موت کا موازنہ نیند سے کیا گیا جو "چھوٹی موت" ہے۔ سونے کے وقت یا مرنے کے موقعہ پر اللہ لوگوں کی روحیں قبض کر لیتا ہے۔ "اللہ کھینچ لیتا ہے جانیں جب وقت ہو اُن کے مرنے کا اور جو نہیں مریں اُن کو کھینچ لیتا ہے، اُن کی نیند میں پھر رکھ چھوڑتا ہے جن پر مرنا ٹھہرا دیا ہے اور بھیج دیتا ہے اوروں کو ایک وعدہ مقرر تک۔" (42:39) موت کے وقت "جان حلق میں آ جاتی ہے۔" (83:56) جدید طبی علم کی روشنی میں یہ ارشادات بہت دلچسپ ہیں۔ نیند کے مطالعہ میں ایسے مختصر وقفوں کا سراغ لگایا گیا ہے جب ٹانگیں بالکل بے جان اور بے حس ہو جاتی ہیں، جیسے وہ کسی مردہ شخص کی ہوں۔ نیز، جدید نیوروفزیالوجی بیداری کی حالت قائم رکھنے میں دماغی تنے (Brain Stem) کے بالائی حصے میں موجود سٹرکچرز کے کردار پر زور دیتی ہے۔ غشی کی طویل حالتیں بھی ہائپوتھیلمس میں تبدیلیوں کا نتیجہ ہیں۔ اِن حصوں میں کوئی نا قابلِ تلافی نقصان جدید تصورِ موت کا حصہ ہے۔ اِس کے علاوہ سانس لینے میں مختلف قسم کی مشکلات کا تعلق بھی دماغی تنے کے ساتھ ہے، اور پرانے وقتوں میں اِنہیں حلق کے ساتھ منسوب کیا جا سکتا تھا۔ اِن اقتباسات میں کوئی بھی چیز جدید نیورالوجی کی بصیرتوں سے ٹکراؤ نہیں کھاتی۔ البتہ، موت کے عمل میں دل کا کوئی ذکر نہ ہونا حیرت انگیز ہے۔

صاحبِ ایمان مسلمان کا یقین ہے کہ جب کوئی شخص مرنے لگے تو ملک الموت (موت کا فرشتہ) آ کر اُس کے سرہانے والی طرف بیٹھ جاتا اور ہر روح کو اُس کے رتبے کے مطابق مخاطب کرتا ہے۔ "کتاب الروح" کے مطابق بری روحوں کو "قہرِ الٰہی سے بچنے کی ہدایت" کی جاتی ہے۔ اپنے انجام کے خوف سے وہ سارے جسم میں چھپنے کی جگہ ڈھونڈتی ہیں اور اُنہیں جسم میں سے کھینچ کر نکالنا پڑتا ہے۔ فرشتے روح کو بالوں سے بنے ایک کپڑے میں سنبھال کر رکھتے ہیں، اور اِس میں سے آنے والی بو گلتی سڑتی ہوئی لاش کی بو جیسی ہوتی ہے۔ حساب کتاب کرنے کے بعد روح کو قبر کے اندر جسم میں لوٹا دیا جاتا ہے۔ "نیک اور مطمئن روحوں" کو خدا کی مرضی سے رخصت ہونے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ وہ پانی کی طرح باہر بہہ نکلتی ہیں۔ فرشتے اُنہیں ایک معطر کفن میں لپیٹتے اور ساتویں آسمان پر لیجاتے ہیں جہاں ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ حساب کتاب کے بعد اِن روحوں کو بھی اُن کے جسموں میں واپس لوٹایا جاتا ہے۔ نیلے اور کالے رنگ کے دو فرشتے، منکر اور

نکیر مردے سے ارکانِ ایمان سے متعلق سوالات کرتے ہیں۔ ایک لحاظ سے قبر میں یہ پوچھ گچھ (فتنة القبر) ایک نمائشی امتحان ہے، فیصلہ تو پہلے ہی ہو چکا ہوتا ہے۔ اہلِ ایمان ایک نقیب کے ذریعہ اِس کا اعلان سن لیتے ہیں، اور جنگ کی راحتوں کی اُمید کے باعث اُن کی قبریں "تاحدِ نظر کشادہ" ہو جاتی ہیں۔ لادین لوگ امتحان میں ناکام رہتے ہیں۔ اعلان کیا جاتا ہے کہ اُنہیں قبر میں عذاب دیا جائے گا: اُن کی قبر میں ایک دروازہ بن جاتا ہے تاکہ جہنم سے تپش اور دھواں اندر آ سکے۔ قبر بھی سکڑ کر اُن کے پہلوؤں کے ساتھ آ لگتی اور پسلیوں کو بھینچ دیتی ہے۔ تدفین اور روزِ حشر کا درمیانی عرصہ البرزخ کہلاتا ہے۔ یوم الحساب کو لادین اور خوفِ خدا رکھنے والے دونوں قسم کے لوگ زندہ کیے جائیں گے۔ دونوں کو جسموں کا پیرہن ملے گا اور وہ دکھ یا مسرت کا سامنا کریں گے۔ نیک لوگ باغِ بہشت میں داخل ہوں گے جسے قرآن میں (42-48:37) تفصیل سے بیان کیا گیا ہے (زیادہ تر مردانہ نکتۂ نظر سے)۔ روزِ قیامت استقبالیہ ضیافت میں لادین افراد ترش پھلوں سے پیٹ بھریں گے اور گرم پانی پئیں گے مگر اُن کی پیاس نہ بجھ سکے گی۔ تب وہ جہنم میں جائیں گے اور وہاں "آگ کا لباس" پہنیں گے، اُن کے سروں پر کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا۔ مردودوں کو موت نہیں آئے گی: "بے شک جو منکر ہوئے ہماری آیتوں سے اُن کو ہم ڈالیں گے آگ میں۔ جس وقت جل جائے گی اُن کی کھال تو ہم بدل دیویں گے اُن کو اور کھال، تاکہ چکھتے رہیں عذاب۔" (56:4) موت کی التجائیں نظر انداز کر دی جائیں گی۔ اگرچہ کچھ جگہوں پر اِسے "دوسری موت" کہا گیا ہے لیکن قرآن واضح طور پر بتاتا ہے کہ اِس حالت میں مردود لوگ "نہ جئیں گے اور نہ مریں گے۔" (13:87) شہدائے اسلام کی تقدیر اِس کے برعکس ہے۔ اُن کے برے اعمال فوراً منسوخ ہو جاتے ہیں اور اُنہیں حساب کے عمل سے بھی نہیں گزرنا پڑتا۔ وہ براہِ راست باغِ بہشت میں جاتے ہیں۔ اسلام کی خاطر گھروں کو چھوڑنے والوں کے لیے بھی اِسی انعام کا وعدہ فرمایا گیا۔

صدیوں کے دوران اسلامی معادیات میں ایک نسبتاً دھیما رنگ پیدا ہوا اور اصل عقیدے کی متعدد تفاسیر کی گئیں۔ کچھ علماً کے مطابق موت کے بعد حساب کی تمام تفصیلات کو تشبیہاتی معنوں میں لینا چاہیے۔ انفرادی ذمہ داری پر زور دینے والے یہ رجحانات صوفیانہ تعلیمات کے زیرِ اثر تھے۔ مسلمان مُردوں کے لیے ایک خصوصی احترام رکھتے اور اُنہیں جلد از جلد ٹھکانے لگانا ضروری

سمجھتے ہیں۔ تاہم، لاش کو جلایا جانا نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اِس رویے کی فلسفیانہ بنیادیں واضح نہیں۔ مثلاً یہ نہیں بتایا گیا کہ حشرِ اجساد کے موقعہ پر صحیح سالم جسم درکار ہوگا یا نہیں۔ نیز، یہ خلافِ قیاس ہے کہ لاش جلانے سے نفرت کا مقصد اسلام دستور کو دیگر اہل الکتاب افراد سے ممیز کرنا ہے۔ مردہ جسموں کی جانب رویے کچھ عملی نتائج کا محرک بنے؛ مثلاً میڈیکل تعلیم کے معاملے میں۔ بہت سے اسلامی ممالک میں پوسٹ مارٹم تجزیہ ناممکن ہے۔ مثلاً سعودی عرب میں میڈیکل طلبا غیر اسلامی ممالک سے درآمد کی ہوئی لاشوں کی مدد سے اناٹومی پڑھتے ہیں۔ پیتھالوجی صرف نصابی کتب میں پڑھی جاتی ہے۔

1982ء میں سعودی عرب کے ''سینئر علماً کمیشن'' نے موت کے بعد اعضاً کے عطیات کو حلال قرار دیا۔ تاہم، بچپن میں سنائی گئی کہانیاں اسلامی اقوام میں عوامی رویوں پر بدستور اثر انداز ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے چچا حضرت حمزہؓ کا کلیجہ چبائے جانے کا قصہ جگر کی ٹرانس پلانٹیشن کو قبول کرنے کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ گردے کی ٹرانس پلانٹیشن نسبتاً زیادہ قابل قبول ہے، شاید اِس لیے کہ ایک حدیث کے مطابق جنتی لوگوں کو کبھی پیشاب کی حاجت نہیں ہوگی۔

عیسائیت:

اٹھارہویں صدی کے بعد سے عقلیت پسندانہ اور سائنسی نظریات کے پھیلاؤ نے مذہب کے متعدد پہلوؤں کو زک پہنچائی ہے، جن میں عیسائیت کے متعدد عقائد شامل تھے۔ نیز، کلیسیا نے بدستور اپنا اثر و رسوخ قائم رکھنے کی خواہش کے باوجود سول زندگی کو پہلے کی طرح متاثر کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اب مذہب اُس طرح تمام سماجی تعلقات کا مرکز و محور نہیں رہا جیسے کبھی قدیم مصر میں ہوا کرتا تھا اور آج بھی کچھ اسلامی ممالک میں ہے۔ کلیسیا کا انحطاط اِس مثال میں نظر آتا ہے کہ اگرچہ وہ اب بھی وفاتِ یسوع مسیح (اور بہ حیثیتِ مجموعی ساری انسانیت کی موت) کی علامتی اہمیت کے بارے میں بات کرنے کو تیار ہے، لیکن اِس نے اپنی ابتدائی معادیات کے بہت سے پہلوؤں پر زور دینا اور پہلے کی طرح انفرادی موت کی خصوصی تفصیلات میں دلچسپی لینا چھوڑ دیا ہے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی کے دور میں دانتے کی بہشت، برزخ اور جہنم محض ایک مسکراہٹ ہی پیدا کر سکتی تھی۔

عیسائی مذہب کے عین دل میں موت موجود ہے۔ صلیب قبرستانوں اور عبادت گاہوں دونوں جگہوں پر ملتی ہے، لیکن مذہب کا بنیادی قضیہ یہ ہے کہ انسان اپنے ہی افعال کے باعث

لافانیت کھو بیٹھے۔ باغِ عدن میں ملنے والی آزادی کا غلط استعمال کرنے کے ذریعہ آدم اور حوا نے نہ صرف گناہ کیا اور رحمت سے محروم ہوئے، بلکہ اُنہوں نے یہ گناہ اپنی اولادوں میں بھی منتقل کر دیا: باپوں کے گناہ بچوں میں آجاتے ہیں۔ اور چونکہ ''گناہ کا کفارہ موت ہے'' (رومیوں، 23:6) اِس لیے موت ایک ہمہ گیر مقدر بن گئی۔ ''پس جس طرح ایک آدمی کے سبب سے گناہ دنیا میں آیا اور گناہ کے سبب سے موت آئی اور یوں موت سب آدمیوں میں پھیل گئی اِس لیے کہ سب نے گناہ کیا۔'' (رومیوں، 12:5) عیسائی ماہرین الٰہیات نے دو ہزار سال کا بہترین حصہ اِن نتائج کی کھوج کرنے اور گناہ سے بچنے کی تدبیریں سوچنے میں صرف کر دیا۔ مرکزی نجات مسیح کی موت میں بپتسمہ تھا: ''کیا تم نہیں جانتے کہ ہم جتنوں نے مسیح یسوع میں شامل ہونے کا بپتسمہ لیا تو اُس کی موت میں شامل ہونے کا بپتسمہ لیا۔ پس موت میں شامل ہونے کے بپتسمہ کے وسیلہ سے ہم اُس کے ساتھ دفن ہوئے تاکہ جس طرح مسیح باپ کے جلال کے وسیلہ سے مُردوں میں سے جلایا گیا اُسی طرح ہم بھی نئی زندگی میں چلیں۔'' (رومیوں، 6:4-3)

مسیح کے وعدہ کردہ دوبارہ ورود میں تاخیر نے ابتدائی مسیحیوں کو بعد از موت حالات پر غور و فکر میں منہمک کر دیا؛ وہ تجسیمِ نو اور روزِ حشر کے منتظر تھے۔ ایک نکتۂ نظر یہ تھا کہ ایک فوری انفرادی حساب ہوتا ہے اور پھر فوری انصاف ملتا ہے: اِس کے بعد متوفی کو دوزخ یا جنت میں بھجوا دیا جاتا ہے۔ یہ نظریہ ایک اجتماعی تجسیمِ نو اور پھر وسیع پیمانے پر آزمائش کی عظیم پیش گوئی کا متقاضی تھا۔ نیز اِس نے مردے کو بعد از موت اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے ہر امکان سے محروم کر دیا۔ عارضی صعوبت گاہ (Purgatory - وہ مقام جہاں روحیں عارضی سزا بھگتتی اور اپنے قابلِ عفو گناہوں سے چھٹکارا پاتی ہیں) کے رومن کیتھولک نظریے نے بعد کے ایک مسئلے کو حل کرنا چاہا؛ متواتر اذیت اُن کے کچھ گناہوں کو دھو ڈالتی۔ دوسرا نکتۂ نظر یہ تھا کہ مردہ روزِ حساب تک نیند میں رہتا ہے۔ لیکن یہ نیند ایک ہزار سال تک بھی جاری رہ سکتی ہے، اِس لیے محسوس کیا گیا کہ نیکوں کو آسمانی تسکین سے نوازا جاتا تھا۔ جہاں تک بروں کا تعلق ہے تو اُنہیں بھی ایک پناہ گاہ مل گئی جس کے وہ مستحق نہیں تھے۔ کارتھیج کے ماہرِ الٰہیات ترتولیان نے مزید سمجھوتوں کا امکان پیش کیا۔ وہ ایک ''مکانی تصور'' بیان کرتا ہے جسے ''لوگوں کی روحوں کو سنبھالنے کے لیے ابرہام کی چھاتی'' کہا جا سکتا ہے۔ افلاکی نہ ہونے کے باوجود یہ ''زیریں خطوں سے اوپر واقع جگہ'' تھی اور یہاں ''روحوں کو روزِ حشر تک

تروتازگی فراہم کی جاتی۔" بازنطینی کلیسیا نے اس تصور کو اپنا لیا، جس نے مشرقی اور مغربی یورپ میں کچھ نہایت دلچسپ آرٹ کو تحریک دی۔

کلیسیا آج بھی موت کی تشخیص کے حوالے سے غور و فکر میں مصروف ہے، لیکن بیسویں صدی کے نصف آخر کے دوران دینیاتی دلائل نے ایک قطعی مختلف رنگ اختیار کر لیا۔ 1957ء میں پوپ پائیس XII نے سوال اُٹھایا کہ آیا انتہائی نگہداشت کے یونٹس میں ڈاکٹروں کو "روح جسم سے نکل جانے کے بعد بھی زندگی کو برقرار رکھنے کی کوششیں جاری رکھنی چاہئیں یا نہیں۔" اُس نے جدید طب کو درپیش مرکزی سوالات میں سے ایک کا ذکر بھی کیا...... غشی اور حبسِ دم کا باعث بننے والے شدید دماغی صدمے کے بعد موت واقع ہو چکی ہوتی ہے یا نہیں۔ اُس نے کہا کہ اس سوال کا جواب دینا کلیسیا کی استطاعت میں نہیں۔

عوامی رویے:

آج سے ایک سو سال پہلے لوگ کافی حد تک موت کے ساتھ سمجھوتہ کر چکے تھے۔ وہ عموماً اپنے گھروں میں رشتہ داروں کے درمیان فوت ہوتے۔ اٹھارہویں یا ابتدائی اُنیسویں صدی کے دوران دیہات میں راہگیر بھی کسی موت گرفتہ شخص کی آخری دعا میں شریک ہونے آ جایا کرتے تھے۔ ڈاکٹروں نے اس چیز کو عوامی صحت کے لیے نقصان دہ قرار دیا۔ متعدد تصاویر اس امر کا ثبوت پیش کرتی ہیں کہ بسترِ مرگ کے قریب بچے بھی موجود ہوتے تھے، اور بیسویں صدی تک ایسا ہوتا رہا۔

جدید طب کی ترقی اور منطقی سوچ کے تیزی سے پھیلاؤ نے موت کی عمومی قبولیت کا دھارا موڑ دیا۔ صرف دو تین عشروں کے اندر اندر رویوں میں انقلابی تبدیلی آ گئی۔ ترقی یافتہ صنعتی ممالک میں اب بہت زیادہ لوگ ہسپتالوں میں جان دیتے ہیں۔ عرصۂ زندگی میں طوالت اور جدید طب و سرجری کی ترقیوں کی ایک مخصوص قیمت ادا کرنا پڑی۔ اب ایک مشینی اندازِ فکر پیدا ہوا ہے جس میں موت گرفتہ شخص کو جیتا ہوا رکھنا جدید ٹیکنالوجی کی ایک اہم ضمنی پیداوار ہے۔ جدید طب کا فلسفہ اب بیمار کی بجائے بیماری کو اصل سمجھنے پر مرکوز ہو گیا ہے۔ جدید فزیشنز موت کو ایک فطری چیز سمجھنے کی بجائے اِسے ایک بری اور اجنبی چیز سمجھنے لگے ہیں...... موت اُن کی تمام طبی مہارتوں کی شکست کا نام ہے، اور کبھی کبھی تو اِسے بالکل ذاتی شکست کے طور پر لیا جاتا ہے۔ بیماری سے نمٹنے میں تمام ممکنہ ہتھیار استعمال کیے جاتے ہیں، اور عموماً اس ساری کارروائی میں مریض کو بالکل ہی بھلا دیا جاتا ہے۔

مرتے ہوئے شخص کی سائیکی اور اُس کے رشتہ داروں کی سطح پر متوازی ترقیاں بھی واقع ہوئی ہیں۔ ایک امریکی ماہرِ نفسیات ایلزبتھ کوبلر راس نے اُن مراحل...... استرداد، طیش، سودے بازی، صدمے کی تیاری اور قبولیت...... کا خاکہ پیش کیا ہے جن میں سے اپنی موت کی آمد سے آگاہ کیے گئے لوگ گزرتے ہیں۔ اُس کی تحریریں ایک وسیع لیکن لازمی طور پر امریکی لوگوں کے تجربات پر مبنی ہیں، اور اُن کی ہمہ گیریت کو ابھی تک آزمایا نہیں گیا (بالخصوص ثقافتی تناظر میں)۔ اُن کا ہر نسل میں مختلف ہونا عین ممکن ہے۔

مغرب میں موت کے حوالے سے پوری ایک صنعت وجود میں آ چکی ہے جو ٹیکنالوجیکل انقلاب اور موت کی جانب جدید رویوں کی ہی ضمنی پیداوار ہے۔ کفن کو اب "آرائشی ڈبہ" (Casket) کہا جاتا ہے۔ حنوط کرنے کا رواج بھی عام ہو رہا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے ڈرائیو اِن قبرستان بھی بن گئے ہیں جو اپنی مصروفیات کے باوجود مُردوں سے محبت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ تجارتی اور کمرشل پہلو بھی اثر انداز ہو رہے ہیں: اخراجات کی عدم ادائیگی کے نتیجے میں لاش گل سڑ سکتی ہے۔ قانونی چارہ جوئی کے ماحول میں انتہائی نگہداشت وارڈ بھی قانون کی زد میں آ گیا ہے۔ فزیشنز کسی مریض کا علاج بند کرنے کا فیصلہ یا موت کا تعین قانون کی روشنی میں ہی کرتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ جدید دور میں کسی شخص کی موت کی واحد یقینی علامت اُس کا قانونی چارہ جوئی کرنے کے قابل نہ رہنا ہے۔

انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا

2
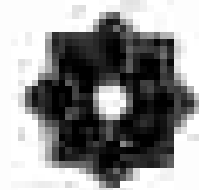
موت کے اساطیری تصورات

موت کے بغیر کوئی زندگی نہیں اور زندگی کے بغیر کوئی موت موجود نہیں کا بیان درست ہونے کے ساتھ ساتھ فضول بھی ہے۔ اس کی سچائی خود آشکار ہے: اس کا فضول پن اس امر پر مبنی ہے کہ زندگی اور موت اصولی طور پر ایک دوسری کو بے دخل کرنے والی حالتیں ہیں۔ موت کے بعد بھی زندگی جاری رہنے کا عقیدہ اس تعریف کی اہمیت کو گھٹاتا نہیں، کیونکہ حیات بعد الموت کو بنیادی طور پر دنیاوی زندگی سے بالکل جدا سمجھا جاتا ہے۔ یہ اُس صورت میں بھی درست ہے جب حیات بعد الموت کو دنیاوی زندگی کی نقل خیال کیا جائے کیونکہ نقل کبھی بھی اصل نہیں ہو سکتی۔

موت کی ناگزیریت اور قطعی پن کے پیش نظر یہ بات حیرت انگیز نہیں ہے کہ تمام ثقافتوں میں (جہاں تک ہمارا علم جاتا ہے) مرنے کے تصور نے بنی نوع انسانی کی سوچوں اور تخیل پر قبضہ کیے رکھا ہے۔ درحقیقت مخصوص ادوار...... مثلاً یورپی قرونِ وسطیٰ...... کے دوران یہ چیز واضح نظر آتی ہے۔ نسبتاً بہت کم مذاہب میں...... جن میں سے تین یعنی بدھ مت، عیسائیت اور اسلام عالمی تاریخ میں سب سے زیادہ اہم ہیں...... موت پر سوچ و بچار اس یقین تک پہنچاتا ہے کہ حیات بعد الموت یعنی حیات ابدی کی اہمیت زمین پر زندگی کی اہمیت سے بڑھ کر ہے۔ یہ روایت آج کے جدید سائنسی دور میں بھی اربوں انسانوں کے اندازِ فکر اور اخلاقی رائے کا تعین کرتی ہے۔ تاہم، تاریخ اور بشریات کے نکتۂ نظر سے موت کو زندگی سے زیادہ اہم قرار دینا زیادہ عام نہیں۔ بیشتر مذاہب

اس دنیا کی زندگی کو اہم مانتے ہیں۔

یہ بھی درست ہے کہ چند ایک ثقافتوں (بشمول ہندوستانی) میں زندگی اور موت دونوں کے درمیان نسبت قائم کی جا سکتی ہے۔ تاہم، پھر بھی زندگی اور موت کو ہستی کے مختلف انداز خیال کیا جاتا ہے۔ ہمیں یہ بھی ذہن میں رکھنا ہوگا کہ لافانیت، یعنی عیسائیت اور اسلام کی ابدی زندگی، ایک عام تصور نہیں ہے۔ بہت سی ثقافتیں یقین رکھتی ہیں کہ حیات بعد الموت بھی اختتام پذیر ہو سکتی ہے۔

بہت سی ثقافتوں میں دنیا میں پہلے موت کے ورود اور شر جیسے بے شمار نقائص کے درمیان اگر بلا واسطہ نہیں تو ایک بالواسطہ تعلق ضرور نظر آتا ہے۔ وینڈی ڈونیگر او فلیہرٹی اپنی تحقیقاتی کتاب "The Origins of Evil in Hindu Mythology" میں لکھتی ہے: "شر اور موت کے بارے میں ہندو اساطیر آپس میں قریبی طور پر منسلک ہیں...... موت اور شر کی اساطیر میں بار بار ایک جیسے ہی مقاصد اور درپیش مسائل کے ایک جیسے حل ہی نظر آتے ہیں۔"

ذرا مختلف انداز میں بات کی جائے تو بہت سی ثقافتوں کی تصور کردہ ساری کائنات کے اصل کامل نظم میں بے ترتیبی اور موت کا وجود نہیں تھا، اور نظم و ترتیب میں کوئی بگاڑ پیدا ہونے کے نتیجے میں ہی موت کا خیال آیا۔ بہت سے محققین نے رائے دی ہے کہ شر اور موت کو عموماً جنسی خواہش اور بھوک کے ظہور کے ساتھ جوڑا گیا۔ بہر صورت موت ایک ایسی چیز لگتی ہے جس کا وجود توضیح کا متقاضی ہے۔ عام عقیدے کے مطابق عملاً تمام ثقافتیں اسے اسی انداز میں لیتی ہیں۔

اگرچہ بہت سے لوگ پرسکون انداز میں مرتے ہیں، لیکن اساطیر میں موت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا بہت شاذ ملتا ہے۔ آئیوری کوسٹ کی ایک اسطورہ ایسے دور کے متعلق بتاتی ہے کہ جب موت نامعلوم تھی، اور پھر وجود میں آئی۔ موت کے آنے پر ایک کمزور اور چلنے کی ہمت سے محروم بوڑھے کے سوا تمام لوگ بھاگ کر ایک جھاڑی کے پیچھے جا چھپے: بوڑھے نے اپنے بیٹے سے ایک چٹائی بچھانے کو کہا تاکہ وہ لیٹ سکے۔ لڑکا ابھی یہ کام مکمل نہیں کر پایا تھا کہ موت آن پہنچی اور وہ دونوں ہی مر گئے۔

موت کا ماٰخذ

1886ء میں اینڈریو لانگ نے موت کے ماٰخذ کے متعلق اساطیر کی زمرہ بندی پیش کی، اور

1917ء میں فرانز بوآس نے شمالی امریکی انڈینز کے ہاں ان اساطیر کے موضوع پر ایک مضمون شائع کیا۔ 1936ء میں ہرمان بومان اور 1951ء میں ہانس ابراہامسن نے موت کے ماخذ کے متعلق افریقی اساطیر کی زمرہ بندی کی اور متعدد نقشے بھی بنائے جن میں دکھایا گیا تھا کہ اس براعظم پر ملنے والے متعدد تصورات کی جغرافیائی تقسیم کیا ہے۔ یہاں ہم ان تحقیقات کی بنیاد پر تصورات کی ایک عمومی فہرست دینے پر ہی اکتفا کریں گے۔ اگرچہ موت کو کسی دیوتا یا فرشتے کی صورت میں شخصی انداز دیا جاسکتا ہے، لیکن اس سے بمشکل ہی کوئی فرق پڑتا ہے۔

1۔ موت کو انسان کی فطری منزل یا دیوتاؤں کی ازلی خواہش کی مطابقت میں تصور کر کے قبول کرلیا گیا۔

2۔ کسی دیوتا یا کسی اور اسطوریاتی ہستی کی موت نے انسانی دنیا میں بھی موت کا ظہور ممکن بنایا۔ چنانچہ یہ ہرگز انسانی رویے کی وجہ سے نہیں ہے۔

3۔ انسانی موت الوہی ہستیوں کے درمیان تفرقے کا نتیجہ ہے۔

4۔ موت کسی دیوتا یا کسی اور اسطوریاتی ہستی کی جانب سے انسان کے ساتھ دھوکے بازی یا اُس کی بےوقوفی کا نتیجہ ہے۔

5۔ موت کسی انسانی کوتاہی کا نتیجہ ہے۔

6۔ موت انسان کے کسی غلط فیصلے یا کسی غلط انتخاب کا نتیجہ ہے۔

7۔ موت کسی جرم یا خطا کا نتیجہ ہے، لیکن اس خطا کا ہمیشہ ہی انسانی ہونا لازمی نہیں۔

8۔ انسان اِس لیے مرتا ہے کہ اُسے بذاتِ خود مرنے کی خواہش ہوتی ہے۔

چند ایک اساطیر ایسے خصوصی اور تفصیلی مسائل پیش کرتی ہیں کہ اُنہیں یہاں مختصراً بیان نہیں کیا جاسکتا۔ جنوبی ایشیائی مذہبی روایت میں مروج کچھ اساطیر اس کی مثال ہیں۔

موت ایک فطری یا خدا کے خواہش کردہ انجام کے طور پر:

اگرچہ جدید سائنسی تفہیم تعلیم دیتی ہے کہ انفرادی نامیاتی زندگی اپنے جوہر میں محدود اور فانی ہے، لیکن مذہبی سوچ کی تصور کردہ تمام ممکنات میں یہ یقین شامل ہے کہ موت فطری زندگی میں ایک تعطل ہے..... یعنی یہ اصل میں غیر فطری ہے۔ بہت سے ناخواندہ لوگوں میں موت کو "فطری" ماننے سے انکار اس چیز کو واضح انداز میں دکھاتا ہے۔ عام اسطورہ کے مطابق بہشت میں زندگی

گزارنا انسان کا مقدر تھا، لیکن کسی واقعے نے یہ مقدر تبدیل کردیا۔

اسی طرح یہ یقین بھی ہے کہ موت کسی دیوتا کی جانب سے انسان کا متعین کردہ مقدر ہے...... جیسا کہ متعدد مذاہب میں نظر آتا ہے۔ اصولاً موت انسان کی دشمن ہی رہی۔ مشرقی افریقہ میں Lugbara لوگ اگرچہ یقین رکھتے ہیں کہ تمام اہم امور اجدادی روحوں کے ہاتھوں میں ہیں، لیکن وہ موت کو خدا کی ہی کارستانی قرار دیتے ہیں۔ انڈونیشیا کے مختلف علاقوں میں یہ عقیدہ ملتا ہے کہ بنی نوع انسان ایک اعتبار سے دیوتاؤں کے مویشیوں جیسے ہیں۔ جب بھی دیوتا آسمان پر کسی جانور کو ذبح کرتے ہیں تو زمین پر ایک انسان کی موت واقع ہوجاتی ہے۔

جنوب مشرقی کونگو خطے کے Luba ایک بوڑھی عورت کی کہانی سناتے ہیں جو اپنے پیاروں کو کھو بیٹھی اور زمین پر اکیلی رہ گئی۔ اُسے سمجھ نہ آئی کہ آخر یہ سب کیوں اور کیسے ہوا ہے۔ اُس نے اپنا گھر چھوڑا تا کہ خدا کو ڈھونڈ کر اُس سے اپنی بدنصیبی کی وجہ دریافت کرسکے۔ اُس نے بہت طویل اور تھکا دینے والا سفر کیا، لیکن انجام کار خدا کو ڈھونڈ لیا اور سوالات پوچھے۔ تاہم، اُسے وہی جواب ملا جو ایوبؑ کو ملا تھا: کہ خدا طاقت ور ہے اور انسان اُسے کٹہرے میں کھڑا نہیں کرسکتا۔ اسی طرح Luba کو بھی محض اِس جان کاری پر قناعت کرنا پڑی کہ اُس کی تقدیر خدا کے ہاتھ میں ہے۔

یونان میں بھی ہم موت کے سامنے اِسی قسم کی تقدیر پرستی کا اظہار دیکھتے ہیں۔ ایلیڈ کے ایک مشہور اقتباس میں ہومر انسانی پشتوں کا موازنہ درخت کے پتوں سے کرتا ہے: جب سرما کے طوفانوں کا موسم شروع ہوتا ہے، پتے درختوں سے جھڑتے ہیں، اور اسی طرح ایک انسانی پشت کی جگہ اگلی پشت لے لیتی ہے۔

اِس موضوع پر کلاسیکی مثال (جس کا اکثر حوالہ دیا جاتا ہے) گل گامش کی بابلی داستان ہے۔ اِس داستان میں، گل گامش اپنے دوست اِن کدو کی اچانک موت کے بعد ابدی زندگی کا راز تلاش کرنے ساری دنیا میں گھومتا پھرتا ہے مگر کامیابی نہیں ہوتی۔ وہ زندگی کی ایک بوٹی دریافت کرتا ہے جس کے نام کا مطلب ہے، "نوشباب یافتہ بوڑھا۔" اگرچہ مزید کئی مشکلات اور خطرات کے بعد وہ چھوٹا سا پودا حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا جو دریائے موت کے پرلے کنارے پر اُگتا تھا، لیکن زندوں کی دنیا میں واپس آنے کے دوران ایک سانپ نے وہ پودا چرا لیا۔ تب کے بعد سانپ کو موت نہیں آتی، بلکہ وہ محض اپنی کینچلی ہی بدل لیتا ہے۔ سانپ کی یہ تمثیل دنیا بھر کی بہت سی

ثقافتوں میں متعدد تبدیل شدہ صورتوں میں ملتی ہے۔

گل گامش کو انسان کی لافانیت پر یقین لانا اور دیوتاؤں کی مرضی کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ داستان میں یہ بات یوں بیان کی گئی ہے:

گل گامش، تم کہاں سرگرداں ہو؟
تمہیں جس زندگی کی تلاش ہے وہ نہیں ملے گی!
جب دیوتاؤں نے انسانیت تخلیق کی
تو انسان کے مقدر میں فنا لکھ دی،
لیکن اُنہوں نے زندگی کو اپنے ہی اختیار میں رکھا۔

اگرچہ قدیم مصر موت کے ماٰخذ کی وضاحت کرنے کے لیے کوئی اسطورہ نہیں رکھتا تھا، لیکن مختلف تحریروں سے واضح ہو جاتا ہے کہ اُس نے موت کو ایک منفی عنصر خیال کیا، ایک ابنارمل صورت حال جو بدقسمتی سے ساری تخلیق میں خلقی ہے۔ ایک ہرم میں کندہ تحریر کے مطابق دیوتاؤں سے پہلے ابتدائے آفرینش میں موت موجود نہیں تھی۔ مصریوں نے نتیجہ اخذ کیا: تخلیق کیے گئے دیوتا بھی فانی تھے۔

تاہیتی سے تعلق رکھنے والی ایک اسطورہ دیوتاؤں ہنا اور حیفا تو اور انسان کے مقدر کے مسئلے پر اُن دونوں کے درمیان اختلافِ رائے کے بارے میں بتاتی ہے۔ ہنا نے تجویز دی کہ انسان موت کے بغیر دوبارہ پیدا ہو، لیکن حیفا تو نے جواب دیا کہ نباتات اور دھرتی کو مرنا ہے، اس لیے انسان کا مقدر بھی یہی ہونا چاہیے۔ ہنا کو چاند پر ہی قناعت کرنا پڑی جو مرتا اور پھر دوبارہ جنم لیتا ہے۔

کسی دیوتا کی مرضی اور طاقت کے باعث انسان کی موت کا تصور کچھ مذہبی مسائل سے دوچار کر سکتا ہے۔ پیاگونیا (جنوبی امریکہ) کے قبائل..... جو اَب نابود ہو چکے ہیں..... یقین رکھتے تھے کہ موت ایک مطلق دیوتا وتاؤنیوا (Waitaunewa) نے تخلیق کی، لیکن اُنہوں نے یہ عقیدہ مجہول طور پر قبول نہ کیا۔ اس کے برعکس، جب اُن کا کوئی عزیز رشتہ دار فوت ہوتا تو وہ نہ صرف آہ و زاری بلکہ احتجاج بھی کرتے: وہ دیوتا کو قتل کا مرتکب ٹھہراتے اور بطور انتقام اُس سے منسوب جانوروں کو ہلاک کرتے تھے۔ اس ضمن میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مسئلۂ شر کی طرح موت اور دنیا

میں تمام تکالیف کے مسائل دیوتائی انصاف کے نظریات سے قریبی طور پر منسلک ہیں۔

موت کسی اُلوہی موت کے نتیجہ کے طور پر:

ایک نظریے کے مطابق انسان اس لیے مرتا ہے کیونکہ ایک دیوتا یا کسی اور اسطوریاتی ہستی کی موت واقع ہوئی تھی، اور اِس معاملے میں نوعِ انسانی کی کسی غلطی یا خطا کا کوئی سوال نہیں۔ جرمن ماہر بشریات ایڈولف ای جینسن (1963ء) نے ایسی اسطوریاتی ہستیوں کو dema کا نام دیا ہے جنہوں نے ابتدائے آفرینش میں اپنے افعال کے باعث (اس وقت ہمیں معلوم) انسانی زندگی اور تہذیب شروع کی؛ تاہم، اُن کے افعال اُن کی اپنی موت کے ساتھ ہی ختم ہو گئے۔ کچھ اساطیر بتاتی ہیں کہ dema کو قتل کیا گیا تھا، لیکن کچھ دیگر کے مطابق وہ رضاکارانہ موت کا شکار ہوئے۔ dema کی زندگی اور موت انسانی تجربے کے لیے ایک الوہی معیار مہیا کرتی ہیں، کیونکہ انسان اِنہی اسطوریاتی پہل کاروں کی مثال پر عمل کرتے ہیں۔ اُلوہی اور انسانی مقدر کے درمیان ایک مشابہت پائی جاتی ہے: چونکہ کبھی دیوتا مرا تھا، اس لیے انسان بھی موت کے تابع ہیں۔ کچھ ایسی مثالیں بھی ہیں جو dema والے نظریے سے مربوط نہیں۔ مثلاً شمالی امریکہ کے Shuswap انڈینز کی ایک اسطورہ میں ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ایک آسمانی سردار کا بیٹا نامعلوم وجوہ کی بنا پر مر گیا۔ سب سے پہلی موت اُسی کی تھی، لیکن تب کے بعد تمام بنی نوعِ انسان بھی مرنے لگے۔

موت دیوتاؤں کی لڑائی کے نتیجہ کے طور پر:

انسانی موت کو دیوتاؤں کے درمیان لڑائی کے نتیجہ کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ مشرقی انڈونیشیا میں سیرام جزیرے کی ایک اسطورہ کیلے اور پتھر کے درمیان اس مسئلے پر دلیل بازی بیان کرتی ہے کہ انسان کو کیسے تخلیق کرنا چاہیے۔ پتھر نے کیلے کو مار ڈالا لیکن اگلے روز کیلے کے بچے لڑائی کے لیے تیار تھے۔ انجام کار پتھر ایک کھائی میں گر گیا اور ایک شرط پر شکست تسلیم کی: انسان وہی ہوں گے جیسا کیلے اُنہیں بنانا چاہیں گے، لیکن وہ کیلے کی طرح ہی مریں گے۔

بالائی نیل کے شیلوک کی ایک روایت موت کے ماٰخذ کی وضاحت دیوتائی کانگ اور اُس کے بھائی دووات کے درمیان ایک جھگڑے کے طور پر کرتی ہے۔ نئے بادشاہ کے لیے انتخاب میں

دوات کو چنا گیا اور نی کا نگ کو شکست ہوئی۔ نی کا نگ نے اپنا انتقام لینے کی خاطر شاہی عبا چرا لی اور اپنے حمائتیوں کے ہمراہ چلا گیا۔ دوات نے اپنے بھائی کا پیچھا کیا مگر اُسے پا نہ سکا۔ یہ دیکھ کر اُس نے کھدائی والی چھڑی نی کا نگ کے پیچھے پھینکی اور کہا: "اپنے لوگوں کو دفن کرنے کے لیے یہ چھڑی لے لو!" یوں موت اس دنیا میں آئی۔

زیریں کونگو کے موسارونگو کی ایک اسطورہ بھی ایک الوہی جھگڑے کے متعلق بتاتی ہے جس کا نتیجہ نوع انسانی کے لیے موت کی صورت میں نکلا۔ مالی کے ڈوگون دیوتاؤں کے درمیان ایک تنازع کے متعلق بتاتے ہیں جس میں دیوتا اوگو کا لِنگ کچلا گیا۔ اس کے نتیجے میں پہلے خود دیوتا اور پھر انسان مرا۔ شمالی امریکہ کے بلیک فیٹ انڈینز ایک دور کے متعلق بتاتے ہیں جب بوڑھا آدمی اور بوڑھی عورت نے ہر موقعے پر اختلاف کیا۔ مرد بنی نوع انسان کے لیے بہترین کا خواہش مند اور انہیں زندگی دینا چاہتا تھا، لیکن عورت کے منصوبے کچھ اور تھے۔

دیوتاؤں کے درمیان لڑائی کی ایک اور تبدیل شدہ صورت انسانی زندگی کے بارے میں سورج (یا کسی اور دیوتا) اور چاند کی لڑائی کے حوالے سے ہے۔ بلاشبہ ان کہانیوں میں سورج اور چاند اسطوریاتی ہستیاں ہیں۔ افریقہ میں متعدد اساطیر ملتی ہیں اور ہر ایک انسان کے انجام کا تعلق چاند کے ساتھ جوڑتی ہیں۔ تاہم، دنیا بھر میں اس قسم کی اسطورہ ملے گی کیونکہ چاند کے مدارج کے ساتھ انسانی زندگی اور موت کے تعلق پر قیاس آرائی تقریباً ہمہ گیر ہے۔ جنوبی بحرالکاہل میں جزائر فجی کی ایک اسطورہ ہمیں دو دیوتاؤں، چاند اور چوہا، سے متعارف کرواتی ہے جو انسانی تقدیر کے مسئلے پر آپس میں تنازع کا شکار ہوئے۔ چاند چاہتا تھا کہ انسان خود اُس کی طرح بوڑھا ہو، موت کا شکار ہو اور پھر دوبارہ جوان ہو جائے۔ لیکن چوہے نے اصرار کیا کہ چوہوں کی طرح انسانوں کو بھی موت آئے، اور اُس کی رائے غالب رہی۔

بحرالکاہل میں کیرولین جزائر کی ایک اسطورہ بتاتی ہے کہ آغاز میں انسان کی زندگی اور موت قمری مدارج کے ساتھ ہم وقوع تھی، لیکن تب ایک شرانگیز روح انسان کو ابدی موت دلوانے کی سازش میں کامیاب ہو گئی۔ انڈونیشیا میں سریا کھاڑی میں مروج ایک اسطورہ بھی کافی حد تک اسی جیسی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح ایک مکار بھیڑیا انسان کو دھوکے سے حکم عدولی پر مائل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اس طرح انسان اپنی تجدید حیات کی قوت کھو بیٹھے۔

موت دیوتاؤں کی دھوکا بازی یا لاپروائی کے نتیجہ کے طور پر:

کبھی کبھار موت کو الوہی دھوکا بازی سے بھی منسوب کیا گیا۔ بلاشبہ اس معاملے میں کرتب ساز کی مشہور اسطوریاتی شخصیت کے اثرات ہیں۔ وسطی کیلی فورنیا کے انڈین قبائل میں شعبدہ باز Sedit اپنی رشتہ دوانیوں کے باعث دنیا میں موت لایا۔ چنانچہ Maidu قبیلے والے بتاتے ہیں کہ کس طرح اُس نے ایک پہاڑی تباہ کی جس کی چوٹی پر آبِ حیات سے بھری ہوئی ایک جھیل تھی۔ نوع انسانی اس جھیل کا پانی پینے کے ذریعہ موت سے بچ سکتی تھی۔ متعدد شمالی امریکی انڈین اساطیر کیوٹے (Coyote) یا کسی اور شعبدہ باز کو موت لانے والا قرار دیتے ہیں۔ شعبدہ باز تخلیقی اور تخریبی خصوصیات کا امتزاج ہے۔ ایک منظم دنیا میں بے ترتیبی اور انتشار متعارف کرنے والی الوہی شخصیت کے طور پر وہ خود خالق کی طرح کائنات کا ناگزیر جز ہے جسے باہم متضاد عناصر کا مجموعہ خیال کیا گیا۔

مغربی انڈین ووڈو مذہب میں Gede ایک شعبدہ باز کے ساتھ ساتھ موت کا دیوتا بھی ہے۔ Maya Deren نے اپنی کتاب "The Living Gods of Haiti" میں Gede کو "لاش اور لِنگ، بادشاہ اور مسخرہ" قرار دیا۔ وہ تاریخی مقامات اور چوراہوں کا دیوتا ہے۔ وہ ہر انسان کو یاد دلاتا ہے کہ موت کسی کو نہیں بخشے گی۔ شعبدہ باز اور دیوتائے موت کا امتزاج قرین قیاس تھا، کیونکہ دیوتاؤں کا بدترین مذاق تخلیق کو اس انداز میں منظم کرنا تھا کہ موت نہ صرف ممکن بلکہ ناگزیر بھی ہو جائے تا کہ ہر انسان کو انجام کار مرنا پڑے۔

ایک اور Dogon اسطورہ میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ اولین انسانوں Andumbulu، کو موت نہیں آتی تھی، بلکہ وہ سانپ کی صورت میں قلب ماہیت کر جاتے تھے۔ ایک روز دیوتا Amma نے ایک نوجوان عورت کو گائے فروخت کرنے کی پیش کش کی۔ عورت نے قیمت پوچھی تو دیوتا نے بتایا کہ اس کی قیمت موت ہے۔ عورت گائے لے آئی اور کچھ ہی عرصہ بعد اُس کا شوہر مر گیا۔ عورت نے دیوتا سے شکایت کی تو اُس نے سودا یاد دلایا۔ Amma نے معاہدہ منسوخ کرنے اور گائے واپس لینے سے انکار کر دیا، اور یوں موت اس دنیا میں آئی۔

دیگر صورتوں میں ہمیں یہ رپورٹس ملتی ہیں کہ موت کسی اسطوریاتی ہستی کی لاپروائی یا حماقت کا نتیجہ تھی۔ اس قسم کی اسطورہ کو "ادھورا یا نہ ملنے والا پیغام" کہتے ہیں۔ قاصد عموماً سانپ یا چھپکلی ہے

جو دونوں ہی اپنی کینچلی بدل سکتے ہیں۔

یہاں بنیادی تصور یہ یقین ہے کہ مطلق دیوتا نے انسان کو ابدی زندگی دینے کا ہی سوچا تھا، لیکن کسی ماتحت دیوتا نے قصداً یہ ارادہ ناکام بنا دیا۔ مشرقی افریقہ کے Wute موت کے مآخذ کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں: خدا نے ایک گرگٹ (Chameleon) کے ہاتھ یہ پیغام دے کر انسان کی جانب بھیجا کہ نوع انسانی کو موت نہیں آئے گی۔ تاہم، گرگٹ کو یہ پیغام پہنچانے میں کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ راستے میں ٹھہرا اور ایک ٹوپی خریدی اور آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ انجام کار وہ دو ہفتے بعد اپنی منزل پر پہنچا۔ دریں اثنا سانپ کو خدا کی جانب سے یہ تحفہ بھجوائے جانے کا علم ہو گیا تھا۔ وہ انسان کے پاس آیا اور اپنے پاس سے یہ پیغام دیا کہ انسان کو موت آئے گی اور وہ زندہ نہیں ہو سکے گا۔ خدا نے سزا کے طور پر سانپ اور گرگٹ دونوں کو ملعون کیا۔ اب انسان انہیں دیکھتے ہی مار ڈالتے ہیں۔ تاہم، پیغام منسوخ نہ ہو سکا اور انسان کے مقدر میں موت لکھی گئی۔

گھانا کے اشانتی قبیلے کی ایک اسطورہ بہشت کے متعلق بتاتی ہے جس میں انسان رہا کرتا تھا۔ یہ پر مسرت حالت اُس وقت معطل ہو گئی جب چند عورتوں نے اناج پیستے وقت خدا کی موجودگی پر اعتراض کیا تھا۔ تب خدا دنیا کو چھوڑ کر آسمان پر چلا گیا۔ تاہم، وہ بدستور انسان پر مہربان رہا اور ایک بکرے کے ہاتھ یہ پیغام بھیجا کہ اُسے موت سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں، کیونکہ موت آنے پر وہ آسمان پر زندگی پائے گا۔ بکرے کو بھی جلدی نہیں تھی اور وہ راستے میں کچھ کھانے کے لیے رکا۔ خدا نے یہ دیکھ کر ایک بھیڑ کے ہاتھ وہی پیغام بھیجا، لیکن بھیڑ نے اصل الفاظ بولنے کی بجائے کہا کہ موت وجود کو قطعی طور پر ختم کر دے گی۔ فوراً ہی موت واقع ہونے لگی اور خدا نے نوع انسانی کو اپنے مردے ٹھکانے لگانے کا طریقہ سمجھایا۔ جنوبی افریقہ کے سان کی ایک اسطورہ میں قاصد خرگوش ہے، جو بہت سی ثقافتوں کے خیال میں ایک قمری جانور ہے۔

افریقہ کے جنوبی حصے میں ہوٹینٹوٹس (Hottentots) چاند کے مدارج کو لافانیت کے تصور کے ساتھ مربوط کرتے ہیں۔ وہ چاند کے ظاہر ہونے کو اس کی پیدائش اور غروب کو موت خیال کرتے ہیں۔ ہر موت کے بعد دوبارہ جنم ہوتا ہے: چاند کا بڑھنا نشو و نما، اور گھٹنا انحطاط ہے۔ ہوٹینٹوٹ اساطیر دانوں کے مطابق پرانے زمانے میں چاند نے انسانی نسل کو لافانیت سے نوازنا چاہا اور خرگوش نے یہ باعث مسرت خبر زمین تک پہنچانے کے لیے آمادگی ظاہر کی۔ چنانچہ چاند دیوتا

نے خرگوش کو نوع انسانی تک یہ پیغام لیجانے کی ہدایت کی: ''جس طرح میں مرتا اور دوبارہ زندہ ہوتا ہوں، اسی طرح تم بھی مرو اور دوبارہ جیو گے۔''

خرگوش نے سفر طے کیا، لیکن اپنے حافظے کی کمزوری یا محض بدطینتی کی وجہ سے پیغام کو اُلٹ دیا اور کہا: ''جس طرح میں مرتا ہوں اور دوبارہ زندہ نہیں ہوتا، اسی طرح تم بھی مرو گے اور دوبارہ زندہ نہیں ہو گے۔'' جب چاند کو خرگوش کی اس غلطی کا علم ہوا تو وہ بہت غضب ناک ہوا اور خرگوش کی جانب ایک چھڑی دے ماری۔ چھڑی خرگوش کو لگی اور اُس کا ہونٹ پھٹ گیا۔ اسی لیے آج بھی خرگوش کا ہونٹ کٹا ہوا ہے۔ چاند کے پیغام میں گڑبڑ کرنے کے ذریعہ خرگوش نے انسان کو لافانیت کے تحفے سے محروم کر دیا، اور ہوٹینٹوٹس آج بھی اس بنا پر خرگوش سے ناراض ہیں۔ لہٰذا جب قبیلے کا کوئی نوجوان عنفوانِ شباب کو پہنچتا اور بالغ مردوں کے درمیان جگہ پاتا ہے تو اُس کے لیے خرگوش کا گوشت کھانا ممنوع ہو جاتا ہے۔

مشرقی افریقہ کے نندی لوگوں کے ہاں ایک مقبول عام اسطورہ موت کے مآخذ کی کہانی ایک کتے کی بدبختی کے طور پر بیان کرتی ہے۔ اولین انسانوں کے دور میں ایک روز اُس نے یہ پیغام سنایا: ''تمام لوگ چاند کی طرح مریں گے لیکن اُس کے برخلاف دوبارہ زندہ نہیں ہوں گے، جب تک کہ تم مجھے اپنے پیالے میں سے پینے کو کچھ دودھ اور بیئر نہ دے دو۔ اگر تم نے ایسا کر دیا تو تمہارے مرنے کے بعد میں تمہیں دریا کے کنارے لیجانے کا انتظام کروں گا اور تم تیسرے دن دوبارہ زندہ ہو جاؤ گے۔'' انسانوں نے کتے کا مضحکہ اُڑایا اور اُسے نہایت غلیظ جگہ سے دودھ اور بیئر پینے کو دی۔ انسانوں والے برتن سے ہی پینے کو نہ ملنے پر غضب ناک کتے نے اعلان کیا: ''تمام لوگ مر جائیں گے، اور صرف چاند ہی دوبارہ زندگی پائے گا۔'' یوں غصے میں پاگل کتے نے، جو غالباً چاند دیوتا کا قاصد تھا، انسانی نسل پر فانی پن کی لعنت ڈال دی۔

موت کے مآخذ کے متعلق کچھ ایک اساطیر میں دو قاصد شامل ہیں۔ اس طرح کی ایک کہانی بوٹسوانا، صحرائے کلہاری اور جنوبی رہوڈیشیا کے کچھ حصوں میں رہنے والے Masarwas کے ہاں عام ہے۔ پرانے زمانوں میں چاند نے انسانوں کی جانب ایک قاصد بھیجنے کی خواہش کی۔ چاند نے کچھوے کو بلوایا اور اُس سے کہا: ''اُن انسانوں کے پاس جاؤ، اور انہیں میری طرف سے یہ پیغام دو۔ اُن سے کہنا کہ جس طرح مَیں مر کر زندہ ہوتا ہوں، اسی طرح تم بھی دوبارہ زندہ ہو

گے۔'' لیکن کچھوا سست رفتار ہونے کے علاوہ کمزور حافظے کی خامی بھی رکھتا تھا۔ چنانچہ چاند نے اُس سے عاجز آ کر خرگوش کو بلوایا اور کہا: ''تم تیز رفتار ہو۔ انسانوں کے پاس میرا یہ پیغام لے جاؤ: 'جس طرح میں مر کر زندہ ہوتا ہوں، اسی طرح وہ بھی دوبارہ زندہ ہوں گے۔' '' لیکن خرگوش کا حافظہ بھی خراب تھا۔ وہ برق رفتاری کے ساتھ روانہ ہوا اور فوراً ہی پیغام بھول گیا۔ انسان کی دنیا کے قریب پہنچنے پر خرگوش نے چاند کا پیغام ان الفاظ میں دیا: ''جس طرح میں مر کر زندہ ہوتا ہوں، اُسی طرح تم ہمیشہ کے لیے مر جاؤ گے۔'' انجام کار کچھوا بھی پہنچ گیا اور اپنی خراب یادداشت کے باوجود درست پیغام پہنچایا؛ لیکن افسوس کہ بہت دیر ہو چکی تھی۔

پیغام میں ردّ و بدل کی کہانیاں افریقہ کی سادہ لوح ثقافتوں میں بہت عام ہیں، اور اُن کی بنیاد اس مقبولِ عام عقیدے پر ہے کہ دیوتا انسان کو لافانی بنانا چاہتے تھے، لیکن ایک قاصد کی خطا یا کینہ پروری کے باعث یہ فیاضانہ منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ مشرقی اور مغربی دونوں نصف کروں میں بہت سے وحشی قبائل چھپکلیوں، سانپوں اور بھونروں کو لافانی سمجھتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ یہ جانور مخصوص عرصے بعد اپنی کھالیں اُتار پھینکتے اور اپنی جوانی کو متواتر نیا کرتے رہتے ہیں؛ لہٰذا اُنہیں کبھی موت نہیں آتی۔ چنانچہ مخصوص جانوروں کی لافانیت اور انسان کے فانی پن کی وضاحت کرنے کے لیے اساطیر تشکیل دی گئیں۔

مشرقی افریقہ کے Wafipa یا Wabende بتاتے ہیں کہ کس طرح خدا زمین پر آیا اور مخلوقات سے مندرجہ ذیل سوالات پوچھے: ''کون ہے جو مرنا نہیں چاہتا؟'' سانپ کے سوا انسان اور دیگر تمام جانور سوئے پڑے تھے۔ سانپ نے فوراً جواب دیا: ''میں نہیں مرنا چاہتا۔'' اسی لیے انسان اور دیگر جانور تو مر جاتے ہیں لیکن سانپ کو فنا نہیں۔ عقیدہ یہ ہے کہ سانپ صرف مارے جانے پر فنا ہوتا ہے؛ کیونکہ وہ ہر سال اپنی کینچلی بدل کر خود کو دوبارہ جوان کر لیتا ہے۔ برطانوی Guiana کے اراواکوں نے ہمیں بتایا ہے کہ ایک مرتبہ خالق یہ دیکھنے کے لیے دنیا میں آیا کہ نوعِ انسانی کیسے زندگی گزار رہی تھی، لیکن انسان اس قدر برے تھے کہ اُنہوں نے خالق کو مار ڈالنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اُن سے لافانی زندگی کی مراعات چھین کر ایسے جانوروں کو دے دی گئی جو اپنی کھال تبدیل کر لیتے ہیں...... مثلاً چھپکلیاں، سانپ اور بھونرے۔

موت کے ماٰخذ کے حوالے سے کچھ قدیم اساطیر میں مسخ شدہ پیغام اور کینچلی بدلنے کی کہانیوں

کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ اس قسم کی کہانی انّام میں بھی موجود ہے جہاں ایک داستانی دیوتا Ngoc نے انسانوں کی جانب اس پیغام کے ساتھ ایک قاصد روانہ کیا کہ بوڑھے ہونے پر وہ اگر اپنی جلدیں تبدیل کر لیا کریں تو ابدی زندگی جئیں گے، لیکن سانپ بوڑھے ہونے پر مر جائیں گے۔ جب آسمانی قاصد زمین پر پہنچا تو اعلان کیا: ''جب انسان بوڑھا ہو تو اپنی جلد تبدیل کر لے؛ لیکن جب سانپ بوڑھے ہوں تو وہ مر جائیں گے اور تابوتوں میں لٹائے جائیں۔'' قریب ہی موجود سانپوں کے ایک جتھے (brood) نے یہ اعلان پہلے سُنا اور قاصد کو ڈرایا دھمکایا اور اصرار کیا: ''تم دوبارہ اس کے بالکل اُلٹ اعلان کرو ورنہ ہم تمہیں ڈس لیں گے۔'' خوف زدہ قاصد نے اپنا بیان ان الفاظ میں دہرایا: ''' جب سانپ بوڑھا ہو تو اپنی جلد تبدیل کر لے؛ لیکن جب انسان بوڑھے ہوں تو وہ مر جائیں گے اور تابوتوں میں لٹائے جائیں گے۔'' اسی لیے سانپ کے سوا تمام جانور مر جاتے ہیں، اور سانپ بوڑھے ہونے پر اپنی کینچلی بدل لیتے اور ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

موت کے ماٰخذ کی اساطیر کا سب سے بڑا مرکز برِاعظم افریقہ رہا ہے۔ اور سر جیمز جارج فریزر کی رائے میں اسطورہ کا عبرانی ورژن غالباً افریقی الاصل ہی تھا:

> اگر اس سے آگے کی کہانی سومیری ورژن میں مل بھی جائے تو اس کے افریقی الاصل ہونے کا مفروضہ جھٹلا نہیں جاتا، کیونکہ سومیریوں کا اصل وطن معلوم نہیں...... ایک افریقی اصلیت رکھنے والی اسطورہ کی حمایت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سانپوں کی مفروضاتی لافانیت، جو غالباً کہانی کا اصل محرک تھی، کا تصور متعدد افریقی ورژنز میں محفوظ رہا، جبکہ عبرانی ورژن میں یہ تصور بالکل غائب ہو گیا۔ لہٰذا ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ افریقی کہانیاں نسبتاً پہلے کی اور اصل صورت کے زیادہ نزدیک ہیں، لیکن کتابِ پیدائش میں نامکمل کہانی شامل ہوئی۔ (91 صفحات 223-2)

موت انسانوں کی کسی کوتاہی کے نتیجہ کے طور پر:

ایک اور کیٹگری میں موت کا ماٰخذ انسانی فطرت کے اندر تلاش کرنے کی کوشش کی گئی...... یعنی یہ ایک انسانی نقص یا کوتاہی کا نتیجہ ہے۔ تاہم، اس نقص کو انسانی گناہ جیسا قرار دینا مشکل ہے۔ سولومن جزائر کی ایک اسطورہ کے مطابق بالاصل انسان اور سانپ دونوں بوڑھے ہونے پر اپنی کینچلی بدل لیتے اور پھر نئے سرے سے جوان ہو جاتے تھے۔ لیکن ایک بار کسی عورت نے کام پر

کہیں باہر جاتے وقت اپنے بچے کو اپنی ماں کے پاس چھوڑا۔ بچہ بوڑھی نانی کے ساتھ کھیلتے کھیلتے سو گیا اور نانی دریا پر نہانے اور اپنی کینچلی بدلنے چلی گئی۔ بچہ جاگا تو اپنی نانی کو پہچان نہ پایا کیونکہ اب وہ ایک خوب صورت جوان عورت کے روپ میں تھی۔ وہ رونے اور چیخنے چلانے لگا۔ نانی غصے میں آ کر دوبارہ دریا پر گئی اور اپنی پرانی کینچلی دوبارہ پہن لی۔ تب سے ہی انسان بوڑھے ہوتے ہیں اور صرف سانپوں میں اپنی کینچلی تبدیل کرنے کی صلاحیت ہنوز موجود ہے۔

افریقہ میں ملنے والی ایک اسطورہ کے مطابق دنیا میں موت کا ورود اس طرح ہوا کہ رات کے وقت خدا نے تمام انسانوں کے لیے بلا موت زندگی کا اعلان کیا، لیکن وہ نیند میں محو ہونے کے باعث یہ الوہی اعلان نہ سن سکے۔ یہ اسطورہ موت اور نیند کے درمیان ایک مخصوص تعلق کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ بلاشبہ یہ تعلق وسیع پیمانے پر تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن بس اِدھر اُدھر ہی کبھی اس نے موت کے ماخذ کا مسئلہ پیش کیا۔ یونانی اس نظریے کے حامل تھے کہ نیند (مارفیس) اور موت (تھاناٹوس) بھائی ہیں، اور یہ موضوع دیگر جگہوں پر بھی ملتا ہے۔ مغربی افریقہ میں کراس دریا کے Ekoi کی ایک اسطورہ بتاتی ہے کہ کسی دور میں خدا نے لوگوں سے پوچھا کہ آیا وہ مرنے کا مطلب جانتے ہیں، اور اُن سب نے نفی میں جواب دیا۔ خدا نے انھیں گاؤں کے اجلاس گھر میں جمع ہونے کا حکم دیا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد یہی سوال پوچھتا رہا، یہاں تک کہ اُن سب پر نیند غالب آ گئی۔ تب خدا نے انھیں بتایا کہ موت اور نیند ایک جیسی ہیں۔

اسی کیٹگری میں ایک اور موضوع وہ ہے جسے ہانس ابراہامسن نے ''اولین خاندان میں فساد'' کا نام دیا۔ یوگنڈا کے Lotuko ایک خاندانی جھگڑے کے متعلق بتاتے ہیں جس کے باعث موت انسانی زندگی کا ناگزیر انجام بن گئی۔ ایک دور میں کوئی بچہ مر گیا اور ماں نے مطلق دیوتا سے التجا کی کہ اُسے دوبارہ زندہ کر دے۔ لیکن بچے کے باپ نے غیر واضح وجوہ کی بنا پر بچے کو قتل کر ڈالا؛ اور یہ دوسری مرتبہ موت فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ تب مطلق دیوتا نے کہا: ''آج کے بعد کوئی بھی Lotuko مرنے کے بعد زندہ نہیں ہوگا۔''

انڈونیشیا کے جھیل شیختانی خطے کی ایک اسطورہ میں بتایا گیا ہے کہ اولین انسان اُس زبان کو نہ سمجھ سکے جس میں اُن کے باپ نے انھیں ابدی زندگی کا راز بتایا تھا۔ یہ انسان مر گیا لیکن اگلے روز دوبارہ زندہ ہوا۔ اُس نے سانپوں اور دیگر جانوروں کو بتایا کہ اب وہ اپنی کینچلیاں بدل سکتے

ہیں۔ یہ بات وہ اچھی طرح سمجھ گئے، لیکن وہ راز آشکار کرنے کے بعد خود اُسے بھول گیا؛ چنانچہ وہ ایک بار پھر مرا اور دوبارہ زندہ نہ ہو سکا۔

زمین پر موت کے ظہور سے منسلک ایک دلچسپ ترین موضوع یہ نظریہ ہے کہ موت انسان کو اس بات پر سزا دیتی ہے کہ اُس نے موت کو ایک دھوم دھڑکے اور خوشی کا موقعہ بنا دیا تھا۔ اس تصور میں غیر منطقی پن کا ازالہ اس مفروضے کے ذریعہ کیا گیا کہ ایک جانور کی موت کے موقعہ پر ہی ایسی دھوم مچائی گئی تھی۔ وسطی کونگو خطے کے Bena Kanioka کے خیال میں پہلی موت انسانی بے اعتدالی کا نتیجہ تھی۔ تاہم، اگر انسان تدفین کو جشن کا موقعہ نہ بنا دیتے تو اور کسی کو موت پیش نہ آتی۔ بالائی برما کی اسطورہ کے مطابق: ابتدائے آفرینش میں جب موت نامعلوم ہی تھی تو ایک بوڑھے آدمی نے مذاق مذاق میں سورج کے ساتھ مردہ ہونے کا ڈھونگ کیا۔ سورج دیوتا نے غصے میں آ کر جھوٹ موٹ کی موت کو حقیقی موت میں بدل دیا اور یوں موت کا آغاز ہوا۔ یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ موت کو بطور سزا انسانی دنیا میں مستقل بنایا گیا۔

موت کسی غلط انتخاب کے نتیجہ کے طور پر:

موت کو خود انسانوں کی جانب سے کیے ہوئے کسی غلط انتخاب کے نتیجہ کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ Luba کے ایک ذیلی قبیلے ہولوہولو کے مطابق خدا نے انسان کو اختیار دیا کہ وہ اُس کے دونوں ہاتھوں میں بند ایک ایک جوز میں سے کوئی ایک منتخب کر لے: ایک جوز زندگی اور دوسرا موت کا نمائندہ تھا۔ انسان (عورت) نے غلط انتخاب کیا اور یوں موت نوع انسانی کا مقدر بن گئی، جبکہ اُس موقعہ پر موجود سانپ نے درست انتخاب کیا اور زندگی کی تجدید کا تحفہ پایا۔

Sulawesi کے توراجا کی اسطورہ ہمیں غلط انتخاب کی ایک اور کہانی بتاتی ہے۔ ایک روز خدا نے آسمان سے زمین پر نوع انسانی کے لیے ایک تحفہ نازل کیا، لیکن انسان تحفے کا استعمال سمجھ نہ سکا اور اُسے مسترد کر دیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد خدا نے انسان کو کیلا پیش کیا جو اُس نے فوراً قبول کر لیا۔ تاہم، انسان اپنے کیے ہوئے انتخاب کا حقیقی مفہوم سمجھ نہیں پایا تھا۔ کیلے کے درخت کو اکثر جگہوں پر موت اور تجدید کی علامت سمجھا جاتا ہے، کیونکہ اِسے کاٹنے پر نیا درخت اُگ آتا ہے۔

بالائی کونگو خطے کے نگالا ایک اسطورہ میں موت کے ورود کی وضاحت کرتے ہیں جس کے

مطابق خدا نے جنگل میں کام کرتے ہوئے ایک آدمی کو دو گٹھڑ پیش کیے...... ایک میں متعدد چھوٹی چھوٹی چیزیں، مثلاً چاقو اور موتی تھے، اور دوسرے گٹھڑ میں ہمیشہ رہنے والی زندگی تھی۔ آدمی موقع پر ہی دونوں میں سے ایک گٹھڑ کے انتخاب کا فیصلہ نہ کر پایا اور صلاح لینے کی غرض سے گاؤں میں گیا۔ دریں اثنا کچھ عورتیں وہاں سے گزریں اور خدا نے انہیں بھی دو گٹھڑوں میں سے ایک منتخب کرنے کو کہا۔ انہوں نے بڑا گٹھڑ کھولا اور اُس میں آئینے اور دیدہ زیب کپڑے دیکھے۔ چنانچہ انہوں نے بڑا والا گٹھڑ ہی پسند کر لیا۔ اس طرح انسان ابدی زندگی سے محروم رہ گیا اور موت کا مستحق بنا۔

موت انسانی گناہ کے نتیجہ کے طور پر:

اساطیر کی ایک کافی بڑی تعداد میں انسانی گنہگاری کو موت کی وجہ گردانا گیا ہے۔ ماہرِ بشریات پال ریڈن نے یہ لکھتے وقت صریح غلطی کی کہ بائبل کے سوا کہیں بھی انسان کو موت کے مآخذ کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا گیا۔ یہ درست ہے کہ اس خطا کو متعدد طریقوں سے تصور کیا جا سکتا ہے۔ افریقہ میں نائجیریا کے یوروبا کے ہاں اور برکینا فاسو کے لوبی لوگوں کے ہاں ہمیں ایسی اساطیر ملتی ہیں جن میں انسان ایک عمومی اخلاقی انحطاط کے نتیجہ میں موت کا مستحق بنا۔

جنوبی آرمینیا کے اورینوکو کے معدوم ہو چکے ایک قبیلے کی اسطورہ میں بتایا گیا تھا کہ کس طرح آغاز میں دو بھائیوں نے زمین کو تخلیق کیا تھا۔ ایک بھائی Amalivaca کچھ عرصہ تک انسانوں کے درمیان مقیم رہا۔ دیوتاؤں کی دنیا میں واپس جانے سے پہلے اُس نے اعلان کیا کہ وہ اپنی کینچلی اُتار پھینکے گا، اور انسانوں کو بھی یہی مشورہ دیا کہ جب شباب کی تجدید کرنا ہو تو ایسا ہی کیا کریں۔ تاہم، ایک عورت نے اُس کا مشورہ کارآمد ہونے پر شک کیا۔ چنانچہ دیوتا غصے میں آیا اور عورت کو بتایا کہ اُسے موت آ جائے گی؛ اُس عورت کا شک ہی موت کو دنیا میں لانے کا باعث بنا۔ اس گناہ کی تین نوعیتیں ہیں۔

نافرمانی: عام عقیدے کے مطابق موت کی وجہ انسان کا خدا کے کسی حکم کو نہ ماننا تھی۔ کچھ ضمنی تحریکات بھی ملوث ہو سکتی ہیں، مثلاً تجسس یا بے احتیاطی۔ لیکن نافرمانی ہی مرکزی نکتہ رہی۔

نافرمانی کی سزا کے طور پر موت کے ورود کی مشہور ترین مثال بلاشبہ بائبل میں بیان کردہ آدم وحوا کی کہانی ہے۔ کچھ محققین نے اس کہانی سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ خدا آدم اور حوا کو ابدی زندگی دینا

چاہتا تھا، البتہ کہانی میں یہ چیز واضح نہیں۔

کتاب پیدائش (16-18:2) میں کسی ابہام کے بغیر بتایا گیا ہے: ''اور خداوند نے آدم کو حکم دیا اور کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل بے روک ٹوک کھا سکتا ہے۔ لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت کا پھل کبھی نہ کھانا کیونکہ جس روز تو نے اُس میں سے کھایا تو مرا۔'' سانپ نے حوا کو ممنوعہ پھل کھانے کی تحریص دلائی۔ اُسے وہ اچھا لگا اور آدم کو بھی کھانے کے لیے دیا۔ توقعات کے عین مطابق خدا کو اس نافرمانی کا پتا چل گیا اور اُس نے تینوں کو ملعون کیا: سانپ، حوا اور آدم۔ عجیب بات ہے کہ خدا کی جانب سے لعنت بھیجنے کے لیے استعمال ہونے والے جملوں میں کہیں بھی موت کا حوالہ واضح انداز میں نہیں ملتا۔ بلکہ اس کی نشاندہی صرف علامتی انداز میں ہوتی ہے: ''تو اپنے منہ کے پسینے کی روٹی کھائے گا جب تک کہ زمین میں تو پھر لوٹ نہ جائے، اس لیے کہ تو اُس سے نکالا گیا ہے کیونکہ تو خاک ہے اور خاک میں پھر لوٹ جائے گا۔'' (پیدائش، 19:3)

خدا نے آدم و حوا کے لیے لباس بنا لینے کے بعد ہی انسانوں کو باغِ عدن سے نکالنے کا سوچا کہ کہیں وہ شجرِ حیات کا پھل بھی نہ کھا لیں: ''اور خداوند نے کہا دیکھو انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک کی مانند ہو گیا۔ اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور حیات کے درخت سے بھی کچھ لے کر کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے۔'' (پیدائش، 3: 22) اس کہانی میں جا بجا ملنے والے تضادات پیدائش کو کافی مسحور کن واقعہ بنا دیتے ہیں۔ خدا کے پہلے اعلان میں شجرِ حیات ممنوعہ نہیں، البتہ اس کا ذکر ضرور کیا گیا۔ چنانچہ انسان نے محض اتفاقاً غیر ممنوعہ شجرِ حیات کا پھل نہ کھایا۔ تاہم، نیک و بد کے علم کے درخت کا ممنوعہ پھل کھاتے ہی انسان کی موت یقینی بن جانے کا اعلان ایک کھوکھلی دھمکی معلوم ہوتا ہے۔ اِن دھمکی آمیز الفاظ کے باوجود انسان کو ابدیت سے دور رکھنے کی خاطر خدا کو خصوصی اقدامات کرنا پڑے۔ کتابِ پیدائش میں داستانِ تخلیق کا یہ مختصر تجزیہ دکھاتا ہے کہ انسانی نافرمانی اور موت کے مآخذ کے درمیان تعلق کافی ڈھیلا ڈھالا ہے اور ہم سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ آیا نافرمانی کے نتیجہ میں موت کے مآخذ کی یہ مشہور ترین مثال واقعی بہترین بھی ہے یا نہیں۔

قرونِ وسطٰی کے ماہرینِ الٰہیات نے یہ جاننے کے لیے کافی بحث و تمحیص کی کہ گناہ کی اصل کیا تھی، کیونکہ نافرمانی سات مہلک گناہوں میں شامل نہیں۔ کچھ ماہرینِ الٰہیات نے غرور یا

شہوت کو انسانی ذلت کی وجہ بتایا۔ بدھ مت میں بھی لالچ اور موت قریبی طور پر باہم منسلک ہیں۔ بقول اولفلیبرنی: ''موت اور لالچ شیطان میں یکجا ہیں۔''

Guyana کے کاریب کے ہاں ملنے والی ایک اسطورہ بتاتی ہے کہ کس طرح خالق دیوتا Pura انسان کو ابدی زندگی دینا چاہتا تھا، لیکن انسان نے یہ منزل پانے کے لیے دیوتا کی دی ہوئی ہدایات کو نظر انداز کیا اور تمام انسان موت کے حق دار ٹھہرے۔ زیمبیا کے لامبا کے ہاں مروج اسطورہ بتاتی ہے کہ کس طرح انسان کو خدا کی جانب سے چھوٹی چھوٹی گٹھڑیاں موصول ہوئیں۔ گٹھڑیاں لانے والے قاصدوں کو حکم دیا گیا تھا کہ انہیں کھول کر نہ دیکھے: انہیں بغیر کھولے ہی ''زمین کے آقا'' تک پہنچانا تھا۔ تاہم، قاصدوں نے تجسس کے تحت ایک گٹھڑی کھول لی جس میں موت بند تھی۔ Ekoi کے مطابق خدا نے انسان کو حکم دیا تھا کہ وہ کبھی کسی سفید بھیڑ کو مارے اور نہ ہی کھائے۔ انسان نے حکم عدولی کی اور بطور سزا تمام انسانوں کو موت کا حق دار بنا دیا۔

ممنوعہ پھل کا موضوع صرف بائبل تک محدود نہیں۔ وسطی افریقہ کے ایک بگمی گروپ Efe کے لوگوں کا کہنا ہے کہ خالق نے صرف ایک درخت کا پھل ممنوعہ قرار دیا تھا۔ تاہم، ایک حاملہ عورت کو ممنوعہ پھل کھانے کی شدید خواہش ہوئی اور اُس نے اپنے شوہر کو وہ پھل توڑ کر لانے پر مجبور کر لیا۔ اس نافرمانی کے نتیجے میں خدا نے دنیا میں موت نازل کی۔ یہ داستان بائبلی کہانی سے کچھ مشابہت کی حامل ہونے کے باوجود غالباً کوئی جداگانہ مآخذ رکھتی ہے۔ بائبلی کہانی کی متعدد اہم تفصیلات غائب ہیں: مثلاً شجرِ علم کا کوئی ذکر نہیں۔ متعدد دیگر تفصیلات بھی آپس میں ٹکراتی ہیں۔ نیز افریقہ میں بھی اِس داستان کے کئی مختلف ورژن ملتے ہیں۔

نافرمانی کے موضوع کی ایک اور تبدیل شدہ صورت پینڈورا کے صندوق کا موضوع ہے؛ اگرچہ یہ کہانی سنانے والے یونانی شاعر ہسیاڈ نے اپنی رزمیہ داستان میں صندوق کی بجائے مرتبان کا ذکر کیا تھا۔ زیئس نے پینڈورا کو ایک مرتبان دیا اور ساتھ ہی ہدایت کر دی تھی کہ اِسے ہرگز نہ کھولے۔ پینڈورا نے نافرمانی کی اور ڈھکن کھول کر دنیا میں بدقسمتی اور ہر قسم کی آفات کو کھلا چھوڑ دیا۔ مرتبان میں موجود واحد مثبت چیز 'اُمید' تھی۔

جنسی خطا: موت کا باعث بننے والے جرم یا گناہ کسی انسان کی جانب سے ارتکاب کردہ کوئی جنسی گناہ بھی ہو سکتا ہے، لیکن یہ انحراف اور پر دیوتاؤں کی دنیا سے بھی تعلق کا حامل ہو سکتا ہے۔

چنانچہ ڈوگون کی اسطورہ کے مطابق دیوتا اوگو کے محرمانہ جنسی تعلقات کے نتیجے میں موت اس دنیا میں وارد ہوئی۔

افریقہ میں ملنے والی ایک اسطورہ بتاتی ہے کہ خدا نے اولین انسانوں کو مجامعت کرنے سے منع کیا تھا۔ اس حکم کی خلاف ورزی کرنے پر موت وجود میں آئی۔ نائجیریا کے Nupe کی ایک داستان کے مطابق خدا نے سب سے پہلے کچھوا اور اُس کے بعد انسان اور پتھر تخلیق کیا۔ اُس نے کچھوے اور انسان کو زندگی کا تحفہ دیا، لیکن پتھر کو نہیں۔ اُس وقت تک موت کا کوئی وجود نہیں تھا، لہٰذا کچھوا اور انسان بوڑھے ہو کر دوبارہ جوان ہو جاتے تھے۔ مگر وہ اِس صورتِ حال سے مطمئن نہ ہوئے اور خدا کے پاس اولاد مانگنے گئے۔ خدا نے بتایا کہ یہ خواہش پوری ہونے کی صورت میں انہیں مرنا پڑے گا۔ کچھوے اور انسان دونوں نے ہی بچوں کی خواہش پر اصرار کیا، اور جب بچے پیدا ہوئے تو اُن کے باپ مر گئے۔

وسطی ہندوستان کے بیگا کی ایک اسطورہ موت کے آغاز کو اولین انسانی مجامعت کے ساتھ جوڑتی ہے۔ ایک بیگا مرد اور عورت نے جنگل میں مباشرت کی جو اُس سے پہلے نامعلوم چیز تھی۔ زمین تھرتھرانے لگی اور وہ فوراً ہی مر گئے۔ تب سے ہی موت انسانی زندگی کا ایک حصہ بن گئی۔ کولمبیا کے ٹوکانو انڈینز پہلی موت کا تعلق شہوانیت کے ساتھ جوڑتے ہیں۔

قتل: قتل بھی پہلی موت کے اسباب میں سے ایک ہے۔ بہت سی مثالوں میں ابتدائے آفرینش میں کوئی اسطوریاتی شخص قتل ہوتا ہے۔ سماٹرا کے قریب واقع میِنتاوائی جزائر کی ایک اسطورہ میں بتایا گیا ہے کہ اولین انسان بانس کے ایک درخت میں سے ظاہر ہوئے تھے، اور فوراً ہی ایک جھاڑی میں جا چھپے۔ وہاں اُنہوں نے بڑی خراب زندگی گزاری، حتیٰ کہ دیوتا Siakau نے اُن پر رحم کھایا اور انہیں سکھایا۔ بعد میں دیوتا نے خود ایک گرگٹ (اُن جزائر کا مقدس جانور) کا روپ دھارا۔ مگر چار اولین انسانوں میں سے دو نے غلطی سے اُسے مار ڈالا۔ اِس خطا کی فوری سزا موت کی صورت میں ملی۔ دیگر دو افراد فرار ہو گئے، لیکن موت ہمیشہ کے لیے دنیا میں آ گئی۔

Guyana کے اراواک کے ہاں ہمیں خالق دیوتا کے متعلق ایک اسطورہ ملتی ہے۔ ایک مرتبہ جب وہ اپنی مخلوقات کا حال چال معلوم کرنے زمین پر آیا تو ایک مکار آدمی نے اُسے قتل کرنے کی کوشش کی۔ نتیجتاً دیوتا نے نوعِ انسانی کو ابدی زندگی کے تحفے سے محروم کر دیا اور اِس کی بجائے

سانپ اور ایسی ہی دیگر مخلوقات کو دے دیا۔ شمالی امریکہ کے Algonquin انڈینز ابتدائے آفرینش میں واقع ہونے والی ایک لڑائی کے متعلق بتاتے ہیں جس کے دوران بحری جانوروں نے ثقافتی ہیرو Manabush کے چھوٹے بھیڑیے بھائی کو ڈبو دیا تھا۔ یوں موت اِس دنیا میں آئی۔

متعدد ثقافتوں میں ہمیں یہ عقیدہ ملتا ہے کہ ایک دور میں انسانی زندگی موت اور نہ ہی جنم سے آشنا تھی: بس زندگی ہمیشہ قائم رہتی، تولید اور پیدائش معلوم نہیں تھی۔ تب کچھ گڑبڑ پیدا ہوئی، قتل وغیرہ جیسا کوئی انحراف واقع ہوا اور صورت حال بالکل بدل گئی۔ نتیجتاً ایک نیا اندازِ حیات بنا جس میں پیدائش اور موت باری باری آتی تھیں۔ سیرام کی ایک ''دوشیزہ'' کی کہانی اس کی بہت اچھی مثال ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کیسے لوگوں نے دوشیزہ سے حسد کیا کیونکہ وہ سب سے زیادہ خوش قسمت اور خوش حال تھی۔ قبیلے کے ایک اجلاس کے دوران رقاصوں نے ایک گھیرا بنایا اور دوشیزہ سے مرکز میں آنے کو کہا۔ اُنہوں نے درمیان میں ایک گہرا گڑھا کھود رکھا تھا۔ دوشیزہ کو گڑھے کے اندر پھینک دیا گیا جبکہ گیتوں کی آواز نے اُس کی چیخوں کو چھپا لیا۔ رقاصوں نے اوپر سے مٹی ڈال کر پیروں سے اچھی طرح دبا دی۔ اِس قدیم قتل نے موت اور پیدائش کا سلسلہ جاری کیا۔

موت انسانی خواہش کے طور پر:

آخری کیٹگری میں وہ اساطیر شامل ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح انسان نے اکتاہٹ سے بھرپور زندگی سے عاجز آ کر موت کی خواہش کی تھی۔ ابراہام سن (1951ء) نے اِس نوعیت کی افریقی داستانوں کی جانب توجہ مبذول کروائی ہے جس کے مطابق بیماری میں مبتلا، یا بڑھاپے کی کلفتوں سے پریشان حال انسان نے مرنا چاہا اور یوں موت کو اپنی جانب بلایا۔ کیمرون کے Mum کی اسطورہ بتاتی ہے کہ خدا سمجھ نہ سکا کہ اِتنے بہت سے انسان سرد اور اکڑ کیوں جاتے ہیں، لیکن موت (ایک دیوتا کی صورت میں) نے اُسے بتایا کہ بوڑھے اور تکلیف زدہ لوگ ہستی کے بندھنوں سے نکلنا چاہتے تھے۔ Ngala کے مطابق انسان نے اِس لیے موت کی خواہش کی کیونکہ دنیا میں بہت زیادہ برائی اور ناخوشی تھی۔ بالائی نیل کے نیوبا موت کی خواہش کو آبادی میں اضافے کی حقیقت کے ساتھ منسلک کرتے ہیں۔

غالباً افریقہ کی ایک اسطورہ کا واضح ترین ورژن مراکش سے ملتا ہے اور یہ اسلامی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ اس کے مطابق ایک دوشیزہ پانچ سو برس تک زندہ رہی۔ ایک دفعہ حضرت موسیٰ کو اُس کی پازیب مل گئی جو موت سے پہلے اُتاری گئی تھی۔ حضرت موسیٰ نے خدا سے دعا کی کہ اُس لڑکی کا دیدار کروا دے۔ خدا نے دعا قبول فرمائی اور لڑکی کو قبر سے دوبارہ اُٹھا دیا۔ حضرت موسیٰ کے ساتھ گفتگو کے دوران لڑکی نے کہا کہ وہ اِتنی طویل زندگی کے باعث اکتاہٹ کا شکار ہو گئی تھی۔ تب حضرت موسیٰ نے خدا سے درخواست کی کہ وہ انسان کو جلد موت دے دیا کرے۔

حاصلِ بحث

اساطیر میں موت کے مآخذ کے حوالے سے یقیناً اور بھی متعدد موضوعات موجود ہیں۔ ہندوستان کی اساطیر موت کے ورود کو زمین کی آبادی حد سے زیادہ بڑھنے اور فاقے پیدا ہونے کے ساتھ جوڑتی ہیں۔ اوپر مذکور نیوبا کی اسطورہ کے برعکس اِس ہندوستانی اسطورہ میں دیوتا ہی موت بھیجنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔

اِن اسطوریاتی حوالوں کے ذریعہ ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ موت کے مظہر نے ہمیشہ سے انسان کی توجہ اپنی جانب کھینچی۔ عموماً اُس نے اِس کی وضاحت کے لیے کہانیاں تراشیں جو وقت کے دریا میں بہتے بہتے ہمارے شعور اور لاشعور کا حصہ بن گئیں۔ آج دنیا کے تینوں بڑے مذاہب میں تخلیق اور گناہ کی تقریباً ملتی جلتی داستانیں موجود ہیں جنہیں بالکل درست مانا جاتا ہے۔ یہاں بیان کردہ مثالیں اشارہ دیتی ہیں کہ وہ داستانیں کس طرح وجود میں آئی ہوں گی۔

حصہ دوم

نفسیات

3

موت اور مرنا

''موت'' اور ''مرنے'' کی اصلاحات ہم معنی نہیں، اور نہ ہی اِن کی کوئی دوٹوک اور متفقہ تعریفیں موجود ہیں۔ حیاتی افعال کے قطعی طور پر رک جانے کو موت کہا جاتا ہے، جبکہ اِن افعال سے محروم ہونے کا مطلب ''مرنا'' ہے۔ مرنے کے عمل کو زندہ رہنے کے ساتھ لازم وملزوم بھی سمجھا جاسکتا ہے، یہ پیدائش سے موت تک کے عمل کا حصہ ہے۔

عموماً ''موت'' کی تعریف جسم کے قوائی افعال کے خاتمے کے طور پر کی جاتی ہے جن میں دل کی دھڑکن، دماغی سرگرمی اور تنفس کا بند ہونا شامل ہے۔ موت ناگہانی انداز میں کسی بھی وقت آ سکتی ہے، اور صرف بوڑھے ہی اس کا خصوصی ہدف نہیں۔

Weissman نے موت کے معانی کو چار زمروں میں رکھا: (1)۔ موت ایک سراب اور زندگی کی توسیع ہے؛ زندگی کی ایک اور صورت کا پیش خیمہ؛ موت کا مطلب معدومیت نہیں، بلکہ تقلیب ہے۔ (2)۔ موت زندگی کی ایک ناگزیر اور اٹل حقیقت ہے۔ (3)۔ موت زندگی کی ایک توضیح اور تلافی ہے؛ یہ فانی پن کے بندھنوں سے آزاد کرتی ہے۔ (4)۔ موت زندگی کی شکست ہے، ایک المیہ، زندگی کی اقدار کی نفی ہے۔ موت کے متعلق یہ سبھی تھیوریز زندگی کے متعلق ایک عقیدہ ہیں۔

حیاتیاتی نکتۂ نظر سے موت تمام حیاتی افعال کے مستقل طور پر رک جانے کا نام ہے۔ وسیع تر

نفسیاتی، معاشرتی اور ثقافتی نکتۂ نظر سے موت حیاتیاتی عمل کی آخری منزل سے کافی زیادہ کچھ ہے۔ موت کے تصورات نہایت موضوعی اور پیچیدہ ہیں، اور وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ نیز افراد کے رویے اور حالات موت کے معانی کو بہت سے رنگ دے دیتے ہیں۔

موت کی تین جہتیں ہیں۔ غیر شخصی جہت کے مطابق موت ایک غیر شخصی واقعہ ہے، کسی بھی انسانی عنصر سے محروم مردے محض بے جان جسم ہی ہوتے ہیں۔ کسی چیز کی موت کوئی شخصی دکھ یا احساس زیاں پیدا نہیں کرتی۔ مثلاً اجنبیوں کی موت کی خبریں غیر شخصی اہمیت رکھتی ہیں کیونکہ جذباتی احساس موجود نہیں ہوتا۔

موت کی بین شخصی (Interpersonal) جہت کا تعلق کسی دوسرے کی موت کی معروضی حقیقت کے ساتھ ہے۔ ہماری موضوعی موت اس میں ملوث نہیں ہوتی۔ اس کا مثالی ردعمل دکھ اور سوگواری ہے۔ کسی اہم شخص کی موت ہمیں متاثر کرتی ہے۔ غیر شخصی موت مردے کو ایک چیز کے طور پر دیکھتی ہے، جبکہ بین شخصی موت کا مطلب ''کوئی اور مرا ہے'' ہوتا ہے۔

داخلی شخصی (Intrapersonal) موت شخصی فانی پن کے داخلی تجربے سے تعلق رکھتی ہے جس سے زیادہ تر لوگ خوف کھاتے ہیں۔ اصل اہمیت صرف اس جہت کی ہے۔ مردے کی لاش یا کسی اور کی موت کا اثر موت کی موضوعی اہمیت کی وجہ سے ہی اہم بنتا ہے۔

موت کی جانب رویے

صعب العلاج مریضوں کے دوست اور رشتہ دار اُن سے دور کیوں ہونے لگتے ہیں؟ خوفِ زیاں کو سمجھے بغیر ہم قریبی تعلقات کی تفہیم کیسے حاصل کر سکتے ہیں؟ بہت کم سن بچے بھی زندگی سے علیحدگی اور زندگی کو لاحق خوف سے آگاہ ہوتے ہیں۔ موت کی جانب بچوں کے رویوں کا ذکر ہم نے ایک علیحدہ باب میں کیا ہے، یہاں نوجوانوں اور بالغوں کے حوالے سے بات کی جائے گی۔

نوجوان:

معمول کے ادراکی وظائف کے اہل نوجوان مانتے ہیں کہ موت ناگزیر اور حتمی ہے۔ اُن کے بڑے خوف ٹین ایجرز جیسے ہیں: کنٹرول نہ ہونا، غیر کامل پن اور مختلف ہونا۔ جسمانی تاثر، گنجے پن یا جسمانی کنٹرول کے زیاں کا خوف علاج جاری رکھنے کے خلاف بہت زیادہ مدافعت پیدا کر سکتا

ہے۔ خوف، غصے، دکھ، اضطرار، بے حسی، دہشت اور خوشی کے جذبات مشترک ہیں۔ موت کی تفہیم کے لیے نوجوان کی ادراکی صلاحیت کا اپنی موت کے ممکن ہونے کے ادراک میں بدل جانا لازمی نہیں۔ مایوسی یا گوشہ نشینی کا امکان بہت زیادہ ہے کیونکہ ٹین ایجرز خود مختاری کے زیاں کو والدین کی جانب سے مدد کے ہم معنی قرار دے سکتے یا پھر دوستانہ رویوں کو حقیقتاً مسترد کرنے کے ذریعہ خوفِ علیحدگی کی تردید کر سکتے ہیں۔ ٹین ایجرز کو اپنی موت سے متعلقہ فیصلہ ساز عمل کا حصہ ہونا چاہیے۔ بہت سے نوجوان موت کا سامنا کرتے وقت بڑی ہمت اور وقار کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

بالغ:

بچوں اور ٹین ایجرز کے برخلاف بالغ لوگ عموماً فوراً تسلیم کر لیتے ہیں کہ اُن کا آخری وقت آ گیا ہے۔ اگرچہ وہ موت سے خوش نہیں ہوتے، لیکن اس کے ساتھ سمجھوتہ کر سکتے ہیں۔

ارِکسن کے مطابق زندگی کے دور میں آٹھواں اور آخری مرحلہ سالمیت یا پھر مایوسی کا احساس لاتا ہے۔ بوڑھے بالغ افراد جب اپنی زندگیوں کے آخری مرحلے میں داخل ہوں تو اپنے دور اور زندگی گزارنے کے انداز پر غور و فکر کرتے ہیں۔ اپنے آپ سے ایمان داری فرد کو ناگزیر بیماری اور موت کو لاچاری کے خوف کے بغیر قبول کرنے کے قابل بناتی ہے۔ تاہم، اگر کوئی شخص اپنی زندگی کو کوتاہیوں یا بدقسمتیوں کا ایک سلسلہ سمجھے تو شدید مایوسی غالب آ جاتی ہے...... کہ اگر یوں ہوتا تو کیا ہوتا، یوں نہ ہوتا تو کیا ہوتا!! تب موت خوف ناک لگتی ہے کیونکہ یہ خالی پن اور ناکامی کی علامت بن جاتی ہے۔

موت کی تشویش اور اِس سے مربوط احساسات

ساری زندگی کے دوران موت کی جانب رجحانات بیان کرنے کے لیے سب سے زیادہ خوف اور تشویش (Anxiety) کی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ تحقیقات کرتے وقت فرض کر لیا جاتا ہے کہ موت ہمہ گیر طور پر تشویش پیدا کرتی ہے۔ جہاں واضح خوف موجود نہ ہو تو دفاعی استرداد کا نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔ موت کے شعوری خوف کو صرف تب وقوع پذیر خیال کرتے ہیں جب فرد کے دفاعی حربے شدید ناکامی سے دوچار ہوں، جیسا کہ سنگین سائیکو پیتھالوجی میں ہوتا ہے۔

Janet Belsky نے ''موت کی تشویش'' کو یوں بیان کیا: ''زندگی کے اُس حتمی واقعے کے بارے میں سوچیں، خوف اور جذبات جس کا تجربہ ہم زندگی کے زیادہ نارمل حالات میں کرتے ہیں۔'' بہ الفاظِ دیگر، لوگ اپنی روز مرہ زندگیوں میں موت کے حوالے سے مختلف درجوں کی تشویش محسوس کرتے ہیں۔

موت کے حوالے سے تشویش کو ناپنے کے لیے ماہرین نفسیات نے جن مختلف عوامل کا مطالعہ کیا اُن میں مندرجہ ذیل شامل ہیں: بڑھاپا، ماحول، مذہبی عقیدہ اور انا یا اپنی وقعت یا تکمیل کا احساس۔ موت کی تشویش کا مطالعہ کرنے کا ایک پیچیدہ پہلو یہ ہے کہ ان ویری ایبلز کے حوالے سے تشویش کی 'پیمائش' کرنا بہت مشکل ثابت ہوا۔ موت کی تشویش کا تجزیہ کرنے میں استعمال کی گئی تحقیقات نے نتائج کو مربوط عوامل تک ہی محدود رکھا۔ ایک مزید پریشان کن عامل 'موت' اور 'مرنے' کے درمیان فرق ہے۔ یوں کہہ لیں کہ بذاتِ خود موت یا پھر مرنے کے عمل کے ساتھ زیادہ تشویش منسلک ہے۔ ان چیلنجوں کے باوجود متعدد محققین نے موت کی تشویش پر اوپر مذکور ویری ایبلز کے اثر کے حوالے سے نتیجہ خیز تحقیقات پیش کی ہیں۔

Fortner & Neimeyer نے 1999ء میں موت کی تشویش اور بڑھاپے، انا، جنس، جسمانی و نفسیاتی مسائل اور مذہبی پن کے درمیان تعلق کے حوالے سے 49 مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحقیقاتی مطالعات کا خلاصہ تیار کیا اور رپورٹ دی کہ کم تر انا، زیادہ جسمانی مسائل اور زیادہ نفسیاتی مسائل بوڑھے لوگوں میں موت کی تشویش کی سطح کو بڑھانے پر مائل ہوتے ہیں۔ Tang et al نے 2002ء میں چینی کالج طلبا کے درمیان موت کی تشویش پر تحقیق کے بعد رپورٹ پیش کی کہ بالغ طلبا کی نسبت نوجوان طلبا، اور لڑکوں کی نسبت لڑکیاں موت کے متعلق زیادہ تشویش کا شکار ہوتی ہیں۔ موت کی جانب بوڑھے چینیوں کے جذباتی ردِعمل کا مطالعہ کرنے والے We et al کی رپورٹ کے مطابق موت کی تشویش اور بڑھاپے کے درمیان ایک منفی ربط باہم کی بلند سطح ملتی ہے۔ Rasmussen اور Brems کی رائے میں عمر کی نسبت نفسیاتی-سماجی پختگی موت کی تشویش کی پیش گوئی زیادہ بہتر طور پر کرتی ہے، اور نفسیاتی-سماجی پختگی اور عمر بڑھنے پر موت کی تشویش گھٹتی جاتی ہے۔ سہیل اور اکرم (2002ء) نے بھی یہی نتیجہ پیش کیا کہ عورتیں اور کم مذہبی لوگ زیادہ تشویش کا تجربہ کرتے ہیں۔

جنس اور موت کی تشویش:

عورتوں میں موت کے حوالے سے زیادہ تشویش پائی گئی اور وہ زندگی کو لاحق خطرے والے حالات سے دوچار لوگوں کی ضرورتوں کے متعلق زیادہ حساس ہوتی ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ لڑکیوں میں اس قسم کے جذبات کے اظہار کو اُبھارا اور لڑکوں میں دبایا جاتا ہے۔

عمر اور موت کی تشویش:

دستیاب ڈیٹا اس مفروضے کی حمایت نہیں کرتا کہ بوڑھے ہونے کے ساتھ ساتھ ہمیں موت کے بارے میں زیادہ تشویش ہونے لگتی ہے۔ اس کی دو بڑی وجوہ بیان کی گئی ہیں: اول، عمر اور بالغ پن میں اضافہ کے ساتھ درجہ بدرجہ قبولیت؛ دوم، کچھ بوڑھوں کے لیے زندگی کا خوف موت کے خوف سے بڑھ کر ہو سکتا ہے۔ متعدد بوڑھے لوگ سماجی علیحدگی، مالی پریشانی اور عمر سے متعلقہ جسمانی مسائل محسوس کرتے ہیں جو زندگی سے اُن کا دل اور بھی زیادہ اُچاٹ کر دیتے ہیں۔

مذہبی عقیدے کا کردار:

بالعموم مذہبی عقیدے اور موت کی تشویش کے درمیان کوئی واضح طرزِ تعلق دریافت نہیں ہوا۔ یہ مختلف عوامل کے ساتھ باہمی عمل کرتا ہے: مخصوص مذہب، ثقافتی تاریخ، انفرادی تاریخ اور صورت حال۔ مذہبی عقیدے، ایمان اور اور حیات بعد الموت پر یقین موت کے واضح امکان سے دوچار لوگوں کے مددگار معلوم ہوتے ہیں، لیکن وہ اب بھی دوسروں پر اپنی موت کے اثرات کے متعلق پریشان رہتے ہیں۔ بہت سے لوگ اُس وقت محفوظ محسوس کرتے ہیں جب اُنہیں یقین ہو کہ اُن کی موت کے بعد موزوں مذہبی رسوم ادا کی جائیں گی۔

موت کی تشویش کی تھیوریز

موت اور موت سے متعلقہ مظاہر کے مطالعہ نے محققین کو کافی عرصہ سے مسحور کر رکھا ہے جس کے نتیجے میں لوگ بھی علم الموت میں سائنسی دلچسپی لینے لگے ہیں۔ محققین نے موت کی تشویش اور متعلقہ مظاہر کی وضاحت کرنے کے لیے متعدد تھیوریز پیش کی ہیں۔ کچھ اہم تھیوریز اور ماڈلز کا ذکر ذیل میں کیا جا رہا ہے۔

فرائیڈ کا جبلتِ موت کا تصور:

فرائیڈ نے جبلتِ حیات کو جبلتِ موت کے پہلو بہ پہلو رکھا اور انہیں بالترتیب ''ایروس'' اور ''تھاناٹوس'' کا نام دیا۔ اگرچہ فرائیڈ جبلتِ موت کی براہِ راست تصدیق کرنے والا کلینکل ڈیٹا مہیا نہ کر سکا، لیکن اُس کے خیال میں لوگوں میں ماضی کے صدماتی طرزِ عمل کو دہرانے کے رجحان کا مظاہرہ کرنے کے ذریعہ اِسے مستنبط کیا جا سکتا ہے۔ اُس نے محسوس کیا کہ نامیاتی اجسام میں غالب قوت جبلتِ موت ہی ہونی چاہیے تھی...... یعنی تمام نامیاتی اجسام ایک غیر جان دار حالت کی جانب واپسی پر مائل ہوتے ہیں۔ یوں کہہ لیں کہ ہر نامیاتی جسم اندرونی تناؤ کو زائل کرنا چاہتا اور حالتِ سکون کا متلاشی ہوتا ہے۔

ٹیرر مینجمنٹ تھیوری:

Terror مینجمنٹ تھیوری کی بنیاد وجودیت پر ہے جو وضاحت کرتی ہے کہ کس طرح ہماری تمام کارروائیوں اور کارکردگیوں کی تہہ میں موت کا خوف کارفرما ہوتا ہے۔ گرین برگ کی پیش کردہ یہ تھیوری اُن نفسیاتی ذرائع پر توجہ مرکوز کرتی ہے جن کی مدد سے ہم موت کی آگہی سے پیدا ہونے والی تشویش سے بچتے ہیں۔ اِس میں فرض کیا گیا کہ موت سے متعلقہ تشویش ہماری تمام ذہنی پریشانی کا سب سے بڑا ماخذ ہے۔ دیگر انواع کی طرح انسان خود کو محفوظ رکھنے کی ایک بنیادی تحریک رکھتا ہے۔ اِس تحریک کو مرنے کے احساس کے ساتھ ملا کر ہم اپنے اندر موت کا ایک مفلوج کر دینے والا خوف تخلیق کرتے ہیں۔ اس پریشانی سے بچنے خاطر ہم ثقافت تخلیق کرتے اور اُس میں حصہ لیتے ہیں۔ ثقافت میں شرکت کرنے کے ذریعہ ہم اپنی زندگیوں کو نظم، ساخت، مفہوم اور حتیٰ کہ دوام بھی بخشنے کے قابل بنتے ہیں۔

گرین برگ نے دکھایا کہ لوگ موت کی سوچوں کے خلاف دو قسم کی دفاعی حکمتِ عملی اختیار کرتے ہیں۔ ایک حکمتِ عملی قلیل المیعاد اور دوسری طویل المیعاد ہے۔ اِن دونوں کو مختلف حالات کے تحت استعمال کیا جاتا ہے۔ جب اپنا فانی پن واضح ہو جائے اور موت سے متعلقہ سوچیں براہِ راست شعوری آگہی میں رہنے لگیں تو لوگ خود کو موت کی زد پذیری سے مبرّیٰ قرار دیتے اور یوں اُن سوچوں کو دباتے ہیں۔ زد پذیری سے یہ انکار قلیل المدت دفاع کے طور پر کام کرتا ہے۔ جن

لوگوں کا فانی پن واضح تو ہو گیا ہو لیکن موت سے متعلقہ سوچیں فوری شعوری آگہی میں موجود نہ ہوں وہ طویل المدت دفاعی حربے اختیار کرتے ہیں۔ یہ حربے ثقافتی نظریۂ دنیا کی توثیق کرنے پر مشتمل ہیں۔ ثقافتی نظریۂ دنیا کے موت سے انکار کے فنکشن کی وجہ سے ایک مختلف نظریۂ دنیا کے ساتھ روبروئی ہمارے اپنے اعتقادات اور اُن کی فراہم کردہ مدافعت کے کارآمد پن کے لیے خطرہ بن جاتی ہے۔ نتیجتاً ہم باعث خطر نظریۂ دنیا کو مسترد اور اپنے اعتقادات کا دفاع کرنے پر مائل ہوتے ہیں۔ موت کے خوف کی دفاعی مینجمنٹ غالباً دو نفسیاتی حربوں سے حاصل ہوتی ہے۔ پہلا حربہ اپنے ثقافتی نظریۂ دنیا کی توثیق کی کوششوں پر مشتمل ہے۔ دوسرے حربے میں ثقافت کے تجویز کردہ معیار ہائے قدر کے مطابق زندگی گزارنا شامل ہے۔

حال ہی میں Mikulincer اور Florian نے دعویٰ کیا ہے کہ قریبی تعلقات بھی موت کے خوف کی مدافعت کر سکتے ہیں۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ Bowlby کی لگاؤ (اٹیچمنٹ) کی تھیوری کے مطابق بھی دوسروں کی قربت باعثِ پریشانی واقعات کے پیدا کردہ کھنچاؤ سے نمٹنے میں مدد دیتی ہے۔

موت کی تشویش سے نمٹنے کا انداز ہماری زندگیوں کے ہر پہلو پر نہایت گہرے اثرات...... مثبت یا منفی...... مرتب کر سکتا ہے۔ اِس ماڈل کے مطابق موت کی تشویش سے نمٹنے کے عمل میں meaning مینجمنٹ terror مینجمنٹ کی نسبت زیادہ بہتر طور پر مطابقت اختیار کر سکتی ہے۔ موت زندگی کی واحد قطعیت ہے۔ تمام زندہ اجسام مرتے ہیں؛ اِس سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں۔ تاہم، صرف انسان ہی اپنے ناگزیر فانی پن سے آگاہ ہونے کی ادراکی استعداد رکھتے اور بعد کے حالات سے خوف کھاتے ہیں۔ نیز، زندگی اور موت کے مفہوم پر غور کرنے کی صلاحیت اُن کے لیے اضافی وجودیاتی تشویش پیدا کرتی ہے۔

Goodman کے مطابق ''موت اور معدومیت کے خوف پر فتح پانا سب سے مشکل کام ہے۔ بیش تر دفاعی ڈھانچے...... مثلاً حقیقت سے انکار، استدلالیت، مذہبی سہارے...... موت کے خوف کے خلاف فوراً ہی تحفظاتی ڈھال نہیں بن جاتے۔''

لوگ نیستی کے خوف سے نمٹنے کے لیے مختلف قسم کی علامتی لافانیت میں پناہ لیتے اور فرض کرتے ہیں کہ آپ اولاد کے ذریعہ ہمیشہ زندہ رہ سکتے ہیں؛ وہ حیات بعد الموت اور روح کی بقاً

میں یقین رکھتے ہیں؛ اپنے کام کے ذریعہ زندہ رہنا ممکن ہے؛ فطرت کے توسط سے وجود جاری رہتا ہے اور کسی رواج یا روایت کے ساتھ شناخت اختیار کرنے کے ذریعہ دوام ممکن ہے۔۔۔۔۔۔ یہ بالترتیب حیاتیاتی، مذہبی و روحانی، تخلیقی، فطری اور ثقافتی مفروضے ہیں۔

موت کی قبولیت کا مطلب خود کو سابقہ قابلِ قدر واقعات اور چیزوں سے بے تعلق کر لینا ہے۔ Meaning مینجمنٹ ماڈل زور دیتا ہے کہ انسان مفہوم کی ایک خلقی ضرورت کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں، لیکن یہ مفہوم زندگی کی مصروفیات کے باعث خوابیدہ رہتا ہے، اور موت و دکھ ہمارے اندر مفہوم کی تلاش کی فوری ضرورت بیدار کرتے ہیں۔ ہم ہر ایک صورت حال میں مفہوم دریافت اور تخلیق کر سکتے ہیں، حتیٰ کہ موت کا سامنا ہونے پر بھی۔

مفہوم کی تلاش ہمارے عقیدے اور روحانیت کو مزید گہرا کرتی اور زندگی کے مفہوم و مقصد کی ایک بہتر تفہیم حاصل کرنے میں مدد بھی دیتی ہے۔ اس طرح ایک مفید نفسیاتی اور روحانی ماڈل تعمیر ہوتا ہے جو موت اور مرنے کے خوف کے خلاف بہترین تحفظ پیش کرتا ہے۔ یہ ہمیں زندگی سے بغل گیر ہونے کی تحریک دلاتا ہے۔۔۔۔۔ کاروبارِ زندگی میں مصروفیت، چاہے ہماری جسمانی حالت اور موجودہ صورت حال کچھ بھی ہوں؛ یہ محض استدلالیت یا ادراکی تشکیل تو نہیں، بلکہ اقدار، اعتقادات اور نظام ہائے مفہوم کی قلب ماہیت ہے۔ یہ زور دیتا ہے کہ ہمارا اندازِ حیات مرنے کے انداز کو چھپا لے۔ موت کو قبول کرنے اور اس کا مکمل مفہوم سمجھنے کے ذریعہ ہم دانش حاصل کرتے ہیں۔ عقیدے کے ذریعہ موت کو قبول کرنے پر ہمیں حوصلہ اور ایک پائیدار اُمید حاصل ہوتی ہے۔

موت کی تشویش کی تھیوریز کا جائزہ

تحلیلی نفسیاتی تھیوری نے مشاہدے اور غور و فکر کے لیے ایک مفید رہنما کا کردار ادا کیا ہے۔ اس کا بنیادی نقص قابلِ توثیق نہ ہونا ہے۔

وجودیاتی تھیوری کے مطابق موت کی قبولیت بلوغت کی علامت ہے، لیکن یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت کی بجائے محض ایک پر کشش فلسفیانہ قضیہ ہے۔

Terror اور Meaning مینجمنٹ کی تھیوریز کا قضیہ پر کشش لگتا ہے اور مقصدیت کا احساس ہماری زندگی کو موت کی تشویش سے تحفظ دیتا ہے، لیکن اِن نئی تھیوریز کو قبول کرنے سے قبل موزوں توثیق لازمی ہے۔

موت اور مرنے کے مراحل

''مرنا'' ایک عمل ہے اور اس کا اختتامی نقطہ ''موت'' ہے۔ اس لحاظ سے مرنا زندگی کا ایک اختتامی حصہ ہے۔ زندگی کے اس مخصوص حصے میں ہمارے جوابی ردِعمل موت کے ساتھ سابقہ تجربات کے علاوہ ثقافتی رویوں اور اعتقادات کے ذریعہ بھی متشکل ہوتے ہیں۔ ایلزبتھ کُبلر راس نے اپنی کتاب ''Death and Dying'' میں اُن پانچ مراحل کا ذکر کیا ہے جو موت کے عمل میں مبتلا لوگوں کو پیش آتے ہیں۔۔۔۔ اپنی موت سے آگاہی ہونے کے لمحے سے لے کر حقیقی موت تک۔

1۔ استرداد (Denial):

جب کسی کو اُس کی موت کا عمل شروع ہونے کے متعلق بتایا جائے تو ابتداً میں اُسے شدید دھچکا لگتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ مریض ڈاکٹر کی تشخیص کو ہی مسترد کر دے اور خود کو بالکل ٹھیک قرار دے۔ کچھ مریض اس مرحلے سے آگے کبھی نہیں بڑھ پاتے، اور وہ ایک سے دوسرے ڈاکٹر کے پاس جاتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ اُنہیں اپنی مرضی کی رائے دینے والا کوئی ڈاکٹر مل جاتا ہے۔

2۔ غصہ (Anger):

مریض اپنی بیماری پر مشتعل ہوتے اور طیش میں آتے ہیں۔ ایک عام ردِعمل ''آخر میں ہی کیوں؟'' ہے۔ وہ خدا، تقدیر، کسی دوست یا خاندان کے کسی فرد پر غصے میں آ سکتے ہیں۔ یہ غصہ ہسپتال کی کسی نرس یا بیماری کی خبر سنانے والے ڈاکٹر پر بھی اُتر سکتا ہے۔

3۔ سودے بازی (Bargaining):

مریض ڈاکٹروں، دوستوں اور حتیٰ کہ خدا کے ساتھ سودے بازی کرنے کی کوشش کرتا ہے، کہ اگر وہ اچھا ہو گیا تو فلاں فلاں وعدہ پورا کرے گا، مثلاً خیرات اور صدقہ دینا یا خدا کی عبادت میں زیادہ پر جوش ہو جانا۔

4۔ ڈپریشن (Depression):

مریض ڈپریشن کی کلینکل علامات ظاہر کرتا ہے...... علیحدگی، گم صم رہنا، نیند کے مسائل، ناامیدی اور خودکشی کرنے کے خیالات۔ یہ ڈپریشن زندگی پر بیماری کے اثرات کے خلاف ایک ری ایکشن یا پھر قریب آتی ہوئی موت سے بچنے کا حیلہ ہوسکتا ہے۔

5- قبولیت (Acceptance):

مریض محسوس کرتا ہے کہ موت ناگزیر ہے، اور اس تجربے کی ہمہ گیریت کو قبول کر لیتا ہے۔ مثالی حالات میں مریض ہمت و حوصلہ کا مظاہرہ کرتا اور اپنی موت کے متعلق گفتگو کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ طاقت ور مذہبی عقائد اور حیات بعد الموت پر یقین کے حامل لوگ تشفی پا سکتے ہیں۔

یہ پانچ مراحل سبھی پہلوؤں کا احاطہ نہیں کرتے۔ ہر کوئی ان مراحل سے نہیں گزرتا؛ شاید معدودے چند لوگ ہی قبولیت کی منزل تک پہنچیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ مریض ایک ہی انٹرویو میں پانچوں پہلوؤں کا مظاہرہ کرے یا پھر کبھی ایک اور کبھی دوسرے پہلو کا۔ نیز، مریض دیگر حربے بھی استعمال کرنے کے قابل ہوتا ہے...... مثلاً دہشت، مزاح یا دردمندی۔

موت کی یقینی علامات اور پریشانیاں

موت کے بالکل درست وقت کی نشان دہی کرنا عموماً مشکل ہوتا ہے۔ مرنے کے عمل کی آخری ساعتیں یا دن مریض، اہل خانہ اور ڈاکٹر کے لیے نہایت مشکل ہوسکتے ہیں۔ خوش قسمتی سے مریضوں کی ایک وسیع اکثریت کے لیے آخری گھنٹے یا دن کوما کی حالت میں بسر ہوتے ہیں جو ایک نسبتاً آرام دہ موت لگتی ہے۔ تاہم، کچھ کے لیے آخری مرحلہ بہت خوف ناک عمل بن جاتا ہے۔ مرتے ہوئے مریض کے دکھ کے ذرائع کو تین زمروں میں رکھا جا سکتا ہے۔ جسمانی علامات، نفسیاتی علامات (ڈپریشن وغیرہ) اور وجودیاتی پریشانی (مثلاً موت کے متعلق تشویش)۔ علالت کی شدت اور نوعیت کی بنیاد پر ہی جسمانی علامات میں تکلیف، تھکن، متلی، پیشاب کے مسائل، کھانا نگلنے میں مشکل، سانس کا دھیماپن، منہ کا خشک ہونا، ذائقہ کی تبدیلی اور بخار وغیرہ شامل ہیں۔ نفسیاتی علامات اور وجودیاتی پریشانی بھی دکھ کی وجوہ ہیں کیونکہ وہ بھی ناخوش گوار تجربہ بن سکتی ہیں۔ بیش تر مریض زندگی کے اختتام پر نفسیاتی مسائل کی علامات ظاہر کرنے لگتے ہیں، مثلاً تشویش (Anxiety)، ڈپریشن وغیرہ۔

موت کا کرب:

اکثر موت قریب آنے پر کچھ مخصوص علامات ظاہر ہوتی ہیں۔ سانس لینے کے عمل میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ سست اور تیز سانسیں یا طویل وقفے عام ہیں۔ سانس کے ساتھ کراہنے کی آواز بھی آتی ہے، لیکن اس کا مطلب لازمی طور پر یہ نہیں کہ مریض یا موت گرفتہ شخص تکلیف میں ہے۔ گلے میں رطوبتیں جاری ہونے کے باعث سانس کی آواز پرشور ہوسکتی ہے، کبھی کبھی اسے ''موت کی کھڑکھڑاہٹ'' کہا جاتا ہے۔ مریض کا پہلو بدلنے یا ادویات کی مدد سے رطوبتوں کو سکھانے کے ذریعہ شور کو کم کیا جا سکتا ہے۔ سانس لینے کا عمل کئی گھنٹے تک جاری رہنا ممکن ہے۔ موت کے وقت چند پٹھے سکڑ کر چھاتی کو اس طرح اوپر نیچے کر سکتے ہیں کہ جیسے سانس لیا جا رہا ہو۔ ممکن ہے کہ سانس رکنے کے کئی منٹ بعد تک دل دھڑکتا رہے۔ اس کے علاوہ ٹانگیں ٹھنڈی اور شاید نیلاہٹ مائل بھی ہو جاتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں آکسیجن کی کمی اور جسم میں خون کی گردش گھٹنے کا نتیجہ ہیں۔ مریض کو اپنے پاخانے اور/یا پیشاب پر اختیار نہیں رہتا۔

موت کی تشویش سے نمٹنا

بنی نوع انسان خود کو باقی رکھنے کی ایک بنیادی تحریک رکھتے ہیں۔ اس تحریک کو موت کے ناگزیر ہونے کے احساس کے ساتھ ملانے سے وہ موت کا ایک مفلوج کر دینے والا خوف پیدا کرتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر سارا انسانی ڈرامہ کافی حد تک موت کے خوف کے ساتھ انسان کی جدوجہد کی کہانی ہے۔ مختلف قسم کی شعوری کوششوں اور لاشعوری دفاعی حربوں کے ذریعہ موت کی تشویش پر غلبہ پانا اس کھیل کا حصہ ہے۔ ان تمام عوامل کو مدنظر رکھتے ہوئے لوگوں کو موت کی تشویش سے نمٹنے میں ایسے طریقے سے مدد دینا لازمی ہو جاتا ہے کہ جو نشوونما کو بڑھائے۔ ذیل میں اس مقصد کے تحت استعمال کیے جانے والے نہایت عام طریقے دیے جا رہے ہیں۔

مذہبیت/روحانیت کا کردار:

موت سے دوچار بہت سے لوگوں کے لیے مذہب ہمت اور قوت کا اولین سرچشمہ ہے۔

مختلف مذہبی تھیوریز مختلف پہلوؤں سے موت کی ناگزیریت اور حتیٰ کہ ضرورت کی بھی وضاحت کرتی ہیں۔ 'گیتا' کے مطابق: ''روح یا آتما لافانی ہے، جسم کے مرنے سے روح نہیں مرجاتی، لہٰذا موت پر دکھی نہیں ہونا چاہیے۔ جسم کو موت آنے پر آتمائیں نئے جسم میں داخل ہو جاتی ہے جیسے آپ کپڑے بدل لیتے ہیں۔ بائبل میں بھی یہی تصور ملتا ہے۔ ''مکاشفہ'' میں کہا گیا ہے: ''مبارک ہیں وہ مردے جو اَب سے خداوند میں مرتے ہیں۔ روح فرماتا ہے بے شک! کیونکہ وہ اپنی محنتوں سے آرام پائیں گے، اور اُن کے اعمال اُن کے ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔'' (14ب،13) بائبل کی اس آیت میں مسیحی تصورِ موت واضح طور پر ملتا ہے، کہ موت کے بات کوئی زندگی موجود نہیں: آپ کو موت کی خوشی ایک ایسے واقعہ کے طور پر منانی چاہیے جس کے بعد آپ خدا کی بادشاہت میں داخل ہوتے ہیں۔

موت کی تشویش سے نمٹنے اور فلاح کا احساس بڑھنے میں مذہبیت اور روحانیت نے کافی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ الوراڈو ایت اَیل کے مطابق موت کے متعلق کم تشویش کے حامل لوگوں کا عزم زیادہ مضبوط اور حیات بعدالموت میں یقین زیادہ راسخ ہوتا ہے۔

وجودیاتی نفسیاتی علاج:

زندگی جتنی زیادہ تسکین بخش ہوگی موت کی تشویش بھی اُسی قدر زیادہ ہوگی۔ جب کوئی فرد معتبر انداز میں زندگی گزار رہا ہو تو موت کی تشویش اور خوف گھٹ جاتا ہے۔ وجودیاتی نفسیاتی علاج کا مطمحِ نظر کسی شخص کو معتبر طور پر زندگی بسر کرنے کے قابل بنانا ہے۔

دیگر انواع کے مقابلہ میں انسان غالباً ایک انوکھی حیثیت رکھتے ہیں، کیونکہ وہ مستقبل کی جانب دیکھتے اور آئندہ کے کچھ پہلوؤں کا پیشگی اندازہ کر سکتے ہیں۔ یقیناً مستقبل میں ہم سب کو مرنا ہے۔ موت کی قبولیت نفسیاتی علاج میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس قبولیت کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کا نتیجہ تشویش کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ لوگ اس عمل میں دکھ اور مایوسی سے بھی دوچار ہو سکتے ہیں۔ البتہ انسان کی ایک امتیازی خوبی زندگی میں وقعت اور مقصد کا احساس ڈھونڈنے کے لیے جدوجہد کرنا ہے۔

وجودیت موت کو منفی انداز میں نہیں لیتی بلکہ اس کا کہنا ہے کہ موت کو بنیادی انسانی حالت

مان لینا ہماری زندگی کو باوقعت بناتا ہے۔ اگر ہم زندگی کو اہم سمجھتے ہیں تو موت کو بھی اہمیت دینا لازمی ہے۔ اگر ہم قطعی موت کی حقیقت کے خلاف مدافعت کرتے رہیں تو زندگی بے جان اور بے معنی بن جاتی ہے۔ لیکن اگر ہم خود کو فانی ہستی مان لیں تو پتا چل جاتا ہے کہ ہمیں اپنے منصوبے مکمل کرنے کے لیے ابدیت میسر نہیں اور جاری لمحہ نہایت اہم ہے۔ اس طرح موت سے آگاہی زندگی اور تخلیقیت کے لیے جوش وجذبہ کا ماخذ بن جاتی ہے۔ Heintz اور Baruss کی تیار کردہ رپورٹ کے مطابق موت کی تشویش اور وجودیاتی فلاح کے درمیان منفی ربط پایا جاتا ہے۔ Kissane et al نے چھاتی کے کینسر میں مبتلا مریضوں کے ساتھ گروپ تھراپی میں موت کی آگہی کے مؤثر پن کا تجزیہ کیا ہے۔ اُن کے خیال میں یہ ٹیکنیک مریضوں کو موت کی تشویش سے نمٹنے میں بہت زیادہ مدد دیتی ہے۔

ڈاکٹر اور ماہرینِ نفسیات

مرنے کا عمل نہ صرف مریض بلکہ ڈاکٹر میں بھی شدید جذباتی مسائل کا باعث بن سکتا ہے۔ شاید طبیب اپنی تعلیم اور مخصوص تربیت کے باعث لاچاری محسوس کرنے سے خوف زدہ ہوتے ہیں اور اپنی مایوسی مریضوں میں بھی منتقل کر سکتے ہیں۔ پاس کھڑے ہو کر کسی شخص کو آہستہ آہستہ موت کی وادی میں سرکتے ہوئے دیکھنے پر پیدا ہونے والے احساسات کی مدافعت کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ کچھ ڈاکٹر اپنی پریشانی اور بے چینی ظاہر کرنے کے لیے لاحاصل علاج ہی جاری رکھتے یا خود کو علاج کے عمل سے بالکل بے تعلق کر لیتے ہیں۔

ماہرینِ نفسیات موت گرفتہ شخص کی دیکھ بھال میں کافی مدد دے سکتے ہیں، لیکن موجودہ صورتِ حال غیر تسلی بخش ہے۔ امیریکن سائیکالوجیکل ایسوی ایشن کے مطابق اختتامی مراحل میں وہ ہمیشہ ہی منظر سے غائب ہو جاتے ہیں۔ دراصل قبول شدہ پالیسیوں اور حقیقی طور طریقوں کے درمیان فرق ہے۔ حالات ہرگز آئیڈیل نہیں...... بہت سے مریض موت کے لیے تیار نہیں ہوتے، بہت سے مریضوں کو لاعلاج چھوڑ دیا جاتا ہے، بہت سے مریض اپنے بارے میں کیے جانے والے فیصلوں میں شریک نہیں ہوتے، بہت سے مریض ہسپتالوں میں ناکافی سہولیات کے باعث دم توڑ جاتے ہیں، بہت سے خاندان کسی بیمار رشتہ دار کی دیکھ بھال کے بوجھ تلے پس کر رہ

جاتے ہیں۔ ان تمام مسائل پر قابو پانے کے لیے ہمیں موت کے متعلق گفتگو پر لاگو کردہ امتناع کو ختم کرنا ہوگا۔

حاصلِ بحث

موت اب بھی ایک نامعلوم مظہر ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ زندگی کی واحد قطعی حقیقت ہے۔ تمام زندہ اجسام مرتے ہیں، کوئی بھی اِس انجام سے مستثنیٰ نہیں۔ تاہم، اپنی ناگزیر فنا سے آگاہ ہونے کی ادراکی صلاحیت کا بوجھ صرف اور صرف انسانوں کے کندھوں پر ہے، بلکہ وہ اس سے بعد کے حالات پر بھی غور وفکر کرتے اور پریشان ہوتے ہیں۔ اس روشن خیال دور میں بھی انسان موت سے خوف کھاتا ہے۔ موت کی جانب ہمارا زیادہ تر ردِعمل گریز پر مشتمل ہے۔ کسی محفل میں موت کے متعلق گفتگو بے چینی پیدا کرتی ہے۔ ساری زندگی کے دوران ہم موت کے خیال سے پریشانی اور تشویش کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بنی نوع انسان خود کو محفوظ اور باقی رکھنے کی ایک بنیادی اُمنگ کے حامل ہیں۔ اِس اُمنگ کو موت کے ناگزیر پن کے ساتھ ملانے پر ایک مفلوج کردینے والا خوف جنم لیتا ہے۔ لیکن اگر لوگ خود کو فانی مان لیں تو اُنہیں زندگی کی وقعت کا احساس ہوجائے گا اور موت ایک ثانوی مسئلہ بن جائے گی۔

ایس ایچ نظامی
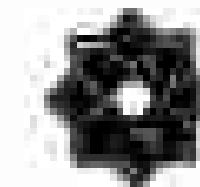
4

موت سے عین پہلے کے تجربات

ذیل میں Jean Ritchie کی شان دار کتاب ''Death's Door'' کا خلاصہ اور اقتباسات دیے جارہے ہیں۔ مصنفہ نے موت سے عین پہلے کے تجربات کی وضاحت کرنے والی مختلف تھیوریز بیان کی ہیں۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ اگرچہ دماغ میں مرنے کے میکنزم کو شمار کیا جاسکتا ہے، لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوجاتا کہ قریب الموت تجربات محض دماغ کے پیدا کردہ اوہام ہیں جو دماغ کی دائمی موت واقع ہونے پر ختم ہوجاتے ہیں۔ سائنس اِسے ثابت کرنے کے قابل نہیں کیونکہ جسم سے الگ ہونے پر بھی شعور کی موجودگی کے کافی ثبوت اکٹھے کیے گئے ہیں۔ اسی طرح سائنس یہ بھی ثابت نہیں کرسکتی ہے شعور موت کے بعد بھی قائم رہتا ہے؛ تاہم، اِس وقت تحقیق کی جارہی ہے جو شاید جسم سے باہر شعور کے وجود کا ثبوت فراہم کرسکے گی۔ مجھ جیسے بہت سے لوگوں کو یقین ہے کہ آج نہیں تو کل ایسا ہو ہی جائے گا۔ قریب الموت تجربات پر تحقیق کرنے والوں کو کچھ بھی ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ حالات کی شہادت اُن کے حق میں جاتی ہے۔ سائنس کو یہ ثابت کرنے کے لیے طویل محنت اور وضاحت کرنے کی ضرورت ہے کہ موت کے بعد شعور زندہ نہیں رہتا۔

ایک حالیہ تھیوری کے مطابق شعور کا مآخذ سر میں نہیں ہے۔ شعور ایک ٹیلی ویژن سگنل کی مانند ہے جو ہوا کی لہروں میں موجود رہتا اور ٹیلی ویژن سیٹ یعنی دماغ اِسے وصول کرکے سکرین

(دماغی کیمیا) پر ایک ٹیلی ویژن پروگرام (قریب المرگ تجربہ) پیش کرتا ہے۔ اس تمثیل کو استعمال کرتے ہوئے موجودہ سائنسی تھیوریز کا دعویٰ ہے کہ قریب المرگ تجربہ ٹیلی ویژن سیٹ کی پیداوار ہے۔ کچھ سائنسی دعووں کے مطابق موت شعور کا اختتام ہے...... جیسے ٹیلی ویژن سیٹ بند کر دینے سے ہوائی امواج میں موجود ٹیلی ویژن سگنل بند ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ بیان غلط ہے۔ ٹیلی ویژن سیٹ بند کر دینے کا مطلب یہ نہیں کہ ہوا کی امواج میں موجود ٹیلی ویژن سگنل بھی متاثر ہوتا ہے۔ شعور پر تحقیق کرنے والے کچھ چوٹی کے ماہرین کے خیال میں یہ تمثیل بالکل درست ہے، یعنی شعور ہوا کی موجوں میں پائے جانے والے ٹیلی ویژن سگنلز جیسا ہے اور موت آنے پر شعور ختم نہیں ہو جاتا۔ ٹیلی ویژن بند ہونے سے سگنل پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

قریب المرگ تجربے کے حوالے سے مندرجہ ذیل سائنسی تھیوریز پیش کی گئی ہیں:

(1)-موت گرفتہ دماغ کی تھیوری۔ (2)-چارلس ڈارون کی تھیوری۔
(3)-خبطی حالت کی تھیوری۔ (4)-کنپٹی کے اُبھار کی تھیوری۔
(5)-آکسیجن کی کمی کی تھیوری۔ (6)-شخصیت کو ختم کرنے کی تھیوری۔
(7)-پیدائشی حافظے کی تھیوری۔ (8)-حیات بعد الموت کی تھیوری۔

(1)-موت گرفتہ دماغ کی تھیوری:

یہ تھیوری ڈاکٹر سوسن بلیک مور نے اپنی کتاب "Dying To Live" کے ذریعہ مقبول بنائی۔ حیات بعد الموت اس کی ایک سب سے طاقت ور دلیل اور قریب الموت تجربات کو حقیقی ماننا اس تھیوری کی سب سے بڑی کمزوری ہیں۔ قریب الموت تجربات سے گزرنے والے لوگوں کا ایک ہی روشنی کی جانب بڑھنا، راستے میں ایک ہی جیسے مراحل سے گزرنا اس سارے معاملے کو حیات بعد الموت کی جانب ایک عمیق روحانی سفر بناتا ہے۔ لیکن عین یہی دلیل قریب الموت تجربات کو حقیقی تجربات اور روحانی سفر نہ ماننے کی دلیل کا ایک بنیادی جز ہے۔ اس دلیل کے مطابق یہ محض مرتے ہوئے دماغ کی کارگزاری ہے۔ تشکیک پسند کہتے ہیں کہ دنیا بھر کے دماغ ایک ہی انداز میں مرتے ہیں۔ اسی لیے تمام قریب الموت تجربات ایک ہی جیسے اساسی عناصر رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ موت گرفتہ شخص کا کسی خوب صورت اگلی زندگی کی جانب سفر کرنا نہیں، بلکہ یہ ہے کہ دماغ میں نیوروٹرانسمٹرز بجھنے لگتے ہیں اور تمام قریب الموت افراد کے لیے ایک جیسے دلکش دسوسے تخلیق

کرتے ہیں۔

لیکن کیوں؟ مرتا ہوا دماغ یہ سب کیوں کرتا ہے، اگر یہ محض خلیوں کا ایک نہایت پیچیدہ گومڑ ہی ہے؟ یہ سوال ساری انسانی فکر میں نہایت بنیادی سوالات میں سے ایک ہے۔ یہ مزید سوالات کو مہمیز دیتا ہے۔ کیا ہم اپنے ساتھ مخصوص "شخصیتوں" اور "روحوں" اور ذہنوں والے افراد ہیں؟ یا کیا ہم محض جسم ہیں جنہیں نہایت ہوشیار اور مستعد کمپیوٹرز یا دماغ کنٹرول کرتے ہیں؟ اور ہر کمپیوٹر کے کام کرنے کا انداز دوسرے سے تھوڑا بہت مختلف ہے جس کی وجہ سے ہم سب ایک دوسرے سے ممیّز ہیں...... بالکل اُسی طرح جیسے ایپل کمپیوٹر آئی بی ایم کمپیوٹر سے مختلف ہے، حالانکہ اُن کے درمیان اختلافات کی نسبت مشابہتیں کہیں زیادہ ہیں؟

سائنس دان اور محققین اختلاف رائے کا شکار ہیں۔ اُن میں سے کچھ چاہتے ہیں کہ قریب الموت تجربات کو محض دماغی ری ایکشنز کا ایک سلسلہ ہی قرار دیا جائے۔ قریب الموت تجربات کے حقیقی پن اور واقعیت کو قبول کرنے والا دھڑا اسے سائنسی پس منظر دینے پر بہت خوش ہے۔ بہ الفاظِ دیگر وہ تجربے پر جوشیلے انداز میں تحقیق کرنے سے خوف زدہ نہیں، بلکہ تمام ممکنہ جواب تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ بڑی خوشی سے اس سائنسی پہلو کے ساتھ اُن لوگوں کی فراہم کردہ ایک عمیق ذاتی، زندگی کو فروغ دینے والی شہادت بھی رکھ سکتے ہیں جو واقعی اس مرحلے سے گزرے۔

معدودے چند لوگ ہی اس بات سے انکار کریں گے کہ لوگوں کو قریب الموت تجربات ہوتے ہیں، اور یہ کہ وہ اُن پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں...... کیونکہ بہت سے لوگوں نے اپنے ساتھ پیش آنے والے حالات بیان کیے ہیں۔ اصل جھگڑا یہ ہے کہ قریب الموت تجربات کا محرک اور مطلب کیا ہے۔ تحقیق کے دو مرکزی رجحانات ہیں: ایک نے نفسیاتی نہج اختیار کی اور انسانی طرزِ عمل کی وجوہ تلاش کرنے پر توجہ دیتا ہے۔ دوسرا نکتۂ نظر دوٹوک انداز میں فزیالوجیکل نوعیت کا ہے جو قریب الموت تجربہ پیدا کرنے والے دماغی حصے کی تلاش کرتا ہے۔

قریب الموت تجربے کو محض دماغ کی موت گرفتگی کے عمل کا نتیجہ قرار دینے والی غیر شخصی دلیل ان تجربات سے گزرنے والے لوگوں کی بڑی اکثریت کو قبول نہیں۔ ایک عمیق اور بدل کر رکھ دینے والے تجربے کو محض نیوروٹرانسمٹرز کی ٹمٹماہٹ قرار دینا ایسا ہی ہے جیسے مائیکل اینجلو کے بنائے ہوئے "داؤد" کے مجسمے کو محض چند ٹن سنگ مرمر کہہ کر بیان کیا جائے۔

اگر موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے اور قریب الموت تجربات محض ایک ہیجانی اور موت گرفتہ دماغ کا نتیجہ ہیں تو پھر یہ ساری گڑبڑ کیوں ہوتی ہے؟ اگر روح اور شخصیت سمیت ہر چیز خاک اور راکھ میں ملنے والی ہے تو دماغ مرتے ہوئے لوگوں کے سامنے یہ شاندار اور حیرت انگیز کھیل کیوں پیش کرتا ہے؟ اگر قریب الموت تجربات محض ایک وسوسہ اور واہمہ ہیں تو اتنے بہت سے لوگ ایک ہی جیسے وسوسوں کے متعلق کیسے بتاتے ہیں؟ کیا بہت سے لوگوں کا ایک ہی چیز بیان کرنا عجیب نہیں؟ کیا وہ سب ایک جیسے ردعمل ظاہر کرتے ہیں؟ بہت سے لوگوں کے خیال میں قریب الموت تجربات کو ایک حقیقی بعد از موت تجربہ ماننا کہیں آسان ہے۔

(2) - چارلس ڈارون کی تھیوری:

ایک تھیوری کے مطابق نسل انسانی کا دانستہ منصوبہ پیچھے رہ جانے والوں کو اپنی زندگیوں کے ناگزیر خاتمے کے ساتھ بہتر طور پر ہم آہنگی اختیار کرنے میں مدد دیتا ہے۔ موزوں ترین کی بقا پر مبنی ڈارون کی سادہ سی تھیوری کا کہنا ہے کہ ہر ایک نوع اس سیارے پر اپنا اختیار بڑھانے اور اپنی اولادوں کی بقا کو یقینی بنانے کے لیے کوشاں ہے۔ یہ ہماری سب سے بڑی خواہش ہے۔ دیگر جانور اپنے ساتھیوں کو زندہ رہنے میں مدد دیتے ہیں: مثلاً آخری سانسیں لیتا ہوا ہاتھی کسی جھاڑی کے پیچھے سرک جاتا ہے تاکہ ریوڑ کی رفتار سست کرنے کا باعث نہ بنے۔ کیا موت کے قریب پہنچ چکے لوگ اپنے گلے کی مدد کرنے کی خاطر یہ پراپیگنڈا کر رہے ہیں کہ موت میں کوئی تکلیف دہ بات نہیں؟ لیکن اس تھیوری سے یہ وضاحت نہیں ہوتی کہ قریب الموت تجربات ناقابل پیش گوئی کیوں ہوتے ہیں، یا ہم برسوں تک اس ارتقائی سہولت کو مسترد کرتے ہوئے موت کے متعلق گفتگو سے گریز کیوں کرتے رہتے ہیں۔ آخر ڈارون ازم کی اصطلاح میں انسان کرۂ ارض کے کامل حکم ران ہیں۔

(3) - خبطی حالت کی تھیوری:

دماغی افعال کے ذریعہ قریب المرگ تجربات کی وضاحت کی اُمید رکھنے والے کچھ سائنس دانوں نے رائے دی ہے کہ مرنے کے دوران اینڈورفن نامی ہارمونز خارج ہوتے ہیں جو مرکزی اعصابی نظام پر عمل کرتے اور درد محسوس نہیں ہونے دیتے۔ یہ ایک طرح سے اتھلیٹس کی وہ حالت ہے جب وہ ''تکلیف کی حد'' کو عبور کر جاتے اور پھر نسبتاً آسانی کے ساتھ دوڑنے کے قابل

ہوتے ہیں۔ لیکن اینڈورفن غدود خبط یا التباس پیدا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے اور آخری وقت جیسے تجربات کو دوبارہ پیدا نہیں کر سکتے، لہٰذا وہ مرنے کے عمل میں مسکّن (Painkiller) کے طور پر تو موجود ہوں گے، مگر سارے تجربے کے ذمہ دار نہیں۔

نیوروٹرانسمٹرز پر کی جانے والی تحقیق نہایت دقیق ہے اور دماغ کی کارکردگی کی تفہیم کے حوالے سے ابھی یہ شعبہ بالکل ابتدائی مرحلے پر ہی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ کیٹامین نامی ایک طاقتور اینستھیٹک دوا قریب الموت تجربات جیسے متعدد عناصر پیدا کر سکتی ہے، بالخصوص جسم سے باہر ہونے کا احساس۔ اور ایک تھیوری کے مطابق قریب الموت تجربے کے وقت جسم میں سے کیٹامین نما مرکب خارج ہو سکتا ہے؛ نیز وہ مرکب مخصوص نیوروٹرانسمٹر ریسیپٹرز کے ساتھ مل کر سارے کے سارے قریب الموت تجربے کا ذمہ دار بھی بن سکتا ہے۔ نفسیات کے ایک پروفیسر ڈاکٹر رونالڈ سیگل نے قریب الموت تجربات کی روحانی اور باطنی اہمیت کو مسترد کیا ہے۔ اُس نے لیبارٹری میں رضا کاروں کو LSD دینے کے ذریعہ اسی قسم کے احساسات پیدا کرنے کا دعویٰ کیا۔ لیکن دیگر محققین کا کہنا ہے کہ اگرچہ ادویات کے ذریعہ سے پیدا ہونے والی وجد کی حالتیں قریب الموت تجربات کے ساتھ کچھ مشابہت کی حامل ہو سکتی ہیں، لیکن دونوں ایک ہی چیز نہیں۔ اول الذکر حالتوں میں خوفناک احساسات شامل ہوتے ہیں، جبکہ مؤخر الذکر میں نہیں۔ اول الذکر کیفیت حقیقت کو مسخ کرتی ہے جبکہ مؤخر الذکر یعنی قریب الموت تجربات کو ''بالائے حقیقت'' بیان کیا گیا ہے۔

(4) - کنپٹی کے اُبھار کی تھیوری:

قریب الموت تجربات کے کچھ عناصر کا ایک قسم کی مرگی میں بھی واقع ہونا بتایا جاتا ہے جس کا تعلق دماغ کی کنپٹی کے ابھار (Temporal Lobe) کو نقصان پہنچنے کے ساتھ ہے، اور محققین نے اس اُبھار کو کرنٹ کے ذریعہ تحریک دینے کے ذریعہ جانا ہے کہ اس طرح قریب الموت تجربات کے کچھ عناصر پیدا کیے جا سکتے ہیں، مثلاً خود کو پیچھے چھوڑ دینا، اور زندگی کی یادوں کے جھپاکے۔ اُنہیں یقین ہے کہ موت سے قریب ہونے کا ذہنی دباؤ اس ابھار میں ہیجان پیدا کرتا ہے۔ اس تھیوری کے حوالے سے ایک ثبوت یہ موجود ہے کہ دوروں کے شکار لوگوں کے دماغ کا یہ حصہ متاثر ہوا یا یہاں گلٹیاں بن گئیں۔ لیکن ایک امر اس کے خلاف بھی جاتا ہے: کنپٹی کے اُبھار سے پیدا ہونے والے مخصوص احساسات سکون اور محبت کی بجائے خوف، مایوسی اور تنہائی والے ہیں۔ یاد

رکھنا چاہیے کہ دماغ میں ایک کیمیائی میکنزم موجود ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ قریب الموت تجربات محض کیمیائی تعاملات (ری ایکشنز) ہیں۔ سائنس غالباً مرنے کے عمل کا صرف وہ پہلو بیان کر رہی ہے جس کا تعلق دماغ کے ساتھ ہے۔

(5)- آکسیجن کی کمی کی تھیوری:

دیگر ممکنہ توضیحات دماغ میں آکسیجن کی کمی یا کاربن ڈائی آکسائیڈ کی زیادتی ہیں۔ لیکن اس سے یہ وضاحت نہیں ہوتی کہ کچھ مریض قریب الموت تجربات کے متعلق بھرپور اور مربوط رپورٹس دینے کے قابل کیوں ہو جاتے ہیں۔ کارڈیالوجسٹ مائیکل سیبوم نے ایسے ہی ایک مریض کا ذکر کیا ہے جو قریب الموت تجربے کے دوران ڈاکٹرز کو ایک بلڈ ٹیسٹ انجام دیتے ہوئے دیکھتا رہا۔ قریب الموت تجربات اور آکسیجن کی کمی کے شکار دماغ کی پیدا کردہ وجدانی کیفیات کے درمیان موازنے دکھاتے ہیں کہ مؤخر الذکر منتشر اور نفسیاتی اختلاط سے کافی حد تک مشابہ ہیں۔ کنفیوژن، بے دلی، مایوسی اور خوف اس کے خصوصی اوصاف ہیں، جبکہ قریب الموت تجربات کے اوصاف طمانیت، سکون اور نظم کا احساس ہیں۔ البتہ کچھ عناصر ایک جیسے بھی ہیں: مثلاً بہتری اور طاقت کا احساس۔ لیکن مختلف وقتوں میں ان دونوں کا تجربہ کرنے والے لوگ کہتے ہیں کہ ان کے درمیان ایک فرق واضح ہے۔ وجدانی حالتوں (چاہے اصلی ہوں یا مصنوعی) میں انسان تقریباً ہمیشہ ہی بیدار اور باشعور ہوتے ہیں، جبکہ قریب الموت تجربات مدہوشی کے عالم میں پیش آتے ہیں اور کبھی کبھی انسان موت سے اس قدر قریب پہنچ چکا ہوتا ہے کہ دماغی کی لہروں کو مانیٹر کرنے والی مشین پر دماغی کارکردگی کا کوئی ریکارڈ رکھنا ممکن نہیں رہتا۔ نیز انسانوں کو مصنوعی طور پر موت کے بہت قریب لیجانے والے میڈیکل حربوں میں آکسیجن کی کمی یا ادویات دینے کا طریقہ استعمال کرنا لازمی نہیں۔ یہ چیز خاص طور پر ایکسیڈنٹ کا شکار ہونے والے لوگوں پر صادق آتی ہے۔ قریب الموت تجربات اُس وقت واقع ہوتے ہیں جب موت بالکل سامنے نظر آ رہی ہو، اور ایسا کئی گھنٹے بعد بھی ہو سکتا ہے۔

(6)- شخصیت کو ختم کرنے کی تھیوری:

قریب الموت تجربات کو نفسیاتی حوالوں سے واضح کرنے کی پہلی جدید کوشش 1930ء میں ایک ماہرِ نفسیات نے کی۔ اُس کا کہنا تھا کہ موت اور بیماری کی ایک ناخوش گوار حقیقت سے دوچار

لوگ خود کو بچانے کی خاطر انہیں خوش کن اور خوش گوار تخیلات کے ساتھ بدل دیتے ہیں۔ وہ خود کو خود سے جدا کر کے غیر شخصی بن جاتے ہیں۔ آج بھی کبھی کبھی یہ تھیوری پیش کی جاتی ہے۔ لیکن اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ قریب الموت تجربات کے کچھ مخصوص عناصر غیر شخصی بننے کی حالت سے میل نہیں کھاتے۔ مثلاً طاقت ور روحانی اور باطنی احساسات اور آگہی و بیداری میں اضافہ۔

(7)- پیدائشی حافظے کی تھیوری:

ایک اور مقبول تھیوری یہ ہے کہ قریب المرگ تجربات کا موت کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں، بلکہ وہ پیدائش کی یادیں ہیں۔ پیدا ہونے والا بچہ کوکھ سے نکل کر ایک سرنگ میں سے گزرتا ہوا روشنی کی طرف آتا ہے، اور روشنی میں اُس کے لیے عموماً بہت سی چاہت اور محبت منتظر ہوتی ہے۔ موت کے وقت پیش آنے والے حالات زندگی کے آغاز کے واقعات کی ذخیرہ شدہ یاد ہی ہے۔ لیکن یہاں بھی بہت سے نکات غیر مطابق ہیں: پیدا ہونے والا بچہ تیز رفتاری سے سفر طے نہیں کرتا، بلکہ ماں کے پٹھوں کا اکڑاؤ بڑی مشکل کے ساتھ اُسے نیچے اور باہر کی جانب دھکیلتا ہے۔ اور یہ مثال مر چکے دوستوں اور رشتہ داروں کے ساتھ ملاقات کی وضاحت کیسے کرتی ہے؟ ''نورانی ہستی'' غالباً دایا یا ڈاکٹر کو ہی فرض کیا گیا، لیکن اُن بچوں کے بارے میں کیا کہا جائے جو کسی دایا یا ڈاکٹر کی عدم موجودگی میں پیدا ہوتے ہیں۔ خالصتاً عملی نکتۂ نظر سے بات کی جائے تو بچے کا اعصابی نظام اتنا ترقی یافتہ نہیں ہوتا کہ پیدائش کے عمل کی یادوں کو جمع اور ذخیرہ کر سکے۔

اس تھیوری کے حامیوں کا کہنا ہے کہ امن اور مسرت کے احساسات کوکھ میں ملنے والی راحت کی یادگار ہیں جب ماں کے ذریعہ تمام جسمانی ضروریات پوری ہوتی ہیں اور کوئی پریشانی یا فکر لاحق نہیں ہوتی۔ لیکن پیدا ہونا اکثر بچوں کے لیے ایک خوش گوار تجربہ نہیں ہوتا؛ وہ کرب کے عالم میں روتے اور چلاتے ہیں۔ اس کے برعکس قریب الموت تجربات کو عموماً نہایت خوش گوار تجربہ بیان کیا گیا۔ پیدائش کا عمل باعثِ مسرت نہیں۔

(8)- حیات بعد الموت کی تھیوری:

چھوٹے بچوں پر تحقیق میں بنیادی کام کرنے والے ڈاکٹر Melvin Morse کا کہنا ہے کہ ''روشنی کی کوئی توضیح موجود نہیں۔''

قریب الموت حالات کے محققین میں غالباً سب سے زیادہ محترم ڈاکٹر کینتھ رنگ کے

مطابق: ''کسی بھی موزوں نیورولوجیکل توضیح کے لیے یہ ثابت کرنا ضروری ہے کہ مرکزی تجربے (یعنی جسم سے باہر ہونے کی حالت، پیرانارمل علم، طلائی نور، مردہ رشتہ داروں کا ظہور، خوب صورت مناظر وغیرہ) کے ساتھ منسلک مظاہر کی ساری عمارت موت قریب آنے پر مخصوص نیورولوجیکل واقعات کے نتیجہ میں کیسے اُبھر سکتی ہے...... میرے خیال میں یہ ثبوت پیش کرنے کی ذمہ داری اب اُن لوگوں کے کندھوں پر آن پڑی ہے جو قریب الموت تجربات کی وضاحت اس حوالے سے کرتے ہیں۔''

کینتھ رِنگ کے کہنے کا مطلب ہے کہ قریب الموت تجربات میں یکساں عوامل اِتنے بہت سے ہیں کہ دماغ کی طبعی کارکردگی کے حوالے سے اُن کی ایک اچھی وضاحت پیش کرنا مشکل ہو گا۔ ''انٹرنیشنل اِنسٹی ٹیوٹ فار ریئر ڈیتھ ایکسپیرینئنس'' میں زیرِ علاج نینسی ایوانز بُش کی رائے قابلِ قدر ہے، جس نے کہا: ''کوئی بھی ایسا انسانی تجربہ موجود نہیں جسے محض ایک حیاتیاتی عمل کے طور پر دیکھا جا سکے، لیکن اِس طرح ہمارے لیے اُن تجربات کی اہمیت کم نہیں ہو جاتی...... چاہے وہ محبت میں مبتلا ہونے کا تجربہ ہو، دکھ کا یا پھر بچہ پیدا کرنے کا۔'' یا موت کے قریب پہنچنے اور ایک ماورائی تجربہ کرنے کا۔

کچھ لوگوں کو یقین ہے کہ شعور کی توضیح پیش کرنے کے لیے سائنس کو مزید بہتر آلات کی ضرورت ہے۔ شاید شعور کی حقیقت دریافت کر لینے کے بعد ہم قطعی معنوں میں بتا سکیں کہ موت کے عمل میں کیا کچھ اور کیوں پیش آتا ہے۔ فی الحال تو ہمارے پاس مختلف اور متضاد تھیوریز ہی ہیں۔

بلیک مور
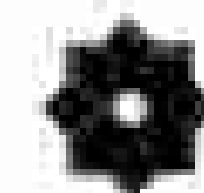
5

بچے کا تصورِ موت

گزشتہ پچاس برس کے دوران بچوں کی نفسیات کے حوالے سے کافی پیش رفت ہوئی ہے۔ نتیجتاً بچے کی زندگی کے بھی مراحل پر تحقیق کی گئی ہے۔ تاہم، آپ کو حیرت ہوتی ہے کہ بچے کے تصورِ موت کو کس قدر کم اہمیت دی جاتی ہے، بلکہ اُسے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ بالغ شخص کا موت کے بارے میں نظریہ بچپن میں ہی اپنی بنیادی صورت اختیار کرنے لگتا ہے۔

موت کے بارے میں بچے کے رویوں کے حوالے سے زیادہ تر تحقیقات میں اصولاً موت سے متعلق احساسات کو ہی توجہ کا مرکز بنایا گیا۔ صرف Cousinet اور انتھونی نے ہی اِس کے ترقیاتی خواص پر توجہ دی۔ ہم یہاں اِس پر بات کریں گے، یعنی موت کے بارے میں تین تا دس سال کے بچوں کے خیالات (جینیٹک نکتۂ نظر سے) پر تحقیق۔

طریقۂ کار

یہ مواد تین طریقوں سے جمع کیا گیا:

1- سات تا دس سال کے بچوں سے اِس عمومی سوال کا جواب مضمون کی صورت میں لکھنے کا کہا گیا: ''موت کے متعلق جو کچھ بھی ذہن میں آتا ہے اُسے تحریر کرو۔''

2- چھ تا سال کے بچوں سے موت کے متعلق ڈرائنگز بنوائی گئیں۔ بہت سے زیادہ عمر کے بچوں نے اپنی تخلیقات کی وضاحتیں بھی تحریر کیں۔

3- بعد میں بچوں کے ساتھ اُن کی تحریروں اور ڈرائنگز کے حوالے سے گفتگو کی گئی تا کہ بچے

کے خیالات کی کوئی من مانی تعبیر پیش کرنے سے احتراز کیا جائے۔ تین یا چھ سال کے زیادہ تر بچوں کی تحریریں یا ڈرائنگز نہ ہونے کی وجہ سے گفتگو کا رنگ کچھ مختلف ہو گیا۔ عام طریقہ، رہبر بچے کے ساتھ بامعنی تال میل قائم کرنا اور پھر یہ غور کرنا تھا کہ اُس نے پوچھے گئے سوال سے کیا مطلب لیا ہے، اور انجام کار اُسے موت کے حوالے سے تصورات واحساسات کے متعلق بتانے پر مائل کیا گیا۔

یہاں پیش کردہ تحقیقات جس ڈیٹا پر مبنی ہیں وہ بوڈاپیسٹ اور آس پاس رہنے والے 378 بچوں سے حاصل کیا گیا۔ اُن میں 51 فیصد لڑکے اور 49 فیصد لڑکیاں تھیں۔ حصہ لینے والے بچے مختلف مذاہب، مختلف سکولوں اور مختلف سماجی طبقات سے تعلق رکھتے تھے۔ کند ذہن اور ذہین سبھی قسم کے بچے شامل کیے گئے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ معلومات اس شعبہ میں ہماری سوچ کو آگے بڑھانے کا محرک ثابت ہوں گی۔

نتائج

بچے کے لیے موت کا کیا مطلب ہے؟ ملنے والے جوابات کو تین مرکزی ترقیاتی مراحل میں زمرہ بند کیا جا سکتا ہے: (1) - پانچ سال سے کم عمر کا بچہ عموماً موت کو ایک ناقابلِ تنسیخ حقیقت نہیں مانتا؛ وہ موت میں زندگی کو دیکھتا ہے۔ (2) - پانچ تا نو سال کے درمیان عمر والے بچے کے لیے موت عموماً ایک عارضی اور مجسم چیز ہے۔ (3) - صرف نو سال اور بعد کی عمر کا بچہ موت کو ایک ایسے عمل کے طور پر دیکھنا شروع کرتا ہے جو طے شدہ قواعد کے مطابق ہمارے ساتھ پیش آتا ہے۔ یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اوپر مذکور کیٹگریوں کے ہر بچے نے بالکل ایک جیسے تاثرات نہیں دیے، مگر ہم یہاں غالب رجحان کو بنیاد بنا رہے ہیں۔ اِس رجحان کی بنیاد پر ہم موت کے متعلق بچے کی سوچ میں ترقی کے مدارج کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔

پہلا درجہ: کوئی قطعی موت موجود نہیں

اس پہلے درجے میں بچہ موت کو بطور موت نہیں لیتا۔ وہ مردے کو بھی زندگی اور شعور کا حامل سمجھتا ہے۔ اِس توثیق کی دو متغیر صورتیں ہیں: (a) موت ایک روانگی، ایک نیند ہے...... یہ چیز موت سے قطعی انکار کے مترادف ہے؛ اور (b) بچہ طبعی موت کی حقیقت کو تو تسلیم کرتا ہے مگر اُسے زندگی سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتا...... وہ موت کو درجہ وار یا عارضی خیال کرتا ہے۔ اِس اندازِ فکر کی کچھ ٹھوس مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:

(a) موت بطور ایک رخصت، نیند۔ بی جے (تین سال گیارہ ماہ): ...... ''مردے اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں تا کہ ریت اُن کی آنکھوں میں نہ پڑے۔''

بچے نے سُن رکھا ہے کہ مردے اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ وہ اس کی ایک خارجی وجہ بتاتا ہے۔ مردہ شخص خود ہی اور بطور احتیاط آنکھیں بند کرتا ہے۔

ایس ٹی (چار سال آٹھ ماہ): ...... ''مردہ تابوت میں بند ہونے کی وجہ سے ہل نہیں سکتا۔''

''اگر وہ تابوت میں نہ ہو تو کیا حرکت کر سکتا ہے؟''

''وہ کھا اور پی سکتا ہے۔''

یہاں بھی حرکت نہ کر سکنا خارجی حالات کا نتیجہ ہے۔ مردہ شخص حرکت نہیں کرتا کیونکہ تابوت کے اندر ایسا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ وہ مردے کو بھی غذا کھانے کے قابل سمجھتا ہے۔

ایس جے (پانچ سال) ایک مردہ شخص کو دیکھ چکا ہے۔ ''اُس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بالکل مرا ہوا لگتا تھا۔ چاہے کوئی کچھ بھی کرتا، مگر وہ ایک لفظ بھی نہیں کہتا تھا۔''

''وہ بوڑھا ہوتا رہے گا، بوڑھا اور زیادہ بوڑھا۔ سو سال کا ہو جانے پر وہ بالکل لکڑی جیسا ہو جائے گا۔''

''وہ لکڑی جیسا کیسے بن جائے گا؟''

''میں اِس بارے میں نہیں بتا سکتی۔ میری چھوٹی بہن پانچ سال کی ہو گی۔ جب وہ مری تو میں زندہ نہیں تھی۔ وہ اب تک اِتنی بڑی ہو چکی ہو گی۔ اُس کا تابوت چھوٹا سا تھا، لیکن وہ چھوٹے سے تابوت میں بھی پوری آ گئی۔''

''تمہارے خیال میں اب وہ کیا کر رہی ہو گی؟''

''وہ لیٹی ہوئی ہے، وہ ہمیشہ سے وہاں لیٹی ہے۔ وہ ابھی تک بہت چھوٹی ہے۔ وہ لکڑی جیسی نہیں ہو سکتی۔ صرف بوڑھے لوگ لکڑی جیسے بن جاتے ہیں۔''

آغاز میں وہ معاملے کو زیادہ حقیقت پسندانہ انداز میں دیکھتی تھی۔ مردہ شخص بول نہیں سکتا۔ آنکھیں بند ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ اُس نے دیکھنا بھی بند کر دیا ہے۔ مردہ شخص کا موازنہ لکڑی سے کیا گیا ہے۔ غالباً اُس کا مقصد مردہ بہن کے حرکت نہ کر سکنے کے متعلق بتانا تھا۔ بعد میں اُس نے سوچا کہ چھوٹی عمر کے لوگ قبر میں بڑے ہوتے رہتے ہیں۔ نشوونما زیادہ نہیں ہوتی۔ اُس نے

اپنی بہن کی عمر اس لیے پانچ سال بتائی کیونکہ وہ خود بھی پانچ سال کی تھی۔

بی آئی (چار سال گیارہ ماہ):...... "مٹی کے نیچے کیا ہوتا ہے؟"

"وہ اپنے مردہ ہونے کی وجہ سے روتا ہے۔"

"لیکن وہ روتا کیوں ہے؟"

"کیونکہ اُسے خوف آتا ہے۔"

بچی کے خیال میں موت بری چیز ہے۔ شاید اُسے کسی شخص کی موت کا سوگ دیکھنے کا تجربہ ہوا تھا۔ اُس نے مردے کو بھی یہی جذبہ منتقل کر دیا۔

ٹی پی (چار سال دس ماہ):...... "مردہ شخص بالکل سویا ہوا لگتا ہے۔ وہ مٹی میں دفن ہونے کے بعد بھی سویا رہتا ہے۔"

"سونے یا مرنے میں فرق کا کیسے اندازہ ہوتا ہے؟"

"مجھے پتا ہے کہ اگر کوئی شخص رات کے وقت بستر پر لیٹے تو اپنی آنکھیں نہیں کھولتا۔ اگر کوئی بستر پر لیٹے اور دوبارہ نہ اُٹھے تو وہ مر جاتا ہے۔"

"کیا وہ کبھی اُٹھے گا؟"

"کبھی نہیں۔ مرنے والے شخص کو بس قبر پر کسی کے آنے کا ہی پتا چلتا ہے۔ وہ اُس کی موجودگی کو محسوس کر لیتا ہے۔"

"کیا تمہیں پورا یقین ہے؟ کہیں تم غلطی پر تو نہیں؟"

"میرے خیال میں تو ایسا ہی ہے۔ جنازوں کے موقعہ پر آپ کو گانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ آپ صرف باتیں ہی کرتے ہیں، کیونکہ شور ہونے کی وجہ سے مرنے والا شخص سکون سے نہیں سو سکے گا۔ اگر آپ قبر پر کوئی چیز رکھیں تو مردے کو پتا چل جاتا ہے۔"

"وہ کیا محسوس کرتا ہے؟"

"وہ محسوس کرتا ہے کہ اُس کی قبر پر پھول رکھے جا رہے ہیں۔ پانی ریت کو چھوتا ہے۔ آہستہ آہستہ، وہ ہر بات سنتا ہے۔ آنٹی، کیا مردے کو پتا ہوتا ہے کہ وہ مٹی میں گہرائی تک گیا ہوا ہے؟"

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"وہ باہر نکلنا چاہتا ہے، لیکن تابوت میں کیل ٹھونکے ہوتے ہیں۔"

"اگر وہ تابوت میں نہ ہو تو کیا واپس آ جائے گا؟"

"وہ ساری ریت نہیں ہٹا سکے گا۔"

موت کو نیند کے ساتھ شناخت کیا گیا، تاہم بیرونی دنیا کے ساتھ اس کے رشتے کو بدستور قائم سمجھا گیا۔ مردہ شخص کو باہر دنیا کے حالات کا علم ہوتا ہے۔ وہ صرف سوچتا ہی نہیں بلکہ محسوس بھی کرتا ہے۔

ایف آر (نو سال گیارہ ماہ):...... "میں چھ سال کا تھا۔ میرے باپ کا ایک دوست مر گیا۔ اُنہوں نے مجھے نہ بتایا لیکن مجھے پتا چل گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ ایسا ہی تھا جیسے ماں جب کہیں جاتی ہے تو میری نظروں کے سامنے نہیں رہتی۔"

موت اور سفر کی خبر کے متعلق اُس کا احساس ایک جیسا ہے۔ مرنے والا شخص غیر حاضر یا کہیں گئے ہوئے شخص جیسا ہے؛ کیونکہ وہ دونوں ہی نظر نہیں آتے۔

المختصر، بچے موت کو تسلیم نہیں کرتے۔ جب کوئی شخص کہیں چلا جاتا ہے تو اُسے مردہ سمجھ لیا جاتا ہے۔ چنانچہ موت کا مطلب رخصت پر کہیں جانا ہے۔ مرنے کا مطلب بھی زندگی کا جاری رہنا ہے، مگر کچھ مختلف حالات میں۔ اگر کوئی شخص مر جائے تو اُس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی، بلکہ ہماری زندگیاں تبدیل ہو جاتی ہیں کیونکہ ہم اب اُس شخص کو دیکھ نہیں پاتے۔ اِس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ بچے موت کے بارے میں کوئی ناگوار جذبات نہیں رکھتے، کیونکہ اُن کے لیے موت میں سب سے زیادہ دکھ انگیز بات علیحدگی کا تصور ہے۔

تاہم، زیادہ تر بچے کسی کے مرنے پر محض اِس خیال سے مطمئن نہیں ہوتے کہ متوفی غائب ہو گیا ہے، بلکہ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ موت کے بعد وہ کہاں زندگی گزار رہا ہے۔ بیش تر بچوں نے غائب ہونے اور جنازوں کے حقائق کو آپس میں ملایا۔ قبرستان میں زندگی جاری رہتی ہے۔ تابوت کے باعث زیادہ حرکت نہیں کی جا سکتی، لیکن نشوونما کا عمل جاری رہتا ہے۔ وہ کھانا کھاتے، سانس لیتے ہیں۔ اُنہیں باہر دنیا کے واقعات کا علم ہوتا ہے۔ وہ اپنے لیے کسی کے احساس سے آگاہ ہو جاتے اور اپنے لیے غم زدہ ہوتے ہیں۔ تاہم، بچوں نے تسلیم کیا کہ یہ زندگی محدود ہے اور ہماری زندگی جیسی مکمل نہیں۔ اُن میں سے کچھ ایک اِس تقلیل شدہ زندگی کو صرف اور صرف نیند تک محدود سمجھتے ہیں۔

یہ عمومی نقطہ تحلیلی نفسیاتی سوچ میں بیان کردہ نقطۂ نظر سے ملتا جلتا ہے جس کے مطابق نیند اور موت کو لاشعور میں ایک ہی مفہوم میں لیا جاتا ہے۔ نیند کی طرح موت میں بھی ماں سے علیحدگی ختم ہو جاتی اور اتحاد بحال ہوتا ہے جو رحم میں گزارے ہوئے دنوں کے دوران کا مل تھا۔ قدیم لوگوں کے ہاں بھی ہم موت اور نیند میں مشابہت کی مثالیں دیکھتے ہیں۔ مثلاً مغربی افریقہ کے باشندے نیند کے لیے کوئی مخصوص لفظ نہیں رکھتے۔ ''سونے'' کے لیے استعمال ہونے والے لفظ کا مطلب ''نیم مردہ'' بنتا ہے۔ مردے خاص طور پر خوابوں میں زندہ رہتے اور زندہ لوگوں سے ملنے آتے ہیں۔ موت کو محض ایک انخلا سمجھنے کا تصور اِس امر سے بھی واضح ہے کہ بہت سے مقامات پر مردے کے قریب کھانے پینے کی اشیا، حتیٰ کہ لباس اور ہتھیار بھی رکھ دیے جاتے ہیں۔ کبھی کبھار اُن کے ساتھ نوکر اور بیویاں بھی دفن ہوتی ہیں، تا کہ اگلی دنیا میں اُن کی دیکھ بھال کی جا سکے۔ حتیٰ کہ ہماری اپنی ثقافت کی زبان میں یہ تصور واضح نظر آتا ہے۔ جب کوئی مر جائے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ ''گزر گیا'' ہے؛ کہ مرنے والا اپنی ''دھرتی ماں'' میں واپس چلا گیا ہے؛ ہم ''مردے سے رخصت'' لیتے اور اُسے ''پُرسکون نیند'' کی دعا دیتے ہیں۔ اور اگر ہم قبر میں صرف ایک مردہ جسم ہی موجود ہونے کا سوچیں تو ہماری تجہیز و تکفین کی رسوم کافی حد تک بے معنی ہو جاتی ہیں۔

(b) موت عارضی اور تدریجی ہے:...... پانچ اور چھ سال کی درمیانی عمر کے بچوں کی خاصی بڑی تعداد موت سے تو انکار نہیں کرتی لیکن وہ بدستور اِسے ایک قطعی اور مطلق امر ماننے کو تیار نہیں ہوتے۔ وہ موت کی موجودگی کو مانتے ہیں لیکن اِسے ایک تدریجی یا عارضی چیز سمجھتے ہیں۔

ایل پی (پانچ سال چھ ماہ):...... ''اُس کی آنکھیں بند تھیں۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ وہ مر گیا تھا۔''

''سونے اور مرنے میں کیا فرق ہے؟''

''پھر وہ تابوت لائے اور اُسے اندر ڈال دیا۔ جب کوئی شخص مر جائے تو اُس کے ہاتھ یوں رکھے جاتے ہیں۔''

''تابوت میں اُس کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟''

''اُسے کیڑے کھاتے ہیں۔ وہ تابوت میں سوراخ کر دیتے ہیں۔''

''وہ اپنا جسم کیڑوں کو کیوں کھانے دیتا ہے؟''

''وہ اُٹھنے کے قابل نہیں ہوتا کیونکہ اوپر ریت پڑی ہوتی ہے۔ وہ تابوت میں سے باہر نہیں نکل سکتا۔''

''اگر اوپر ریت نہ پڑی ہو تو کیا وہ باہر نکل آئے گا؟''

''بالکل، اگر وہ برے انداز میں نہ مرا ہو تو وہ اپنا ہاتھ ریت سے باہر نکال کر اُسے کھود دے گا۔''

اِس سے پتا چلتا ہے کہ وہ اب بھی زندہ رہنے کا خواہش مند ہے۔

ابتدا میں یہ بچہ کچھ حقیقت پسند نظر آتا ہے۔ سابقہ بچوں کی طرح وہ یہ نہیں کہتا کہ ''اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں؛'' بلکہ ''اُس کی آنکھیں بند تھیں۔'' وہ نیند اور موت کے درمیان صرف خارجی فرق ہی دیکھتا ہے۔ اگر وہ فوراً بعد ہی کیڑوں کے متعلق نہ بتاتا تو یہ موت کو مسترد کرنے کا ثبوت ہوتا۔ وہ یہ نہیں کہہ رہا کہ مردہ حرکت نہیں کر سکتا، بلکہ اُس کے خیال میں اوپر ڈالی ہوئی ریت اُسے حرکت کرنے سے روکتی ہے۔ دوسری طرف، وہ مردہ شخص کو زندگی کا خواہش مند بتاتا ہے...... البتہ صرف اُس صورت میں جب وہ بھیانک اور خراب انداز میں نہ مرا ہو۔ چنانچہ موت کے تین درجے ہیں۔

ٹی ڈی (چھ سال چھ ماہ):...... ''میری بہن کا اُستاد مر گیا اور میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ اُس کا ہاتھ ٹھنڈا یخ تھا۔ وہ نیلے اور سبز رنگ کا تھا۔ اُس کے چہرے پر جھریاں پڑی تھیں۔ وہ حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنی مُٹھی نہیں بھینچ سکتا تھا کیونکہ وہ مر گیا تھا۔ اور وہ سانس بھی نہیں لے سکتا تھا۔''

''اُس کا چہرہ؟''

''چہرہ بالکل سرد پڑ گیا تھا۔ موت کی وجہ سے اُس کا سارا جسم ٹھنڈا ہو چکا تھا۔''

''کیا اُسے سردی لگ رہی تھی یا صرف جلد ہی سرد تھی؟''

''مرنے کے بعد محسوس ہو جاتا ہے۔ اگر وہ مر جائے تو تھوڑا بہت محسوس ہوتا ہے۔ بالکل مر جانے پر کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا۔''

بچے کی پیش کردہ وضاحت حقیقت پسندانہ انداز میں شروع ہوتی ہے۔ وہ بچگانہ انداز میں جسم سرد پڑنے کی وجہ بیان کرتا ہے۔ وہ ٹھنڈک کی وجہ سے سرد ہے۔ تاہم، وہ سردی محسوس کرتا ہے، مگر پوری طرح مر جانے کے بعد نہیں۔ اِس کا مرنے کے کرب ناک عمل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں،

کیونکہ اُس نے اپنی بہن کے اُستاد کو صرف جنازے کے موقعہ پر دیکھا تھا۔

موت میں یہ تدریجی پن محض قوتِ اظہار کے فقدان کا معاملہ نہیں در اس کا دس سالہ بچے کے خیال میں موت کے عوامل سے کوئی تعلق بھی نہیں۔

''دنیا سے غائب ہو جانے تک اُسے سب کچھ معلوم ہوتا ہے۔ مٹی کے تین بیلچے ڈالے جانے تک بھی وہ اپنے متعلق ہماری کہی ہوئی ہر بات سنتا ہے۔''

ابتداً میں وہ موت میں واقع ہونے والی جسمانی تبدیلیوں کو حقیقت پسندانہ انداز میں بیان کرتا ہے؛ تب وہ بتاتا ہے کہ مٹی میں دفن کیے جانے تک مردے کو سب کچھ کا علم ہوتا ہے۔ چنانچہ مرنے اور دفن ہونے کا درمیانی عرصہ موت اور زندگی کے درمیان ایک عبوری حالت ہے۔

جی پی (چھ سال):...... ''اُس نے اپنی بازو سیدھی کیں اور لیٹ گیا۔ آپ اُس کی بازوؤں کو نیچے نہیں کر سکتے۔ وہ بول نہیں سکتا۔ وہ حرکت نہیں کر سکتا۔ دیکھ نہیں سکتا۔ وہ اپنی آنکھیں نہیں کھول سکتا۔ وہ چار دن تک وہاں پڑا رہتا ہے۔''

''چار دن تک ہی کیوں؟''

''کیونکہ تب تک فرشتوں کو اُس کے ٹھکانے کا علم نہیں ہوتا۔ تب لوگ وہاں جاتے اور کھدائی کرتے ہیں۔ وہ کسی کے مرجانے پر وہاں قبر کھودتے ہیں۔ وہ اُسے صاف کرتے اور سجاتے ہیں۔''

''اُسے کیا ہوا ہوتا ہے؟''

''اگر وہ عورت ہو تو صفائی کرتی ہے۔ اگر مرد ہو تو فرشتہ بن جاتا ہے۔ وہ کرسمس ٹریز لاتا ہے۔ جوتری نہیں لاتا وہ آسمان میں کیک بناتا اور بچوں کو کھلونے دیتا ہے۔ آسمان پر جانا اچھا نہیں کیونکہ آپ کو اُڑنا پڑتا ہے۔ آسمان میں رہنا اچھی بات ہے۔ وہاں آپ گیلے نہیں ہوتے، وہاں بارشیں آپ کو بھگوتی نہیں۔ بارش صرف زمین پر ہوتی ہے۔''

''اچھا، تو اگر تم بھی وہاں گئے تو کیا کرو گے؟''

''میں سارا سال کیک بناؤں گا۔ ہر ایک فرشتے کا اپنا اپنا چولہا ہے۔''

''اگر تم سارا سال کیک ہی بناتے رہے تو اُن کا ڈھیر نہیں لگ جائے گا؟''

''بہت سے گھر اور بہت سے بچے ہیں۔ اگر کیک بنانے کا کام مکمل ہو جائے تو ہم آنکھ مچولی کھیل سکتے ہیں۔ تب بچے بادلوں میں چھپ جائیں گے۔ آپ وہاں اوپر بہت اچھے طریقے سے

چھپ سکتے ہیں۔ کوئی اوپر کی طرف تو کوئی نیچے کی طرف اُڑے گا۔''

اس بچے نے موت کو حقیقت پسندانہ انداز میں بیان کیا۔ زندگی کی سرگرمیاں مفقود ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ مردہ صرف چار دن تک قبر میں رہتا اور پھر آسمان پر چلا جاتا ہے (یہ حیات بعد الموت پر نہیں بلکہ زندگی کے تسلسل پر یقین ہے، کیونکہ اول الذکر میں جسم فنا ہو جاتا ہے لیکن مؤخر الذکر میں نہیں)۔ چنانچہ موت کی میعاد چار دن ہے۔ وہ قطعی بچگانہ انداز میں آسمانی زندگی کا تصور کرتا ہے۔ وہ کھیلتے اور کیک کھاتے ہیں۔

اس گروپ کے بچے ایک خاص حد تک موت کو قبول کر چکے ہوتے ہیں۔ تاہم، موت اور زندگی کے درمیان فرق مکمل نہیں۔ اگر وہ موت کو ایک تدریجی عمل خیال کریں تو زندگی اور موت بیک وقت آپس میں منسلک ہیں؛ کہ جیسے زندگی اور موت عارضی طور پر ایک دوسرے کی جگہ لے سکتے ہوں۔ یہ تصورات موت کو قطعی مسترد کرنے کی نسبت کہیں اعلیٰ درجے کے ہیں۔ یہاں دونوں عوامل کے درمیان امتیاز شروع ہو چکا ہے۔ خوش اُمیدیوں کے ساتھ ساتھ حقیقت کے لیے ایک احساس بھی کردار ادا کرتا ہے۔ چنانچہ ایک سمجھوتہ واقع ہوتا ہے: جبکہ موت کا موجود ہونا امرِ واقعی اور قطعی نہیں۔

Rivers نے بھی سولومن جزائر میں ایک ایسے ہی نکتۂ نظر بیان کیا۔ وہاں کے باشندے ایک لفظ mate استعمال کرتے ہیں جس کا ترجمہ بطور موت کیا جاتا ہے، البتہ یہ toa یعنی زندگی کے متضاد کے طور پر استعمال نہیں ہو سکتا۔ mate ایک ایسی حالت ہے جو برسوں تک جاری رہ سکتی ہے۔ یہ موت سے پہلے کا عرصہ نہیں کیونکہ اُن کے خیال میں موت وجود نہیں رکھتی۔ mate کی حالت سے دو چار شخص کی تجہیز و تکفین کی رسوم انجام دی جاتی ہیں۔ تاہم، تدفین سے مراد مردے کی تدفین نہیں بلکہ toa یعنی زندگی سے mate کی حالت میں عبور ہے۔ عنفوانِ شباب کی طرح یہ بھی زندگی کا ایک عظیم موڑ ہے۔ زندگی اور موت کے درمیان فرق، بچوں کے اس گروپ میں یہی مبہم خاصیت رکھتا ہے۔

دوسرا مرحلہ: موت کا شخصی روپ

دوسرے مرحلے میں بچہ موت کو ایک شخصی روپ دیتا ہے۔ تمام عمروں کے زیرِ مطالعہ بچوں میں ملنے والا یہ تصور خاص طور پر پانچ اور نو سال کی عمروں سے تعلق رکھتا ہے۔ موت کو شخصی روپ

دینے کا عمل دو طریقوں سے واقع ہوتا ہے: موت کو ایک علیحدہ شخص تصور کیا گیا ہے، یا پھر موت کو مردے کے ساتھ شناخت کیا جاتا ہے۔ کچھ وضاحتی مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:

بی ایم (چھ سال سات ماہ):...... ''وہ برے بچوں کو لے جاتی ہے۔ وہ انہیں دبوچتی اور ساتھ لے جاتی ہے۔''

''وہ کس طرح کی ہے؟''

''برف جیسی سفید۔ موت ہر جگہ پر سفید ہے۔ وہ مکار ہے۔ وہ بچوں کو پسند نہیں کرتی۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ بچے اُسے اچھے نہیں لگتے۔''

''موت میں سفید رنگ کس چیز کا ہے؟''

''ڈھانچہ، ہڈیوں کا ڈھانچہ۔''

''کیا یہ واقعی اِس طرح کی ہے یا اِسے صرف ایسا بیان کیا جاتا ہے؟''

''واقعی اِس طرح کی ہے۔ ایک بار میں نے اِس کے بارے میں گفتگو کی اور رات کے وقت حقیقی موت میرے پاس آئی۔ اُس کے پاس ہر جگہ کی چابی ہے، اِس لیے وہ دروازوں کے تالے کھول لیتی ہے۔ وہ بستر پر میرے پاس آئی اور رضائی کھینچنے لگی۔ میں نے خود کو اچھی طرح چھپا لیا۔ وہ مجھے دبوچ نہ سکی اور پھر واپس چلی گئی۔''

''تب میں بیمار تھا۔ میں نے کنڈرگارٹن سے چھٹی کی تھی۔ ایک چھوٹی سی بچی ہمیشہ میرے پاس آ جاتی۔ میں ہمیشہ اُس سے لڑتا تھا۔ ایک رات وہ آئی۔ میں ہمیشہ کشمش کھاتا، حالانکہ وہ میرے لیے منع تھی۔''

''کیا تم نے اپنی ماں کو بتایا؟''

''ماں کے ساتھ اِس بارے میں بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی کیونکہ وہ ہر چیز سے ڈرتی ہے۔''

''اور باپ کو؟''

''پاپا نے کہا کہ یہ محض ایک کہانی ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ کوئی کہانی وغیرہ نہیں ہے۔''

بچے نے موت کو ایک انسانی ڈھانچے جیسا تصور کیا جو لوگوں کو ساتھ لے جاتی ہے۔ نتیجتاً موت ایک بری چیز تصور کی گئی۔ موت کی گفتگو اِس کے ساحرانہ ورود کی ذمہ دار ہے۔ نیز ''غلط''

کام کرنے پر بھی موت آ جاتی ہے۔

پی جی (آٹھ سال چھ ماہ):...... ''موت اُس وقت آتی ہے جب کوئی مر جائے۔ وہ ہاتھ میں ایک درانتی لیے آتی ہے، وہ اُسے کاٹ ڈالتی اور ساتھ لے جاتی ہے۔ موت جاتے وقت اپنے قدموں کے نشان چھوڑ جاتی ہے۔ قدموں کے نشان غائب ہونے پر وہ واپس آتی اور مزید لوگوں کو کاٹتی ہے۔ تب لوگ اُسے پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ ہاتھ نہیں آتی۔''

اس بچے کے لیے موت اِس حد تک شخصی ہے کہ اپنے قدموں کے نشان تک چھوڑ جاتی ہے۔ وہ بچے کی طرح لوگوں کو ستاتی ہے۔ بچہ موت کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔

پی ٹی (نو سال گیارہ ماہ):...... ''موت ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے۔ یہ اتنی طاقت ور ہے کہ بحری جہاز کو بھی اُلٹا سکتی ہے۔ موت ایک خفیہ جگہ پر رہتی ہے۔ یہ ایک جزیرے میں چھپی رہتی ہے۔''

اِس بچے کے خیال میں موت کا انداز ایک پری کہانی والا ہے۔ وہ ایک جزیرے پر چھپی ہوئی ہے۔ اُس کی طاقت بے پناہ ہے۔ موت نظر نہیں آتی۔ بچہ یہ بتانے سے قاصر تھا کہ موت بذاتِ خود غائب ہے یا پھر صرف لوگ ہی اُسے دیکھنے سے قاصر ہیں۔

وی پی (نو سال گیارہ ماہ):...... ''موت بہت خطرناک چیز ہے۔ آپ کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کس لمحے آپ کو آ دبوچے گی۔ موت نظر نہیں آتی۔ دنیا میں کبھی کسی نے اُسے نہیں دیکھا۔ لیکن رات کے وقت وہ سب کے پاس آتی اور اُٹھا کر اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ موت ہڈیوں کے ڈھانچے جیسی ہے۔ اُس کے تمام حصے ہڈی سے بنے ہوئے ہیں۔ لیکن جب صبح کی روشنی پھیلنا شروع ہو تو موت کا شائبہ تک بھی نہیں رہتا۔ موت نہایت خطرناک چیز ہے۔''

''وہ رات کو ہی کیوں باہر نکلتی ہے؟''

''کیونکہ اُس وقت سب لیٹے ہوتے ہیں اور وہ بہ آسانی گھوم پھر سکتی ہے۔''

''کیا وہ لوگوں سے ڈرتی ہے؟''

''نہیں۔ وہ اپنا آپ لوگوں کے سامنے ظاہر نہیں کرنا چاہتی۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ وہ اِس سے خوف زدہ ہو جائیں گے۔''

موت اس لیے دکھائی نہیں دیتی کیونکہ وہ رات کو گھومتی پھرتی ہے۔ دیگر بچوں نے موت کو بدخواہ تصور کیا؛ یہ بچہ اُسے نیک ارادوں کی حامل بتاتا ہے۔ موت چوری چھپے پھرتی ہے تاکہ لوگ اُسے دیکھ کر خوف زدہ نہ ہو جائیں۔

بی جی (چار سال نو ماہ):...... ''موت برا کام کرتی ہے۔''

''وہ برا کام کیسے کرتی ہے؟''

''وہ خنجر گھونپ کر آپ کو مار ڈالتی ہے۔''

''موت کیا ہے؟''

''ایک آدمی۔''

''کس قسم کا آدمی؟''

''موت آدمی۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہے؟''

''میں نے اُسے دیکھا ہے۔''

''کہاں؟''

''گھاس میں۔ مَیں پھول جمع کر رہا تھا۔''

''تم نے اُسے کیسے پہچانا؟''

''بس مجھے پتا چل گیا۔''

''لیکن کیسے؟''

''میں اُس سے ڈر گیا تھا۔''

''تمہاری ماں نے کیا کہا؟''

''آؤ یہاں سے چلتے ہیں، یہاں موت ہے۔''

یہ بچہ موت کو ایک ایسا آدمی تصور کرتا ہے جو اُسے پھول جمع کرنے کے دوران نظر آیا تھا۔ موت کی خوف ناکی ہی اُس کی پہچان ہے۔ بعد میں بچے نے بتایا کہ وہ موت کا پتا جاننے کا خواہش مند ہے؛ وہ وہاں جا کر موت کو گولی مار دے گا۔ بہت سے بچوں نے کہا: ''مَیں موت آدمی کو مار ڈالوں گا۔ اس طرح ہم مریں گے نہیں۔''

کے پی (چھ سال ایک ماہ):...... ''وہ سفید کوٹ پہنتی اور موت کا چہرہ لگاتی ہے۔''

''کون؟''

''موت۔ وہ بچوں کو خوف زدہ کرتی ہے۔''

''کیا اُس نے تمہیں بھی کبھی ڈرایا ہے؟''

''میں خوف زدہ نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ محض ایک آدمی ہے جس نے موت کا نقاب ڈال رکھا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے اُسے سرکس میں دیکھا تھا۔''

''مجھے اُس آدمی کی بجائے حقیقی موت کے بارے میں بتاؤ۔ موت حقیقت میں کیا ہے؟''

''حقیقی موت؟ میں نہیں جانتا۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں اور سفید کپڑے ہیں۔ اُس کے لمبے بازو اور لمبی ٹانگیں ہے۔''

''لیکن یہ حقیقی موت تو نہیں۔ یہ تو صرف موت کے لباس میں ایک 'انکل' ہے۔''

''نہیں۔ میں چرچ میں گیا تھا۔ میں نے وہاں حقیقی موت کو دیکھا تھا۔ موت آدمی پارک کی طرف چلا گیا۔''

''لیکن وہ تو محض موت کے روپ ایک آدمی تھا۔''

''لیکن موت کی بہت بڑی بڑی آنکھیں ہیں۔ موت بھی محض ایک انسان ہے۔ بس اُس کی آنکھیں بہت بڑی ہیں۔''

موت کو بالکل کسی حقیقی شخص جیسا تصور کیا گیا۔ یہ امر دلچسپ ہے کہ سرکس کے مسخرے نے اس لڑکے پر کس قدر گہرا اثر ڈالا۔

ایس ڈی (آٹھ سال تین ماہ):...... ''وہ ایک آدمی جیسی ہے۔''

''کیسے؟''

''جب کسی آدمی کا وقت آئے تو وہ مر جاتا ہے۔ تب وہ آسمان سے اُترتی اور اُسے اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔''

''کون؟''

''موت۔''

''وہ آدمی جیسی ہے اور اوپر آسمان پر رہتی ہے۔''

"کیا موت اچھی ہے؟"

"میرے خیال میں موت بری ہے کیونکہ وہ لوگوں کی زندگی ختم کر دیتی ہے۔"

"اُس کی شکل اور حلیہ آدمی جیسا کیوں ہے؟"

"اُس کا جسم انسانوں جیسا ہے۔ اُس کا سوچنے کا انداز مختلف ہے۔ لوگوں کے خیال میں موت بری چیز ہے۔ تب موت سوچتی ہے کہ اُنہیں آسمان پہ لیجا کر اچھا کام کرے گی۔"

"تو کیا وہ لوگوں کو دوزخ میں لیجاتے وقت بھی یہی سوچتی ہے؟"

"نہیں، لوگ موت سے خوف زدہ ہیں، لیکن موت اپنے آپ سے خوف زدہ نہیں۔ یہ تو بس اُنہیں ایک گاڑی میں بٹھا کر اوپر لے جاتی ہے۔"

موت آسمان پہ رہنے والا ایک آدمی ہے۔ اِس کا جسم انسانوں جیسا لیکن سوچ کا انداز مختلف ہے۔

ایچ جی (سات سال نو ماہ):...... "جب کوئی شخص مرتا ہے تو موت کے فرشتے اُسے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ موت کے فرشتے لوگوں کے بڑے دشمن ہیں۔ موت فرشتوں کی بادشاہ ہے۔ موت فرشتوں کو حکم دیتی ہے۔ فرشتے موت کے لیے کام کرتے ہیں۔"

موت فرشتوں کی بادشاہ ہے۔

ٹی ایس (سات سال چھ ماہ):...... "موت کیا ہے؟ ایک بھوت۔ آپ اُسے نہیں دیکھ سکتے، بس وہ خود ہی آ جاتی ہے۔ وہ ہوا میں اُڑتی ہوئی کسی چیز جیسی ہے۔"

"بھوت کیا ہوتا ہے؟"

"کوئی نظر نہ آنے والا شخص۔ ہوا میں اُڑتا ہوا شخص۔"

لہٰذا موت ایک دکھائی نہ دینے والا شخص یعنی بھوت ہے۔

ایچ جی (آٹھ سال پانچ ماہ):...... "مجھے نہیں معلوم کہ وہ زندہ ہے، کہ وہ ایک آدمی ہے۔ اگر وہ آدمی ہوتی تو بالکل لکڑہارے جیسی ہوتی۔ اُس کے جسم پر چغہ، ہاتھ میں کلہاڑا ہوتا، جیسا کہ اُسے ایک تصویر میں دکھایا گیا ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جو آپ کو نظر نہ آئے۔ مجھے یقین نہیں کہ واقعی ایسی کوئی چیز موجود ہے۔"

"اگر وہ موجود ہے تو کہاں ہے؟"

"بھوتوں پریتوں کا کوئی ملک نہیں ہوتا۔"

"کیا فرشتوں کا بھی کوئی ملک نہیں ہوتا؟"

"ہاں، لیکن وہ نیک روحیں ہیں۔ میری مراد صرف بدروحوں سے ہے۔ برے لوگوں کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ وہ آتے اور چلے جاتے، گھومتے پھرتے، آوارہ گردی کرتے اور دوسروں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔"

"کیا موت ایک بدروح ہے؟"

"ہاں۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ وہ ٹھنڈی ہے۔ میرے خیال میں وہ دیکھنے میں بہت بدصورت ہوگی۔ آپ اُس کے سامنے سر جھکاتے اور دعا کرتے ہیں، پھر بھی موت آپ کو مار ڈالتی ہے۔ میں نے اکثر خود کو موت سے دور بھاگتے ہوئے تصور کیا ہے۔"

"دور بھاگتے ہوئے؟"

"اپنے کمرے میں اکیلا بیٹھا میں اِس کا تصور کرتا ہوں۔ مجھے باہر جانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ میں دروازہ بند کر لیتا ہوں تا کہ وہ مجھے پکڑ نہ سکے۔ میں اکثر اُس کے ساتھ ایسے ہی آنکھ مچولی کھیلتا رہتا ہوں۔"

"کیا یہ ایک کھیل ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ میں ہمیشہ یہی ظاہر کرتا ہوں۔"

"کیا اکیلے میں تمہیں خوف آتا ہے؟"

"نہیں، میں صرف خوف زدہ ہونے کا دکھاوا کرتا ہوں۔"

"ورنہ یہ سب کچھ سچ نہیں؟"

"نہیں۔"

"اگر یہ سب کچھ حقیقی اور سچ نہیں تو تم ڈرتے کیوں ہو؟"

"کسی نہ کسی طرح میں خوف زدہ بھی ہوں۔ موت دنیا کی سب سے طاقت ور حکم ران ہے، ماسوائے اچھے خدا کے۔ موت شیطان کی ساتھی ہے۔ موت بھوت جیسی ہے۔ اگر موت کے نوکر ہیں، تو وہ بھوت ہی ہوں گے۔ اگر موت رقص کرے تو بہت سے بھوت بھی سفید چغے پہن کر رقص

میں شریک ہو جاتے ہیں۔ یہ نظارہ کافی دلکش ہو سکتا ہے۔''

''اس میں خوب صورت والی بات کیا ہو سکتی ہے؟''

مجھے نہیں معلوم۔ لیکن کوئی نہ کوئی خوب صورت ہے ضرور۔ موت اور بھوت اکٹھے ہوتے ہیں، جیسے پریاں اور فرشتے۔ بھوت اور شیطان موت کے ساتھی ہیں۔ لیکن موت سب سے زیادہ خوفناک ہے۔''

''کیا تم اکثر موت کے بارے میں سوچتے ہو؟''

''جی ہاں، اکثر۔ لیکن جب میں موت کے ساتھ لڑتا اور اُس کے سر پہ ضرب لگاتا ہوں تو وہ مرتی نہیں۔ موت کے پر نہیں ہوتے۔''

''کیوں؟''

''کہانیوں میں پریوں اور فرشتوں کے پر ہوتے ہیں، لیکن موت کے نہیں۔ مگر موت اُڑ سکتی ہے۔ وہ پروں کے بغیر بھی اُڑ سکتی ہے۔ موت کے پر نظر نہیں آتے۔ حقیقت میں اُنہیں دیکھا نہیں جا سکتا۔''

ابتداً میں یہ بچہ موت کو ایک شخصی حقیقت ماننے سے انکار کرتا ہے، لیکن پھر اسے جاگتی آنکھوں کے خوابوں کے انداز میں تصور کرتا ہے۔ وہ موت سے دور بھاگتا، اُسے سر پہ ضرب رسید کرتا ہے مگر وہ مرتی نہیں۔

ایس جے (نو سال دس ماہ):...... اس لڑکے نے موت کو کافی حقیقت پسندانہ انداز میں قبول کیا۔ وہ بتاتا ہے کہ کیسے وہ گھر میں ہمیشہ چھوٹے بچوں کے ساتھ بھوتوں کا کھیل کھیلتا ہے۔ وہ جھاڑیوں کو ہلاتا اور کہتا ہے کہ موت وہاں سے گزر رہی ہے۔ موت کی آواز سن کر چھوٹے بچے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں، جبکہ وہ اُن کے کھلونے جمع کرتا اور سارے کھیل کے میدان پر قبضہ کر لیتا ہے۔ وہ رسیاں باندھ دیتا ہے تاکہ چھوٹے بچے واپس نہ آ سکیں۔ وہ اپنے سے متعلق اس واقعے کے بارے میں بتاتا ہے۔

''میں وہیں زمین پر لیٹا رہا۔ میں خود ہی پھندے میں پھنس گیا۔ میں کوئی گھنٹہ بھر زمین پر لیٹا رہا۔ کچھ دیر بعد ہی مجھے اوپر اُٹھنے کی ہمت ہوئی۔ میں خوف زدہ تھا کہ موت واقعی وہاں آ گئی تھی اور میں بھی مر گیا تھا۔''

لڑکے کو موت آدمی پر یقین نہیں، لیکن وہ ایک شام کو کھیل کے دوران اُس سے خوف زدہ ہونے لگا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ زیر مطالعہ آنے والے بچوں میں سے 15 فیصد نے یہی بتایا کہ وہ شام کے وقت موت کے متعلق سوچا کرتے ہیں۔ اُنہوں نے موت اور تاریکی کے درمیان ایک تعلق فرض کر رکھا ہے۔ موت آدمی اصولی طور پر رات کو ہی باہر نکلتا ہے۔

موت کو شخصی روپ میں تصور کرنے کی ایک اور صورت وہ ہے جب موت کو مردے کے ساتھ شناخت کیا جائے۔ یہاں مردے کی بجائے موت کے لیے لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہ اور بھی غیر معمولی ہے کیونکہ ہنگریئن زبان میں دونوں لفظ بنیادی طور پر مختلف ہیں۔

ڈبلیو ایل (چھ سال آٹھ ماہ):...... ''یہ موت کے بارے میں ایک توہم پرستی ہے کیونکہ یہ رات کے وقت باہر نہیں نکلتی۔ وہ تابوت میں ہوتی ہے۔ موت حقیقت نہیں۔ یہ بات درست نہیں کہ وہ زمین پر گھومتی پھرتی اور لوگوں کو ہلاک کرتی ہے۔''

''تو پھر وہ کہاں ہوتی ہے؟''

''وہ تابوت میں ہوتی ہے، ہمیشہ تابوت میں: موت تابوت میں لیٹی رہتی ہے۔''

یہ بچہ موت کو ایک جداگانہ شخصیت کے روپ میں نہیں مانتا۔ وہ موت اور مردہ لوگوں کو ایک ہی جیسا خیال کرتا ہے۔

اے سی (سات سال گیارہ ماہ):...... ''موت بولنے یا حرکت کرنے سے قاصر ہے۔ میں کئی بار قبرستان گیا ہوں۔ وہاں بہت اُداسی اور خاموشی ہوتی ہے۔''

''اُداسی کس بات کی؟''

''جب میں کسی قبر کو دیکھتا ہوں تو اُس کے اندر موت ہوتی ہے۔ یہ اُداسی والی بات ہے۔''

''کیا قبر میں موت ہوتی ہے یا مردہ آدمی؟''

''ایک مردہ آدمی...... میں نے کبھی موت کو نہیں دیکھا۔ صرف سر اور ہڈیاں دیکھی ہیں۔''

''موت کیا ہے؟''

''ایک مردہ شخص جس کا گوشت باقی نہیں رہ جاتا، بلکہ صرف ہڈیاں ہوتی ہیں۔''

اُس کے جڑواں بھائی کے مطابق: ''موت ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے۔''

''کیا وہ حقیقی ہے یا پھر کسی نے اُس کی اِس طرح کوئی تصویر وغیرہ بنائی تھی؟''

''وہ موجود بھی ہے۔ اگر کوئی شخص مرجائے تو یہ موت ہوگی۔''

مردے کے ساتھ شناخت کی گئی موت دونوں جڑواں بچوں کے لیے وجود رکھتی ہے۔

بی ایم (آٹھ سال دو ماہ): ......''موت باتیں نہیں کرسکتی، کیونکہ وہ زندہ نہیں ہوتی۔ موت کا ذہن نہیں ہوتا۔ موت سوچ بھی نہیں سکتی کیونکہ اُس کا ذہن ہی نہیں ہوتا۔ موت لکھ پڑھ نہیں سکتی کیونکہ اُس میں کوئی روح نہیں ہوتی۔''

''موت اور مردہ شخص کے درمیان کیا فرق ہے؟''

کوئی جواب نہیں۔

''مردے کیا ہوتے ہیں؟''

''جنہیں موت آجائے۔''

''موت کیا ہے؟''

کوئی جواب نہیں۔

لڑکے نے نہایت بچگانہ انداز میں تفصیل سے بیان کیا کہ موت کبھی کام نہیں کرسکتی۔ زندگی اور روح کے بارے میں اُس کے خیالات خلط ملط ہیں۔ وہ موت اور مردے کے درمیان فرق بیان کرنے سے قاصر ہے۔ اُسے موت کا مفہوم نہیں معلوم۔

المختصر، پانچ تا نو سال کی عمروں کے درمیان بچے بالعموم موت کو کسی شخصی روپ میں تصور کرتے ہیں۔ اس گروپ میں زیرِ مطالعہ دو تہائی بچے موت کو ایک علیحدہ شخصیت سمجھتے ہیں۔ یا تو وہ ڈھانچہ آدمی کو حقیقی سمجھتے یا پھر انفرادی طور پر موت آدمی کا اپنا اپنا تصور تشکیل دیتے ہیں۔ اُن کے لیے موت آدمی نظر آنے والا نہیں ہے۔ اس کے دو مطلب بنتے ہیں: (اے)۔ یہ بذاتِ خود غائب ہے، جیسے کہ اُس کا جسم ہی نہ ہو؛ (بی)۔ ہم اُسے دیکھ نہیں پاتے کیونکہ وہ چوری چھپے گلیوں میں گھومتا پھرتا ہے، عموماً رات کے وقت۔ تاہم، اُنہوں نے محسوس کیا کہ وہ شخص موت کو لمحہ بھر کے لیے ضرور دیکھتا ہے جسے وہ لینے آئی ہو۔

موت سے انکار کے پہلے مرحلے کے ساتھ موازنہ میں اس دوسرے مرحلے میں ہم حقیقت کے احساس میں اضافہ دیکھتے ہیں۔ بچہ موت کے وجود اور قطعیت کو تسلیم کرچکا ہے۔ تاہم، وہ موت کی سوچ سے اس قدر گریزاں ہے کہ اُسے اپنے سے باہر نکال پھینکتا ہے۔ ہم میں واقع

ہونے والے ایک عمل سے موت ہم سے باہر ایک حقیقت بن جاتی ہے۔ وہ وجود رکھتی ہے، لیکن ہم سے بہت دور ہے۔ اس کے دور ہونے کے باعث ہماری موت ناگزیر نہیں۔ صرف وہی مرتے ہیں جنہیں موت آدمی پکڑ کر ساتھ لے جائے۔ موت کے پنجے سے بچ جانے والا شخص مرتا نہیں۔

اس مرحلے میں ایک تہائی بچے موت کو ایک شخصی صورت میں تصور اور مردے کے ساتھ شناخت کرتے ہیں۔ یہ بچے ''موت'' اور ''مردے'' کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ یہ تصورِ موت کو فاصلے پر رکھنے کی خواہش کا ایک ثبوت بھی ہے۔ موت بدستور ہم سے باہر ہے اور ہر کسی کو نہیں آتی۔

تیسرا مرحلہ: جسمانی سرگرمیوں کا رک جانا

صرف نو سال اور اُس سے بعد کی عمر میں ہی بچہ موت کو جسمانی زندگی کے خاتمے کے طور پر لیتا ہے۔ جب وہ سمجھ لے کہ موت جسمانی افعال کے رک جانے کا نام ہے تو وہ اس کی ہمہ گیر نوعیت کو بھی تسلیم کرنے لگتا ہے۔

ایف ای (دس سال): ......''اس کا مطلب ہے جسم کا ختم ہوجانا۔ موت ایک ایسی چیز ہے جو ہمارے جسم کو کھا جاتی ہے۔ یہ عمل پھولوں کے مرجھانے جیسا ہے۔''

موت جسم کی تباہی کا نام ہے۔ اس بچی نے فطری کے ساتھ ساتھ اخلاقی وضاحت بھی پیش کی ہے۔

سی جی (نو سال چار ماہ): ......''موت جسم کا خاتمہ ہے۔ موت مقدر میں لکھی ہے۔ ہم دنیا میں اپنی زندگی ختم کردیتے ہیں۔ موت زمین پر زندگی ختم ہونے کا نام ہے۔''

اس لڑکے نے لفظ ''مقدر'' کا باقاعدہ مفہوم میں استعمال کیا ہے۔

ایف جی (نو سال گیارہ ماہ): ......''کھوپڑی موت کا روپ ہے۔ جب کوئی مرجائے تو اُسے دفن کردیا جاتا ہے اور اُس کا جسم مٹی میں مل جاتا ہے۔ ہڈیاں بعد میں گلتی ہیں اور صرف ڈھانچہ ہی باقی رہتا ہے۔ اسی لیے موت کو ایک کھوپڑی کے ذریعہ پیش کرتے ہیں۔ موت ایک ایسی چیز ہے جس سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ جسم مرجاتا ہے اور روح زندہ رہتی ہے۔''

یہ لڑکا جانتا ہے کہ موت کو پیش کرنے کا انداز اصل میں موت نہیں ہے۔ درحقیقت اُس نے یہ بتایا ہے کہ ہڈیوں کا ڈھانچہ موت کی علامت کیسے بن گیا۔ موت ہمہ گیر ہے۔

ایس ٹی (نو سال چار ماہ): ......''موت کیا ہے؟ میرے خیال میں یہ کسی شخص کی زندگی کا

ایک حصہ ہے۔ جیسے سکول۔ زندگی کے کئی حصے ہیں۔ اس کا صرف ایک حصہ دنیاوی ہے۔ جس طرح ہم سکول میں ایک مختلف جماعت میں جاتے ہیں۔ مرنے کا مطلب ایک نئی زندگی شروع کرنا ہے۔ ہرایک کو ایک بار ضرور مرنا ہے، لیکن روح زندہ رہتی ہے۔"

یہاں موت کی ناگزیریت اور ہمہ گیریت کے تصورات غالب ہیں۔

حاصلِ بحث

موت کی نوعیت کے متعلق بچوں کے خیالات میں تین بڑے تدریجی مراحل موجود ہیں۔

تین تا پانچ سال کے بچوں کے پہلے مرحلے میں موت کو کوئی باقاعدہ اور حتمی عمل ماننے سے انکار واضح ہے۔ اُن کے خیال میں موت کا مطلب محض روانگی ہے...... نئے حالات میں ایک نئی زندگی۔ موت کو عارضی بھی تصور کیا گیا۔ درحقیقت موت کے مختلف درجوں کے درمیان تمیز کی گئی ہے۔ بچہ جانتا ہے کہ وہ ایک زندہ ہستی ہے۔ خود پسندانہ انداز میں وہ باہر کی دنیا کو اپنے سے انداز میں لیتا ہے۔ چنانچہ بیرونی دنیا میں بھی وہ ہر چیز...... کیا بے اشیاء اور کیا مردہ لوگ...... کو جان دار ہی سمجھتا ہے۔ وہ جان دار اور بے جان میں تمیز نہیں کر پاتا۔ نتیجتاً اُس کے خیال میں موت بھی زندگی کی حامل ہے۔

پانچ تا نو سال کے بچوں سے منسلک دوسرا مرحلہ موت کو ایک شخصی صورت میں لینے کا ہے۔ موت وجود تو رکھتی ہے لیکن بچے اب بھی اِسے خود سے دور رکھنے کے خواہش مند ہیں۔ اُن کے مطابق صرف وہی لوگ مرتے ہیں جنہیں موت آدمی اپنے ساتھ لے جائے۔ موت ایک ناگزیر امر نہیں بلکہ واقعہ ہے۔ اِس مرحلے میں کچھ تخیلات بھی کارفرما ہیں۔ کچھ بچوں نے "مردے" کے لیے "موت" کا لفظ ہی استعمال کیا۔ وہ بدستور موت کو ایک بیرونی چیز سمجھتے ہیں جو ہر کسی کو نہیں آتی۔ دنیا میں ہرایک تبدیلی کا منبع انسان ہی ہے۔ اگر موت موجود بھی ہے تو شخصی یعنی موت آدمی کے روپ میں۔ موت آدمی ہی موت کا باعث ہے۔ ہمیں اِس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا کہ موت آدمی ایسا کیوں کرتا ہے۔

نو تا دس سال کے بچوں سے متعلقہ آخری یعنی تیسرے مرحلے میں موت کو ایک ایسے عمل کے طور پر تسلیم کیا گیا جو ہم سب میں واقع ہوتا ہے۔ اور جسم کا خاتمہ اِس کا واضح نتیجہ ہے۔ اِس عمر کے

بچے جانتے ہیں کہ موت سے فرار ممکن نہیں۔ اُن کا تصورِ موت نہ صرف زیادہ حقیقت پسندانہ ہے بلکہ عمومی نظریۂ دنیا کا اظہار بھی کرتا ہے۔ بچوں نے دراصل دنیا کے بارے میں اپنے عمومی تصور کا ہی اظہار کیا۔

کلینکل تجربات کی بنیاد پر ایک آخری رائے یہ ہے کہ بچے سے موت کو چھپانا ممکن نہیں، اور نہ ہی ایسا کرنا چاہیے۔ بچے کی موجودگی میں فطری رویہ اُسے اس کی حقیقت فطری انداز میں قبول کرنے میں مدد دیتا ہے۔

ماریا ایچ۔ نیگی

6

کیا موت نقصان دِہ ہے؟

موت اور اس کے اثرات کو سمجھنے کی کوششوں نے کافی تنازعات اور اختلافِ رائے کو جنم دیا ہے۔ یہاں ہم بحث کے چھ پہلوؤں پر غور کریں گے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ کسی شخص کی موت سے کیا مراد ہے؟ یہ بات کافی واضح ہے کہ جب لوگوں کی زندگیاں ختم ہو جائیں تو وہ مر جاتے ہیں، لیکن یہ امر واضح نہیں کہ کسی شخص کی زندگی کے خاتمے سے کیا مراد ہے۔

دوسرا مسئلہ: آیا ایک یا زائد دلائل ''Harm thesis'' کو جھٹلاتے ہیں جس کے مطابق موت مرنے والے فرد کو نقصان پہنچاتی ہے۔ (اس تھیسس پر بحثیں اکثر یہ سوال اٹھاتی ہیں کہ کیا بعد از موت واقعات، اور موت بھی، متوفی کو گزند پہنچا سکتے ہیں یا نہیں۔) یہ دلائل یوں ہیں: (1)- ''لا ذات یا no-self تھیوری'' ایک نفس کی موجودگی سے انکار کرتی ہے۔ لہٰذا اگر ذات یا نفس موجود نہیں تو موت کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ (2)- دوسری دلیل کے مطابق موت کو ضرر رساں کہنا تبھی با معنی ہے جب یہ کہنا با معنی ہو کہ مردہ لوگ زندہ لوگوں سے خراب حالت میں ہوتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا، کیونکہ مرنے والا فرد ہست نہیں رہتا اور نہ ہی فلاح کی کوئی سطح رکھتا ہے۔ (3)- تیسری دلیل کے مطابق موت کو انسانوں کے لیے بری چیز سمجھنا غیر منطقی ہے، کیونکہ ہمارے خیال میں اپنی پیدائشوں سے قبل کا عدم وجود بری چیز نہیں ہوتی، اور موت کے بعد کی نیستی کا موازنہ پیدائش سے پہلے کی نیستی سے کرنے پر ہمیں ایک ہی چیز کے دو عکس نظر آتے ہیں...... ہر اعتبار سے ایک جیسے۔

(4)- اگر موت یا کوئی بعد از موت واقعہ ہمیں نقصان پہنچاتا ہے تو ایسا موت سے پہلے یا پھر بعد میں ہوتا ہے۔ پہلی آپشن لغو (Absurd) ہے، لہٰذا نقصان مردہ حالت میں ہی ہونا چاہیے۔ لیکن کسی شخص کو نقصان تبھی پہنچ سکتا ہے جب وہ کسی قابلِ اعتراض حالت میں ہو۔ اور چونکہ مردے کی ہستی ہی ختم ہو جاتی ہے، اس لیے وہ کسی بھی حالت میں نہیں ہوتا۔ ہر دو صورتوں میں یہ تھیسس غلط ہے۔

تیسرا مسئلہ یہ دکھانے کی کوششوں کے ساتھ تعلق رکھتا ہے کہ مردہ کسی نفع و نقصان سے بالاتر ہونے کے باوجود اُسے نقصان پہنچنے کا تھیسس درست ہے، کیونکہ موت اور کچھ بعد از موت واقعات زندگی کے عمل کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ بے شک موت یا کسی بعد از موت واقعے کی وجہ سے زندگی کو نقصان پہنچنے کا تصور کافی پراسرار لگتا ہے۔ لیکن نقصان کی ایک اور قسم بھی ہے: کوئی واقعہ کبھی کبھی اِس لیے نقصان دہ ہوتا ہے کیونکہ یہ کسی نہ کسی اچھی صورت حال کو واقع ہونے سے روک دیتا ہے۔ یعنی کسی چیز کا زیاں نہیں بلکہ موجود نہ ہونا نقصان کا باعث بنتا ہے۔ اگر ہمارا اُستاد مر جائے تو ہم اُس سے حاصل ہو سکنے والے علم سے محروم ہو جاتے ہیں۔

''Harm thesis'' کو درست مانتے ہوئے ایک چوتھا مسئلہ پیدا ہوتا ہے جس کا تعلق باعثِ نقصان موت کی نوعیت اور مختلف بعد از موت واقعات سے ہے، اور اِس بات سے بھی کہ آیا یہ نقصانات بدقسمتی پر دلیل ہیں۔ یہ واقعات مخصوص اچھائیوں کو ہماری پہنچ سے باہر کر کے ہمیں نقصان پہنچاتے ہیں، لیکن ہمیشہ ہی ایسا نہیں ہوتا۔ مثلاً اپنے پاس جادو کا چراغ موجود نہ ہونے کے باعث میں اپنی تین خواہشات پوری نہیں کر سکتا، لیکن یہ کہنا حماقت ہوگی کہ میں جادو کا چراغ نہ ہونے کے باعث نقصان میں ہوں۔

پانچویں مسئلے کا تعلق اِس بات سے ہے کہ آیا تمام اموات بدقسمتی ہیں یا صرف کچھ ایک۔ تھامس نیگل اور برنارڈ ولیمز کے درمیان ایک تنازعہ اِس حوالے سے بہت دلچسپ ہے۔ تھامس کے مطابق موت ہمیشہ بری ہوتی ہے کیونکہ زندگی کا جاری رہنا ہمیشہ اچھی چیزوں کو قابلِ رسائی بناتا ہے۔ جبکہ برنارڈ کے خیال میں بے شک قبل از وقت موت بدقسمتی ہے، لیکن ہمارا لافانی نہ ہونا اچھی چیز ہے، کیونکہ ہم ہمیشہ ہی اب والی حالت میں نہیں رہ سکتے اور نہ ہی زندگی کے ساتھ ہمیشہ با معنی انداز میں منسلک رہنے کے قابل ہیں۔

چھٹا اور آخری مسئلہ یہ ہے کہ آیا موت کی حیثیت گھٹائی جا سکتی ہے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ذات یا اچھی زندگی کے بارے میں اپنے تصور میں ترمیم کرنے اور اپنے رویے بدلنے کے ذریعہ ہم موت سے پہنچنے والے نقصان کو کم یا ختم کر سکیں۔ درحقیقت ہمارے خیالات اور رویوں کی توافق پذیری اپنے ساتھ پیش آنے والی کسی بھی چیز کی نقصان دہی کو گھٹانے یا ختم کرنے کی ایک راہ ہو سکتی ہے...... جیسا کہ کچھ قدیم نظریہ سازوں، مثلاً گوتم بدھ اور شاید اپی قورس نے بھی رائے دی۔ لیکن یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اگر یہ کوششیں انتہائی حدود کو پہنچ جائیں تو نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتی ہیں۔

آئندہ صفحات میں ہم اِن اہم سوالات پر غور کریں گے:

- موت کیا ہے؟
- موت کس طرح نقصان نہیں پہنچاتی؟

1- موت کیا ہے؟

''موت'' کی اصطلاح مبہم ہے۔ جینے کی قابلیت کو ختم کر دینے والی بیماری سے گزرنا ایک چیز ہے، اور زندگی کا خاتمہ دوسری، اور زندگی ختم ہو جانے کی حالت تیسری۔ پہلی عمل، دوسری واقعہ اور تیسری ایک حالت ہے۔ ''موت'' سے یہ تینوں یا اِن میں سے کوئی ایک حالت مراد ہو سکتی ہے، اور آخری دو کا مفہوم یکجا ہونا خاص طور پر آسان ہے۔ گڑبڑ سے بچنے کے لیے زندگی ختم ہونے کے واقعہ کے لیے ''موت'' یا مرنے کی اصطلاح استعمال کرنا مددگار ہے۔ زندگی ختم ہونے کی حالت کے لیے ''مرا ہوا'' کہنا باعث سہولت ہے۔

کم از کم مؤخر الذکر دو طریقوں میں موت غیر واضح ہے۔ اول، زندگی کا تصور قطعاً واضح نہیں، اور زندگی کے مفہوم کے متعلق گڑبڑ کا شکار ہونے کے باعث ہم زندگی کے خاتمے کے مفہوم کے متعلق بھی گڑبڑ میں پڑ جائیں گے۔ دوم، یہ بات کچھ حد تک غیر قطعی لگتی ہے کہ آیا زندگی کی عارضی معدومیت موت کے لیے کافی ہے یا نہیں، یا آیا موت کا مطلب صرف زندگی کی دائمی معدومیت ہی ہے۔ عملی اعتبار سے بات کی جائے تو جب کوئی مخلوق زندگی سے عاری ہو جائے یا معدوم بن جائے تو یہ حالت دائمی ہوتی ہے؛ چنانچہ عام استعمال میں 'موت' کے عارضی یا مستقل

ہونے کے درمیان تمیز نہیں کرنا پڑتی۔ لیکن فکری تجربات میں ہم زندگی کے عارضی فقدان اور دائمی معدومیت کے درمیان امتیاز کر سکتے ہیں۔ مثلاً فرض کریں کہ میں منجمد ہو جاتا ہوں اور بعد میں میرے اندر دوبارہ جان پڑ جاتی ہے، جیسا کہ سادہ نامیاتی اجسام کے معاملے میں اکثر ہوتا ہے: آپ کہنے پر مائل ہوں گے کہ میں منجمد ہونے کے بعد زندہ یا ہست نہیں رہا تھا۔ یا مستقبل میں لیجانے والی کسی مشین کا تصور کریں جو مجھے ایٹموں میں تقسیم کر دیتی اور پھر بعد میں پہلے کے مطابق دوبارہ جوڑ دیتی ہے۔ بہت سے لوگ کہیں گے کہ میری زندگی ختم نہیں ہوئی اور دوبارہ جڑنے پر جاری رہی۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ جب مجھے ایٹموں کی صورت میں سٹور کیا گیا تھا تو تب میں زندہ نہیں تھا۔ اِن صورتوں میں ہماری لسانی بصیرتیں ''موت'' کی اصطلاح کے قابلِ نفاذ ہونے کے حوالے سے کوئی قطعی فیصلہ نہیں دیتیں۔ ایک طرف یہ کہنا موزوں لگتا ہے کہ میرا جسم بالکل منجمد یا ایٹموں میں تقسیم ہو جانے پر میری زندگی ختم ہو گئی، کیونکہ ''موت'' کی اصطلاح ایسے معاملے میں لاگو ہوتے نظر آتی ہے جب کسی مخلوق کی زندگی ختم ہو جائے۔ دوسری طرف میری موت سے انکار کرنا درست لگتا ہے، کیونکہ میری زندگی کی معدومیت صرف عارضی ہے، کیونکہ انجامِ کار میری زندگی بحال ہو جاتی ہے، جبکہ کسی مخلوق کا مستقل طور پر معدوم ہو جانا ہی ''موت'' کے زمرے میں آتا ہے۔ بایں ہمہ، ایک مرتبہ ہم اپنی مقابل بصیرتوں کو کام کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیں تو قرین قیاس طور پر اِس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ ''موت'' کی اصطلاح کا اطلاق دائمی خاتمے یا معدومیت پر ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمیشہ کے لیے خاتمے کا نام موت ہے۔

کچھ مذہبی روایات کے مطابق جسموں کے انتشار پر لوگوں کا مستقل طور پر معدوم ہونا ضروری نہیں۔ حیات بعد الموت ممکن ہونے کے متعلق دو مرکزی تصورات پائے جاتے ہیں۔ اول، ہماری طبعی موت محض عارضی ہو سکتی ہے، کیونکہ خدا ہمارے جسموں کو دوبارہ زندہ کرے گا۔ دوم، ہم یہ فرض کر کے عارضی معدومیت سے بھی گریز کر سکتے ہیں کہ ہم غیر مادی (غیر طبعی) روحیں ہیں جو جسم کے مرنے پر بھی زندہ رہتی ہیں۔ (ہندومت کی مقدس کتاب ''گیتا'' میں یہی نکتۂ نظر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔) حیات بعد الموت کے پہلے تصور کے حامی لوگ ''موت'' کا مطلب جسم کا انتشار بتاتے ہیں، اور دوسرے تصور کے حامی لوگوں کے خیال میں ''موت'' کا مطلب روحوں کا جسم سے نکل جانا ہے۔ لیکن غالباً یہ دونوں گروہ تسلیم کریں گے کہ ہماری دائمی

معدومیت کا نام "موت" ہے (چاہے وہ موت کو ناگزیر ماننے سے انکار ہی کریں)۔

ہیئت کی تبدیلی بہ مقابلہ اختتام:

کیا ہمارے جسم منتشر ہونے پر ہماری ہستی مطلق اختتام پر پہنچ جاتی ہے؟ یا موت کے بعد ہیئت میں کوئی تبدیلی واقع ہوتی ہے؟ مؤخر الذکر کے ثبوت کے طور پر آپ نہایت بیمار لوگوں کے قصے سنا سکتے ہیں جو کبھی کبھی "جسم-سے-باہر" تجربات بیان کرتے ہیں۔ ان تجربات میں وہ اپنے جسموں سے باہر سفر کرتی ہوئی روحیں معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس ڈیٹا کا اِس قضیے کے ساتھ سمجھوتہ کروایا جا سکتا ہے کہ موت ہماری مکمل نیستی ہے، اور "جسم-سے-باہر" تجربات محض گمراہ کن ہیں۔ اس متبادل کی حمایت میں ہم یہ امر پیش کر سکتے ہیں کہ نہایت تندرست لوگوں میں بھی یہ تجربات ادویات کے ذریعہ عمل میں لائے جا سکتے ہیں۔ اگر ہم یہ فرض نہ کر لیں کہ ادویات کے باعث روحوں کے بندھن ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور ادویات کا اثر ختم ہونے پر وہ واپس آ جاتی ہے، تو اس قسم کی آزمائشوں سے پتا چلتا ہے کہ "جسم-سے-باہر" تجربات محض التباسی ہیں (چاہے وہ قریب المرگ لوگوں کو ہی پیش آئیں)۔ نیز، سائنس دان کبھی بھی روحوں کا سراغ لگانے کے قابل نہیں ہو سکے، اور اِس قابلیت کا دعویٰ کرنے والے بہت سے لوگ فراڈ ثابت ہوئے۔ اس قسم کے تجربی پہلوؤں سے قطع نظر فلسفیانہ اور مذہبی ادب میں بھی حیات بعد الموت کے لیے مزید دلائل موجود ہیں۔

موت اور شناخت:

اگر غیر مادی روحیں وجود نہ بھی رکھتی ہوں تو افراد کی موت کو اُن کے جسموں کی موت کے ساتھ شناخت کرنے کی معقول وجہ موجود ہے۔ کیونکہ اپنے کسی عضو کی موت پر آپ زندہ رہتے ہیں، اور اپنی موت پر بھی آپ کا جسم زندہ رہ سکتا ہے۔ "آپ" صرف تبھی مرتے ہیں جب آپ کی شناخت یا پہچان تباہ ہو جائے۔ چنانچہ ہم کسی شخص کے مرنے کی وضاحت صرف تبھی کر سکتے ہیں جب اُس شخص کی شناخت کے بنیادی عناصر کی وضاحت کر دیں۔ یہ ایک پیچیدہ معاملہ ہے، جس کے کافی بڑے حصے کو بلا تجزیہ ہی چھوڑنا پڑے گا۔ لیکن چند نکات قابل ذکر ہیں۔

اول، ڈیرک پارفٹ جیسے نظریہ دانوں نے جان لاک کے کام کی بنیاد پر اِس نکتۂ نظر کو کافی استعمال کیا کہ یادوں اور کرداری نقوش جیسے نفسیاتی اوصاف (جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ

بدلتے رہتے ہیں) ہماری شناختوں میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ شناختوں کے دو الگ مگر باہم مربوط نظریات ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہیں: "شناخت بطور ربط" تقاضا کرتا ہے کہ اگر آپ وہی شخص رہیں تو وقت گزرنے پر آپ کا نفسیاتی پہلو تبدیل نہ ہو۔ جبکہ "شناخت بطور تسلسل" تب تک آپ کے پروفائل میں تبدیلیوں کی اجازت دیتا ہے جب تک وہ تدریجی ہوں۔ پہلے نظریے کے مطابق ہم اپنی شناختوں کو درجہ بدرجہ کھو سکتے ہیں؛ شناخت ایک درجے کا معاملہ ہے، کیونکہ ہم اپنے نفسیاتی اوصاف متنوع درجات میں قائم رکھتے ہیں۔ دوسرے نظریے کے مطابق شناخت سب کچھ ہے یا کچھ بھی نہیں؛ ہم یا تو وہی شخص رہ سکتے ہیں یا نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ اگر ہم شناخت کو بطور ربط لیں تو یہ نتیجہ اخذ کریں گے کہ موت بھی مراحل میں آتی ہے، اور اُس وقت مکمل ہوتی ہے جب ہمارے نفسیاتی پروفائلز بہت زیادہ تبدیل یا تباہ ہو جائیں۔ شناخت کو بطور تسلسل لینے سے ہم یہ سوچنے کی جانب راغب ہوں گے کہ موت سب کچھ ہے یا کچھ بھی نہیں...... کہ لوگ اچانک اور گہری نہیں بلکہ تدریجی نفسیاتی تبدیلیوں کے ذریعہ زندہ رہتے ہیں۔

دوم، موت کے تصور اور موت کے لیے کسوٹی کے درمیان تمیز کرنا اہمیت کا حامل ہے۔ تصورِ موت کہتا ہے کہ شخصی زندگی کا خاتمہ موت ہے۔ اس کے برعکس موت کی کسوٹی ایک حالت بیان کرتی ہے جس کے تحت کسی شخص کی موت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ موت کے لیے روایتی کسوٹی کے مطابق جب آپ کا دل اور پھیپھڑے کام کرنا بند کر دیں تو آپ مر جاتے ہیں (نہ کہ تنفس اور دل کی کارکردگی کا رک جانا)۔ ایک زیادہ حالیہ کسوٹی دماغ کی موت ہے، کیونکہ دماغ ہی نفسیاتی خواص کا مرکز و منبع ہے۔ دماغ کی موت کی کسوٹی زیادہ درست ہے، کیونکہ دماغ کے مردہ ہو جانے کے بعد بھی تنفس اور خون کی گردش کو جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے مصنوعی طور پر جاری رکھا جا سکتا ہے۔ قانونی اور طبی حوالے سے عموماً دماغ کی موت کو ہی کسوٹی بنایا جاتا ہے۔ مثلاً عطیہ میں دیا ہوا کوئی عضو اُس وقت تک الگ نہیں کیا جاتا جب تک دماغ کی موت نہ واقع ہو جائے۔ لیکن دماغ کے مخصوص حصے زندہ ہونے کے باوجود کسی شخص کو مردہ تصور کرنے کی معقول وجہ موجود ہے۔ شخصیت کا تعلق قریبی طور پر بالائی دماغ (سیریبرل کورٹیکس) کے ساتھ ہے۔ لہٰذا بالائی دماغ کو موت کی کسوٹی بنانے کی حمایت کی جا رہی ہے جس کے مطابق بالائی دماغ کے مردہ ہو جانے پر ہی موت واقع ہوتی ہے۔

2۔ موت کس طرح نقصان دِہ نہیں؟

عموماً زندگی کی قدر کرنے والے لوگ "harm thesis" نامی نکتۂ نظر قبول کر لیتے ہیں: مرنے والے کے لیے معدومیت بری چیز ہے (کم از کچھ صورتوں میں)، اور اِس مفہوم میں وہ "نقصان" اُٹھاتے ہیں۔ یہ جاننا اہمیت کا حامل ہے کہ یہ تھیسس کیسے بنا۔ فرض کریں کہ ہم زندگی سے محبت کرتے اور دلیل دیتے ہیں کہ زندگی اچھی ہے اس لیے مزید جینا اچھا ہوگا۔ تب ہماری سوچ موت کی جانب آتی ہے اور ہم اِسے برا قرار دیتے ہیں: زندگی جتنی بہتر ہوگی موت اُتنی ہی زیادہ بری لگے گی۔ اس نقطے پر ہم انسانی حالت کو ایک المناک پہلو یعنی موت سے ملعون قرار دینے کے خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔ درحقیقت اس کی بنیاد یہ مفروضہ ہے کہ مزید زندگی بہتر ہو گی۔ لیکن اِس قسم کی تشفیاں ہر کسی کے لیے نہیں۔ بہرصورت یہ نتیجہ اخذ کرنا کافی سنگ دلی ہوگی کہ انسان ایک الم ناک پہلو رکھتا ہے۔ اِس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ نظریہ سازوں نے ہزاروں برس کے دوران harm thesis کو جھٹلانے کی کوشش کی ہے۔ آیئے اِس پر غور کرتے ہیں۔

harm thesis کے لیے پہلا چیلنج یہ ہے کہ کیا ہم موت کو اِن بنیادوں پر مسترد کرتے ہیں کہ یہ ہمارا وجود چھین لیتی ہے۔ گوتم بدھ کے مطابق موت کو زندگی کے خاتمہ کا باعث قرار دینا غلطی ہے۔ اگر اُس کا کہنا درست ہے تو ہمارا اعتراض قابلِ بحث ہے۔ لیکن گوتم نے موت کو ہماری نیستی کی وجہ کیوں نہ مانا؟ اِس کی وجہ حیات بعد الموت کا نہ ہونا نہیں ہے۔ بلکہ اُس کا خیال ہے کہ کوئی ذات (Self) موجود نہیں اور نہ ہی کبھی رہی ہے۔ ذات کا نظریہ ناقص ہے، لہٰذا یہ سوال کرنا بے معنی ہے کہ آیا ذاتیں معدوم ہو جاتی ہیں یا نہیں؛ اور نیستی سے خوف زدہ لوگ گڑبڑا جاتے ہیں۔ دوسری طرف گوتم نے نظریۂ لاذات کی بنیاد روحوں یا جواہر کے نظریۂ پر تشکیک پر رکھی۔ تاہم، موت سے نقصان کے تھیسس کو پہلا چیلنج نتیجہ خیز نہیں، کیونکہ شخصی شناخت کا نظریہ کسی بھی مخصوص نظریۂ جوہر کے ساتھ منسلک نہیں۔ ہمارے نفسیاتی اوصاف اور نتیجتاً ہماری شناختیں دماغ پر منحصر ہونے کے باوجود اِس کی مادی قلب ماہیئت میں قائم رہتی ہیں۔

موت سے نقصان کے تھیسس کو درپیش دوسرا چیلنج یہ دعویٰ ہے کہ مردہ حالت میں ہم زندہ حالت کی نسبت بدتر ہوتے ہیں۔ لیکن مردہ حالت میں زیادہ خراب ہونے کا مطلب ہوا کہ حالت کی اچھائی یا برائی کو ناپنے کا معیار مرنے کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔ تاہم، مردے اِس قسم کے کسی

بھی معیار پر پورے نہیں اُترتے کیونکہ وہ موجود ہی نہیں ہوتے۔ بدیہی طور پر ہم موت کے باعث نقصان ہونے کا دعویٰ کر کے ایک مصیبت میں پھنس جاتے ہیں۔

تیسرا چیلنج یہ دکھانے کی کوشش ہے کہ موت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی معدومیت کی حالت بری نہیں۔ اپی قورس کے شاگرد لوکریٹیس کی پیش کردہ دلیل کے مطابق ہم پیدائش سے پہلے کی حالت پر غور کر کے اِسے ثابت کر سکتے ہیں۔ "پیچھے مڑ کر، اپنی پیدائش سے پہلے کے وقت کو دیکھیں۔ اِس طرح فطرت ہمارے سامنے موت کے بعد اپنے مستقبل کا عکس پیش کرتی ہے۔ کیا یہ بہت سنگ دلانہ اور غم ناک ہے؟" لوکریٹیس کا مقصد غالباً صرف یہ دلیل دینا تھا کہ موت کی حالت "بُری" نہیں، کیونکہ ہم حالتِ موت کے خلاف صرف ایک یہی بات کہہ سکتے ہیں کہ یہ معدومیت ہے، جو حقیقتاً قابلِ اعتراض چیز نہیں (جیسا کہ پیدائش سے پہلے کی معدومیت کے متعلق ہمارے رویے سے ظاہر ہے)۔ پیدائش سے پہلے کا عدم ہمیں اِس لیے پریشان نہیں کرتا کیونکہ اِس کے بعد ہم وجود میں آتے ہیں۔ اگر موت کے بعد بھی کوئی وجود ہوتا تو ہم پیدائش کے بعد کی معدومیت کے متعلق بھی زیادہ پریشان نہ ہوتے۔ اگر ہم مثلاً مستقبل میں لیجانے والی مشینوں کے ذریعہ اپنے وجود سے ماورا ہو سکیں تو درمیانی معدومیت کے وقفے ہمیں زیادہ اَپ سیٹ نہیں کریں گے۔

ایک اور چیلنج اُس وقت پیش آتا ہے جب ہم اُس مخصوص وقت پر غور کریں جس کے دوران ہم موت کے پیش کردہ ممکنہ نقصان سے گزرتے ہیں۔ اپی قورس "Letter to Menoeceus" میں کہتا ہے: "خوف ناک ترین برائی یعنی موت ہمارے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی، کیونکہ جب ہم موجود ہوں تو موت نہیں ہوتی، اور جب موت آئے تو ہم موجود نہیں ہوتے۔"

کوئی بھی بعد از موت واقعہ ہمیں متاثر نہیں کرتا۔ تاہم، موت ہمیں ضرور متاثر کر سکتی ہے۔ متاثر ہونے کے لیے ہمارا "موجود" ہونا ضروری ہے۔ یہ تھیسس اِس امکان کو ختم کر دیتا ہے کہ موت واقع ہونے کے "بعد" ہمیں متاثر کرتی ہے۔ لیکن یہ امکان بہرحال موجود رہتا ہے کہ موت اپنے "واقع ہونے" کے موقعہ پر ہمیں متاثر کرتی ہے۔

ڈاکٹر سوسن بلیک مور

7
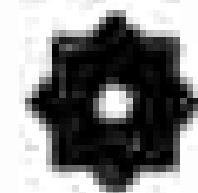
زندگی اور موت کی جبلتیں

فلسفہ کے ابتدائی دور سے لے کر ہمارے جدید دور تک، سقراط سے لے کر کانٹ تک، یقین کیا جاتا رہا کہ استدلال یا منطق ہی انسان کا جوہر تھی، منطق انسان کا امتیازی وصف تھی، منطق نے ہی انسان کو باقی ساری دنیائے حیوانات سے مختلف بنایا۔ فلسفیوں نے کہا کہ انسان ایک منطقی روح رکھتا ہے، لہٰذا انسان خدا سے مشابہ تھا: انسان فطرت کا بادشاہ تھا، وہ نیم جانور اور نیم خدا تھا۔ بہت سے فلسفیوں نے کہا کہ انسان کو اپنی منطقی روح پر توجہ دینی چاہیے، نہ کہ حیوانی اُمنگوں پر؛ انسان کو چاہیے کہ اپنے حیوانی جز پر منطقی جز کو حکمران بنائے۔ مثلاً کانٹ کے مطابق انسان کو علم کی جستجو کرنی چاہیے...... خالص، بے لوث علم۔ اپنے سے پہلے کے فلسفیوں کی طرح کانٹ نے بھی انسان کو باقی ساری حیوانی دنیا سے الگ کیا؛ اُس نے کہا کہ انسان مقصود بالذات تھا، جبکہ جانور محض وسیلہ تھے۔

شوپنہاور نے خود کو اِن خیالات سے نجات دلائی، مگر محض جزوی طور پر۔ شوپنہاور نے بیش تر انسانی افعال کا تعلق لاشعور، "ارادے" کے ساتھ جوڑا؛ یوں اُس نے منطقی روح اور استدلال کی اہمیت گھٹائی۔ لیکن شوپنہاور نے سوچا کہ انسان ارادے (Will) کی تردید، یعنی خود کو لاشعور سے جدا کرسکتا ہے۔ اُس کے مطابق یہ زندگی کا مقصد ہے: ارادے کی تردید کرنا، اور یوں ایک ولی یا جوہر قابل بن جانا۔ اخلاقی اور عقلی میدان میں عظیم ترین کامیابیاں، شوپنہاور کی نظر میں، عقل محض (خالص عقل)، ذہن کو لاشعور سے علیحدہ کیے جانے کی پیداوار ہیں۔

نطشے اور فرائیڈ شوپنہاور سے ایک قدم آگے بڑھے۔ اُنہوں نے شوپنہاور سے اتفاق کیا کہ انسان حیوانوں کے ساتھ بہت کچھ مشترک رکھتا ہے، کہ شعور محض لاشعور کے اوپر چھائی ہوئی ایک جھلی ہے، اور یہ کہ لوگ لاشعوری قوتوں سے تحریک پاتے ہیں...... بالخصوص ایک طاقت ور جنسی تحریک سے۔ لیکن اُنہوں نے اِس معاملے میں شوپنہاور سے اختلاف کیا کہ انسان ارادے کی تردید کرسکتا یا لاشعور سے تعلق توڑ سکتا ہے۔ شوپنہاور نے کہا تھا کہ ولی اور جینیئس نے ہستی کی ایک اعلیٰ تر سطح حاصل کی، اپنی حیوانی فطرت سے ماورا ہوئے اور عقل محض کی اقلیم میں پہنچے۔ نطشے اور فرائیڈ نے دلیل دی کہ ولی اور جینیئس سمیت تمام انسان لاشعوری قوتوں سے تحریک یافتہ ہیں۔

نطشے اور فرائیڈ نے کہا کہ عقل محض وجود نہیں رکھتی، کہ عقل ہمیشہ سے جسم اور لاشعوری قوتوں کے تابع تھی، اور یہ کہ عظیم آرٹسٹوں اور فلسفیوں نے بھی لاشعوری قوتوں کا اثر قبول کیا۔ نطشے اور فرائیڈ کے مطابق انسان نیم جانور اور نیم خدا نہیں، انسان حیوانی دنیا کا حصہ ہے اور اپنی حیوانی فطرت سے ماورا نہیں ہوسکتا۔ ثقافت اور مذہب کے حلقے میں انسان کی بلند ترین اڑانیں بہتر اور زیادہ خوش گوار زندگی گزارنے کی کوششیں تھیں۔ نطشے اور فرائیڈ منطقی مفکرین تھے، اُنہوں نے مشرقی فلسفہ، باطنی مسالک یا روحانی اُمنگوں کو زیادہ وقعت نہ دی۔ اُن کا انسانی فطرت کا تصور استخراجی (Reductive) ہے: وہ انسانی فطرت کو محض حیاتیاتی تحریکوں تک محدود کردینا چاہتے ہیں۔ تاہم، یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ نطشے اور فرائیڈ نے کافی اہم حصہ ڈالا اور انسانی جبلتوں کے بارے میں اُن کے خیالات انسانی فطرت کی تفہیم میں مدد دے سکتے ہیں۔ حیاتیاتی نقطۂ نظر میں کامل سچائی موجود نہیں ہوسکتی، لیکن یہ سچائی کا ایک حصہ ہے۔ سچائی کے اس حصے، حیات و موت کی جبلتوں کو سمجھنا ہی اِس باب میں ہمارا مقصد ہے۔

فرائیڈ کا نکتۂ نظر:

شوپنہاور نے کہا کہ تمام نامیاتی زندگی ایک ہی اساسی "ارادہ" یا جبلت رکھتی ہے...... جینے کا ارادہ۔ نطشے نے کہا کہ تمام نامیاتی زندگی محض جینے سے کچھ زیادہ کرنے کی کوشش کرتی ہے، یہ خود کو فروغ دینے، نمایاں کرنے اور اپنی قوت کو بڑھانے کی کوشش کرتی ہے۔ نطشے نے شوپنہاور کی ارادۂ حیات کی تھیوری کی جگہ اپنی قوت کی خواہش (Will to Power) کی تھیوری پیش کی۔ لیکن نطشے کی

تھیوری میں کچھ خامیاں ہیں۔ اگر چہ یہ نوع انسانی کی وضاحت کافی بہتر انداز میں کر سکتی ہے، لیکن حیوانات و نباتات کی وضاحت سے قاصر ہے۔ یہ کہنے کے لیے لفظ ''قوت'' کے معنی کو مسخ کرنا لازمی ہے کہ حیوانات اور نباتات قوت کی خواہش کے حامل ہیں۔ مزید برآں، قوت کی خواہش کی تھیوری انانیت پسندانہ تحریکات کی اہمیت کو بہت زیادہ بڑھا دیتی اور غیر انانیت پسندانہ، بے غرضانہ اُمنگوں کو نظر انداز کر جاتی ہے۔ یہ بے غرضانہ اُمنگیں ساری نامیاتی دنیا میں ملتی ہیں...... نباتات، جانور اور انسان۔ وہ خاص طور پر سماجی جانوروں، مثلاً چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں میں عیاں ہیں۔

فرائیڈ کی حیات اور موت کی جبلتوں کی تھیوری نطشے کی تھیوری والی خامیاں نہیں رکھتی۔ فرائیڈ کی تھیوری انسان کو باقی نامیاتی دنیا کے بندھنوں سے آزاد کر دیتی ہے۔ فرائیڈ کے مطابق ساری نامیاتی زندگی اولین نامیاتی زندگی کا تسلسل ہے، چنانچہ ساری نامیاتی زندگی باہم مربوط ہے۔ نباتات، حیوانات اور انسان ایک ہی جیسی بنیادی جبلتیں رکھتے ہیں...... ایک جبلتِ حیات اور ایک جبلتِ موت۔ فرائیڈ کی تھیوری کے مطابق جبلتِ حیات ہر نامیاتی جسم کو نہ صرف اپنی بلکہ اپنے پورے خاندان، گروہ یا نوع کی افزائش اور فروغ پر مائل کرتی ہے۔ ہر نامیاتی جسم کچھ بے غرضانہ تحریکات کا حامل ہے۔

تائی چین کا نکتۂ نظر:

مغربی فلسفہ منطق پر اصرار سے جبلت پر اصرار کی جانب آیا، جبکہ چینی فلسفہ بھی اِسی راہ پر گامزن نظر آتا ہے۔ کنفیوشسی مکتبۂ فکر نے عقل یا منطق کی اہمیت پر زور دیا تھا، لیکن اٹھارہویں صدی کے مفکر تائی چین نے جبلت کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ تائی چین کے مطابق کوئی عقلِ محض موجود نہیں، جذبے اور جبلت سے لاتعلق کوئی عقل موجود نہیں۔ تائی چین نے اخلاقیات کے ڈانڈے کسی مجرد نیکی یا انصاف کے تصور سے نہیں بلکہ انسانی کی بنیادی تحریکات اور جبلتوں کے ساتھ ملائے۔ اُس کے خیال میں یہ بنیادی تحریکات محض خود غرضانہ اور انانیت پسندانہ نہیں۔ نیکی اِن بنیادی تحریکات کو دبانے کی بجائے اُنہیں متوازن انداز میں استعمال کرنے کا نام ہے۔

مسرت اور جنس:

مسرت اور جنس کو عموماً ایسے مقاصد کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جن کے لیے انسانی فطرت

جدوجہد کرتی ہے۔ فرائیڈ نے اپنے کیریئر کی ابتدا میں اِس ''اصولِ مسرت'' پر روشنی ڈالی اور کہا کہ انسان کا اولین مقصد مسرت کا حصول تھا، اور یہ کہ جنس انسان کی اولین مسرت تھی۔ لیکن اپنے کیریئر میں آگے چل کر فرائیڈ نے جبلتِ حیات اور جبلتِ موت کی تھیوری پیش کرتے ہوئے دلیل دی کہ مسرت اور جنس انسان کے اولین مقاصد نہیں۔

جنسی مسرت وہ چارہ ہے جس کے ذریعہ انسان تولید کی جانب مائل ہوتا ہے۔ جبلتِ حیات انسان کو جنسی مسرت کا انعام دینے کے ذریعہ انسان سے اپنا مقصد...... یعنی تولید...... پورا کرواتی ہے۔ فرائیڈ کے مطابق انسان بھی بالکل حیوانات اور نباتات کی طرح حیات اور موت کی جبلتوں کی حامل مخلوق ہے اور جبلتِ حیات انسان، حیوانات اور نباتات کو تولید کی جانب راغب کرتی ہے۔ تولید مقصد ہے، مسرت اور جنس محض اِس کے ذرائع ہیں۔ فرائیڈ کے مطابق جب انسانی فطرت کو اُس کے جوہر میں دیکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ انسان کی بنیادی تحریکات بالکل جانوروں اور پودوں والی ہیں۔ حیات اور موت کی جبلتیں تمام نامیاتی حیات کو تحریک دینے والی قوتیں ہیں۔

جبلتِ موت:

جبلتِ حیات کا اثر ہمارے بہت سے افعال، بلکہ عین ہستی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف جبلتِ موت پس منظر میں رہتی ہے اور عموماً کھل کر سامنے نہیں آتی۔ تاہم، چند ایک نظریہ سازوں نے جبلتِ موت کی موجودگی کا سراغ لگایا ہے۔ مثلاً ینگ نے کہا کہ ''یوں سمجھ لیں کہ جیسے لبیڈو محض آگے کی جانب ایک غیر مختتم حرکت نہ ہو...... سورج کی طرح لبیڈو بھی ہمیشہ اپنا زوال چاہتی ہے۔ رومن فلسفی سینیکا نے بھی جبلتِ موت کا ذکر کیا: ''آپ کو اُس جذبے سے گریز کرنا چاہیے جس نے بہت سے لوگوں کو جکڑ رکھا ہے۔ وہ جذبہ مرنے کا ہے۔'' اور ڈکنز جبلتِ موت کے بارے میں یوں لکھتا ہے: ''وبا کے موسموں میں ہم میں سے کچھ لوگ بیماری کے لیے ایک خفیہ کشش محسوس کرتے ہیں...... وہ لوگ بیماری کا شکار ہو کر مرنے کی ایک خوف ناک رغبت رکھتے ہیں۔'' نطشے کے الفاظ میں: ''موت کے خواہش مند ہجوم کی خوف ناک پکار ''موت زندہ باد'' یورپ بھر میں سنی گئی۔''

طاقت کا توازن:

ہر نامیاتی جسم جبلتِ حیات اور جبلتِ موت کا امتزاج ہے۔ جبلتِ موت جبلتِ حیات کے ساتھ طاقت میں شریک ہونے کی وجہ سے عموماً اپنے سے متعلقہ نامیے کی موت نہیں لاتی۔ جبلتِ موت آپ کو جینے سے نہیں روکتی، لیکن یہ فعالیت کو ضرور متاثر کرتی ہے...... بالکل اُسی طرح جیسے موٹے مختے کسی ایتھلیٹ کو دوڑ میں حصہ لینے سے تو نہیں روکتے، لیکن اُس کی رفتار ضرور کم کر دیتے ہیں۔

موت کی پیش بینی:

لوگ اکثر اپنی موت کے وقت کی پیش بینی کر لیتے ہیں۔ اس کی وجہ جزواً تو یہ حقیقت ہے کہ وہ خود موت کی خواہش رکھتے ہیں۔ اُن میں موت کی جبلت موجود ہوتی ہے جو انہیں اپنے اختتام تک لاتی ہے۔ اسی لیے وہ اپنی موت کی پیش بینی کر سکتے ہیں۔

ابرہام لنکن نے پیشگی جان لیا تھا کہ اپنے دوسرے عرصۂ صدارت کے دوران اُسے قتل کر دیا جائے گا۔ اگرچہ بہت سے لوگوں نے اُسے قتل کے خلاف کچھ حفاظتی تدابیر اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا، لیکن وہ نہ مانا؛ بلکہ یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ قتل ہونے سے گریز کرنے کی بجائے خود اس کو دعوت دے رہا تھا۔ تیس برس کی عمر میں واں گاگ نے پیش گوئی کی کہ وہ چھ تا دس سال بعد مر جائے گا؛ وہ 37 برس کی عمر میں مرا۔ 29 سال کی عمر میں کیرکیگارڈ نے لکھا: ”مجھے لگتا ہے کہ میری زندگی زیادہ نہیں، اور نہ ہی کبھی میں نے طویل زندگی کی توقع کی ہے۔“ وہ بیالیس سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ جان کیٹس نے صحت مند حالت میں ہی پیش بینی کر لی تھی کہ وہ جوان عمر میں مر جائے گا۔ وہ صرف 25 سال کی عمر تک زندہ رہا۔ جب بائرن یونان جانے کی تیاری کر رہا تھا تو اُس نے محسوس کر لیا تھا کہ وہاں سے واپس نہیں آ سکے گا۔ وہ 36 برس کی عمر میں یونان میں ہی مر گیا۔

لوگ جب اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق سب کچھ کر لیں تو موت کی خواہش کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً ابرہام لنکن نے محسوس کیا ہوگا کہ سول جنگ جیت لینے کے بعد اُس کا کام مکمل ہو گیا ہے، اور بائرن کو لگا ہوگا کہ اُس کی تخلیقی قوت اپنی اوج پر پہنچ گئی ہے۔

کامیابی کا گراف:

جوانی میں ہی مر جانے والے کسی مصنف کو دیکھ کر لوگ عموماً اس قسم کے تاثرات دیتے ہیں،

”کیٹس نے جو کچھ تیس برس کی عمر میں کر دکھایا تھا اُس کے مقابلے میں تیس سال کی عمر میں شیکسپیئر کی کامیابیاں کچھ بھی نہیں۔ میں نے حساب لگایا ہے کہ اگر کیٹس بہتر سال کی عمر تک زندہ رہ پاتا تو یقیناً 'ہیملٹ' سے بہتر سات ڈرامے اور 'پیراڈائز لاسٹ' سے بہتر تین رزمیہ داستانیں لکھ دیتا۔“ اس قسم کی دلیل بازی کے وقت فرض کر لیا جاتا ہے کہ کامیابیاں ایک گراف کی صورت میں ملتی ہیں، جیسے چھت سے گرائے ہوئے گولے کی رفتار بڑھتی جاتی ہے۔ لیکن جینیئس ناقابلِ پیش گوئی اور متلون ہے۔ یہ ایک مدوجذر رکھتا ہے جسے کسی مساوات میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جوہر قابل ریاضی کو پسند نہیں کرتا۔

طویل زندگی پانے والا جینیئس عموماً اپنی جوانی میں کچھ زیادہ کامیابی نہیں پاتا؛ وہ آہستہ آہستہ کام کرتا اور اُمید رکھتا ہے کہ بعد میں اُسے مکمل کر لے گا۔ اس کے برعکس جوان عمر میں مرنے والا جینیئس اپنی موت قریب ہونے کے احساس کے ساتھ بڑی سرگرمی اور تندہی کے ساتھ کام کرتا ہے۔ جینیئس اندازہ لگا لیتا ہے کہ اُس کے پاس کام کرنے کے لیے کتنا وقت باقی ہے، اور وہ اُسی کے مطابق اپنی رفتار طے کرتا ہے۔

یہ حساب لگانا بے فائدہ ہے کہ اگر کیٹس 75 سال کی عمر تک زندہ رہتا تو کیا کچھ کر لیتا۔ اُس کی جوانی میں موت بالکل شاعری کی طرح اُس کی شخصیت کا بھی اظہار تھی۔ ”اگر کیٹس جوانی میں نہ مر جاتا“ کہنا ایسا ہی جیسے یہ کہا جائے کہ ”اگر کیٹس شاعر نہ ہوتا۔“ شاعر بننا اور جوانی میں مرنا کیٹس کے مقدر میں لکھا تھا۔ ”اگر کیٹس بہتر سال کی عمر تک زندہ رہ پاتا تو یقیناً 'ہیملٹ' سے بہتر سات ڈرامے اور 'پیراڈائز لاسٹ' سے بہتر تین رزمیہ داستانیں لکھ دیتا“ کہنا ایسا ہی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ اگر جان نے چار منٹ میں ایک میل فاصلہ دوڑ کر طے کیا ہے تو وہ 104 منٹ میں 26 میل طے کر سکتا ہے، اور اس سے وہ بہ آسانی میراتھن میں سونے کا تمغہ جیت سکتا ہے۔“

بالواسطہ خودکشی:

بیماری عموماً اُن لوگوں کو متاثر کرتی ہے جو بیمار ہونا چاہتے ہوں، جبکہ یہ خواہش نہ رکھنے والے لوگ عموماً بیماری پر قابو پا لیتے ہیں۔ بیماریوں کی طرح حادثات بھی عموماً اُن لوگوں کو پیش آتے ہیں جنہیں اُن کی تمنا ہو۔ حادثے کا شکار ہونے کی خواہش کبھی کبھار شعوری اور کبھی کبھار لاشعوری

ہوتی ہے۔ ابرہام سن نے خودکشی کے کئی ایسے کیسز کے متعلق بتایا جن کا محرک لاشعوری تھا۔ مثلاً لاشعور سے تحریک یافتہ خودکشی کی کیٹگری میں ایسے بہت سے حادثات آتے ہیں جو پہاڑوں میں واقع ہوتے ہیں۔

بیماری اور حادثات کی طرح کبھی کبھی موت کی سزا بھی اُن لوگوں کو ملتی ہے جو اُس کے خواہش مند ہوں۔ مثلاً اگر یسوع مسیح اور سقراط زندہ رہنا چاہتے تو بہ آسانی موت کی سزا سے بچ سکتے تھے، لیکن اُنہیں زندہ رہنے کی خواہش نہیں تھی۔ جیسا کہ کے نطشے نے کہا، "سقراط اور عیسیٰ کی سزائے موت ایک طرح کی خودکشی تھی۔" اسی طرح آسکر وائلڈ اپنے خلاف مقدمے اور سزا کی وجہ خود بنا۔ اُس کا انکار اور قبل از وقت موت ایک طویل اور مخفی خودکشی تھی۔ وہ اپنی خود تخریبی اُمنگوں سے آگاہ اور اُن پر پریشان تھا۔ اُس نے سوال کیا، "کوئی شخص اپنی تباہی کی جانب ہی کیوں دوڑتا ہے؟ تخریب میں ایسی سحر انگیزی کیوں ہے۔"

سزائے موت کی طرح جنگ میں موت بھی کبھی کبھار مرنے والوں کی خواہش کا عکس ہوتی ہے۔ موت کی ایک لاشعوری خواہش فوجی کو ایسے انداز میں عمل کرنے پر اکساتی ہے کہ جو اُس کی موت کی وجہ بن جائے۔ اِس کے برعکس زندہ رہنے کا عزم رکھنے والا فوجی موت سے بچتے ہوئے بھی بہادری سے لڑ سکتا ہے۔ مثلاً نپولین نے گھمسان کی جنگیں لڑیں، اور اُس کے 19 گھوڑے ہلاک ہوئے، مگر وہ موت سے بچتا رہا۔

پاگل پن یا دیوانگی بھی اُنہی لوگوں کو ملتی ہے جو اُس کے تمنائی ہوں۔ مثلاً نطشے زندگی کے دباؤ سے بچنے کی خاطر دیوانگی کا خواہش مند لگتا ہے۔ جس طرح بہت سے اہلِ قلم نے اپنی موت کی پیش بینی کر لی تھی، اُسی طرح نطشے اپنے پاگل پن کے متعلق پیشگی آگاہ تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنی سوانح عمری لکھی اور پینتالیس برس کی عمر میں ہی اپنے سارے کام نمٹا دیے۔ آخر کار جب وہ دیوانہ ہو گیا تو ایک دوست نے کہا کہ وہ یوں کام کر رہا تھا جیسے حالات کی کروٹوں سے خوش ہو۔

جینے کا عزم:

قبل از وقت موت کی طرح طویل زندگی بھی عموماً خود اختیاری ہوتی ہے؛ جس طرح کچھ لوگ اپنی خواہشِ مرگ کے نتیجے میں مر جاتے ہیں، اُسی طرح بہت سے لوگ اپنی جینے کی خواہش کے

باعث طویل زندگی بھی پاتے ہیں۔ تھامس مان اِسی قسم کا شخص تھا۔ 35 برس کی عمر میں مان نے "ڈیتھ اِن وینس" میں لکھا: "وہ طویل عمر پانے کی گہری خواہش رکھتا تھا، کیونکہ اُسے یقین تھا کہ صرف وہی آرٹسٹ حقیقی معنوں میں عظیم یا ہمہ گیر ہو سکتا ہے جس نے انسانی منظر کے تمام مراحل کا تجربہ کیا ہو۔" مان نے 80 سال عمر پائی۔ طویل زندگی کی خواہش پر بحث کرنے والا برنارڈ شا 84 برس زندہ رہا۔

ضعیفی اور پارسائی:

جوان لوگوں کی نسبت بوڑھے لوگوں میں موت کی جبلت زیادہ طاقت ور ہوتی ہے؛ جیسا کہ ینگ نے کہا، جوان لوگوں کی لبیڈو زندگی میں آگے کی طرف متعین ہوتی ہے، جبکہ بوڑھے لوگوں کی لبیڈو پیچھے موت کی جانب متعین ہوتی ہے۔ اپنے اندر موت کی جبلت کو نوٹ کرنے والا ایک بوڑھا شخص ٹالسٹائی تھا۔ وہ جبلتِ موت کے متعلق لکھتا ہے (جو اُس نے تقریباً 50 سال کی عمر میں محسوس کی تھی): "ایک زبردست قوت نے مجھے اپنی ہستی سے چھٹکارا پانے پر زور دیا۔ اِسے خودکشی کی خواہش کا نام دینا مشکل ہے کیونکہ مجھے زندگی سے پرے لیجانے والی قوت محض خواہش کے مقابلہ میں کہیں زیادہ بھرپور، زیادہ طاقت ور اور زیادہ عمومی تھی۔"(۵)

اگر آپ کی جبلتِ موت طاقت ور ہو اور اگر آپ زندگی کو مزید جینا مشکل پائیں تو حقیقت کو فسانوں اور التباسات کے ذریعہ مسخ کر دیں گے، تا کہ اُسے زیادہ خوش گوار اور قابلِ برداشت بنا سکیں۔ بوڑھے لوگ عموماً ایسا ہی کرتے، اور بالخصوص مذہبی مصنوعی پن کا سہارا لیتے ہیں۔ وہ زندگی کو زیادہ خوش گوار بنانے کی خاطر مذہب میں پناہ لیتے ہیں۔ بڑھاپے میں مذہبی بن جانے والے لوگوں کی مثالیں نیوٹن، Liszt، ویگنر، گوگول، ٹالسٹائی، سٹرنڈ برگ اور Huysmans ہیں۔

موت کا استقبال:

اگر لوگ جبلتِ مرگ رکھتے ہیں تو پھر وہ موت سے خوف زدہ کیوں ہوتے ہیں؟ دراصل موت سے خوف زدہ لوگ کبھی کبھی خود موت سے نہیں بلکہ اپنی مرنے کی لاشعوری خواہش سے ڈرتے ہیں۔ کبھی کبھی موت کا خوف شعور اور لاشعور کے مابین ناموافقت کا نتیجہ ہوتا ہے؛ انسان کا شعور مرنے کی لاشعوری خواہش کے ساتھ مطابقت نہیں قائم کر پاتا اور اِس خواہش کو دبانے کی

کوشش کرتا ہے۔ دباؤ کے نتیجے میں دبائی جا رہی چیز کا خوف جنم لیتا ہے۔ بلندیوں کا خوف بھی اِسی قسم کی صورت حال پیش کرتا ہے۔ فرائیڈ کے خیال میں بلندیوں کا خوف گر کر مرنے کی لاشعوری خواہش کو چھپاتا ہے۔

انسان کے نفسیاتی ارتقاء نے قدیم انسان کے دبے ہوئے احساسات کو ختم کیا اور شعور و لاشعور کے درمیان ہم آہنگی پیدا کی۔ یہ ارتقاء موت کے خوف پر بھی قابو پا سکتا ہے۔ انسان کے شعور سمیت اُس کی ساری ہستی کسی روز بالکل ویسے ہی موت کا استقبال کر سکتی ہے جیسے لاشعور اکثر موت کا استقبال کرتا ہے۔

الجھن:

خود کو اُس دور میں تصور کریں جب کرۂ ارض پر کوئی حیات موجود نہیں تھی۔ ایسی کوئی زندگی ظہور پذیر نہیں ہو سکتی تھی جو زندگی اور موت کی جبلتوں کے زیرِ اختیار نہیں تھی، کیونکہ نامیاتی زندگی اِن جبلتوں کا ہی اظہار ہے۔ لیکن زندگی اور موت کی جبلتیں خود بخود کیسے اُبھر آئیں؟ اور یہ جبلتیں حقیقت میں کس چیز پر مشتمل ہیں؟

یہ ایسے سوالات ہیں جن کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں۔ بس زندگی اور موت کی جبلتوں کے رویے کو بیان کرنے والے قوانین کا ذکر کر دینا کافی ہوگا...... بالکل اُسی طرح جیسے نیوٹن نے قوتِ ثقل کے بارے میں نہ جانتے ہوئے بھی قوتِ ثقل کے قوانین بیان کر دیے تھے۔ شوپنہاور نے کہا تھا: "ہر بے کم و کاست سائنس اور ہر تفتیش کے اختتام پر انسانی ذہن ایک بنیادی مظہر کے سامنے کھڑا ہوتا ہے...... یہ بنیادی مظہر اپنے ذریعہ سمجھی جانے والی ہر چیز کی وضاحت کرتا ہے، لیکن خود غیر توضیح شدہ اور ہمارے سامنے ایک پہیلی کے طور پر ہی موجود رہتا ہے۔"(۵)

واحد، کثرت:

مابعد الطبیعیات دان کثرت میں وحدت تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے، یعنی دنیا کی مختلف چیزوں کا ایک واحد مستقل عامل، مظاہر کے تنوع کی تہہ میں موجود شئے بالذات۔ شوپنہاور نے سوچا کہ اُس نے کثرت میں وحدت دریافت کر لی تھی۔ اُس نے کہا کہ "ارادہ" (Will) ہی واحد تھا، اور تمام مفرد اشیاء کی تہہ میں ارادہ کارفرما تھا۔ اُس نے بے جان اشیاء مثلاً پتھروں کو بھی ارادے

سے متصف کیا۔

شوپنہاور کے "ارادے" کی طرح زندگی اور موت کی جبلتوں کو بھی کثیر میں واحد، شئے بالذات کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ دو الگ الگ جبلتوں کے متعلق بات کرنے کی بجائے آپ ایک ہی جبلت کی دو مختلف صورتوں پر بات کر سکتے ہیں۔ یا یوں کہہ لیں کہ جبلتِ حیات اور جبلتِ موت پر الگ الگ بات کرنے کی بجائے جبلتِ حیات کے ایک طاقت ور، صحت مند پہلو اور دوسرے کمزور، تھکے ہارے پہلو پر بات کی جا سکتی ہے۔ تاہم، زندگی اور موت کی جبلتوں کو غیر جان دار اشیاء سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تھیوری جان دار اور غیر جان دار اشیاء کے درمیان واضح فرق کرتی ہے۔

برنارڈ شا کا نکتۂ نظر:

کسی تاریخی دور کے مرکزی تصورات کسی ایک مفکر کے ہی نہیں ہوتے، بلکہ اُن میں بہت سے مفکرین حصہ دار ہوتے ہیں۔ مثلاً ڈارون کے دور میں ارتقاء کا تصور اور بھی کئی مفکرین کے ہاں ملتا ہے۔ نطشے کے دور میں زندگی اور موت کی جبلتوں کا نظریہ نطشے اور جارج برنارڈ شا کے علاوہ اور بھی کئی مفکرین نے اختیار کیا۔

برنارڈ شا کو فلسفہ میں دلچسپی تھی اور اُس نے اپنے ڈراموں میں فلسفیانہ خیالات ظاہر کیے ہیں۔ وہ خاص طور پر فلسفہ کے حیاتیاتی پہلو کی جانب مائل تھا۔ وہ "قوتِ حیات" کی بات کرتا اور کہتا ہے کہ "موت و انحطاط" کی قوتیں اِس قوتِ حیات کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتی ہیں۔ شا نے دلیل دی کہ قوتِ حیات انسان کو نہ صرف اپنے ذاتی مفادات بلکہ اجتماعی معاشرتی مفادات بھی پورے کرنے پر مائل کرتی ہے۔ اُسے یقین تھا کہ انسانی ہستی کا مقصد ایک اعلیٰ سطح تک رفعت پاتا ہے، کہ "تخلیقی ارتقاء" کا ایک نیا مذہب عیسائیت کی جگہ لے رہا تھا۔

ہمارے عہد کا فلسفہ:

افراد خارجی اور داخلی قوتوں، شعوری اور لاشعوری جبلتوں کے تحت جیتے اور مرتے، نشوونما پاتے اور انحطاط کا شکار ہوتے ہیں...... نہ صرف بیرونی بلکہ داخلی قوتوں کے نتیجے میں بھی۔ معاشرے بھی انسانوں جیسے ہیں۔ وہ بھی جیتے اور مرتے، نشوونما پاتے اور انحطاط کا شکار ہوتے ہیں، اور اُن کے اِس عمل میں بھی خارجی اور داخلی، لاشعوری قوتیں کردار ادا کرتی ہیں۔ اگر آپ

معاشروں پر اثر انداز ہونے والی لاشعوری قوتوں کو سمجھ سکیں تو تب ہم انحطاط اور شباب نو کے مظاہر کو سمجھ سکتے ہیں اور نتیجتاً تاریخ کے بارے میں ہمارا ادراک زیادہ عمیق بن سکتا ہے۔

تاریخ کی عمیق تر تفہیم ہمیں فرد کی عمیق تر تفہیم عطا کرتی ہے۔ چونکہ فرد تاریخی عمل کا حصہ ہے اور معاشرے کو چلانے والی قوتیں اُسے بھی تحریک دیتی ہیں، اس لیے تاریخ کا یہ نیا نظریہ مذہب، آرٹ اور متعدد دیگر شعبوں کا بھی نیا نظریہ ہے۔ آنے والی نسلیں ہی اس کی گہرائیوں میں جا سکیں گی۔ ایک پشت جو کچھ دریافت کرتی ہے، اگلی پشت اُسے جاننے کی جستجو کرتی ہے۔ اس نظریے کی بنیاد تین ستونوں پر ہے: ہیگل کا نظریۂ معاشرہ، فرائیڈ کا موت وحیات کی جبلتوں کا نظریہ اور نطشے کا نظریۂ انحطاط۔ یہ نظریہ فلسفے کے ارتقائی عمل میں کوئی حتمی مرحلہ نہیں۔ یہ ہمارے عہد کا فلسفہ ہے، نہ کہ تمام زمانوں کا۔ مستقبل کا کوئی فلسفہ اس سے آگے بڑھے گا اور نئی بلندیوں کو چھوئے گا۔

کچھ ہی عرصہ قبل، لاشعور کی نفسیات کی ترقی کے بعد سے ہی تاریخ کو ایک نفسیاتی تناظر میں دیکھنا ممکن ہو سکا ہے۔ تاریخ کے تمام سابقہ فلسفوں...... ہیگل، سپنگلر اور ٹائن بی...... میں نفسیاتی تناظر کا فقدان تھا۔ محض تاریخ کا مطالعہ کرنے کے ذریعہ ہی ایک فلسفۂ تاریخ تشکیل نہیں دیا جا سکتا۔ نہ ہی تحقیق و وجدان کے ذریعہ اس کی تعمیر ممکن ہے۔ چنانچہ تاریخ کے کسی ماہر سے فلسفۂ تاریخ کی اُمید نہیں کرنی چاہیے۔ سائنس میں اکثر انقلابی دریافتیں ایسے لوگوں نے کیں جو متعلقہ شعبے میں سپیشلائزڈ نہیں تھے...... مثلاً ڈالٹن۔ فلسفۂ تاریخ کی بنیاد سیاسی کی بجائے ثقافتی تاریخ پر ہونی چاہیے۔ انسانی روح خود کو سیاسی سے زیادہ ثقافتی میدان میں آشکار کرتی ہے۔ سیاسی میدان میں انسانی روح غیر ممالک اور طبعی حالات وغیرہ کے ساتھ تعلق بناتی ہے۔ چونکہ سیاسی میدان میں واقعات کے پیچھے کئی عوامل ہوتے ہیں، اس لیے سیاسی تاریخ میں لاشعوری جبلتوں کا کردار بیان کرنا مشکل ہے۔ دوسری طرح ثقافتی میدان میں محرکات کی تعداد کم اور لاشعوری جبلتوں کا کردار واضح ہوتا ہے۔ اگرچہ فلسفۂ تاریخ سیاسی تاریخ کی تفہیم میں اضافہ کر سکتا ہے، لیکن اصل مرکزِ توجہ ثقافتی تاریخ کو ہونا چاہیے۔ یعنی یہ جاننا ضروری ہے کہ لاشعوری جبلتیں ثقافت کو کیسے متاثر کرتیں اور انحطاط و تجدید شباب کا باعث کیسے بنتی ہیں۔

جیمز ہیمنڈ
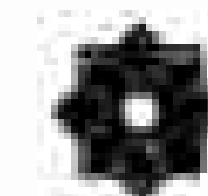
8

روح اور موت

مجھ سے اکثر سوال کیا جاتا ہے کہ ہر ایک ہستی کے یقینی اختتام یعنی موت کے بارے میں میرا کیا نکتۂ نظر ہے۔ ہم لوگ موت کو محض ایک اختتام کے طور پر جانتے ہیں۔ یہ جملے کے آخر میں لگایا جانے والا ایک فل سٹاپ ہے جس کے بعد صرف دوسروں میں یادیں یا اثرات ہی باقی رہ جاتے ہیں۔ تاہم، متعلقہ شخص کے لیے ساری ریت مٹھی میں سے گر جاتی ہے، لڑھکتا ہوا پتھر رک جاتا ہے۔ موت سے سابقہ پڑنے پر زندگی ہمیشہ ایک نیچے کی جانب بہتے ہوئے دھارے جیسی معلوم ہوتی ہے، یا پھر ایک گھڑی جسے چابی دی گئی ہو اور جس کا رک جانا بس تسلیم کر لیا گیا ہو۔ جب ہماری آنکھوں کے سامنے کسی کی زندگی اختتام پذیر ہو تو ہم دل کی گہرائیوں سے "چابی ختم ہونے" کے اس تصور کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ یا جب کسی زندہ جسم میں سے آخری سانس رخصت ہو تو زندگی کا مفہوم اور وقعت ہمارے لیے نہایت ناگہانی یا کرب انگیز بن جاتی ہے۔ اُس وقت زندگی کا مفہوم ہمیں کس قدر مختلف لگتا ہے جب ہم کسی نوجوان شخص کو کوئی مشکل مقاصد حاصل کرنے اور مستقبل کی صورت گری کرنے کی تگ و دو میں مصروف دیکھتے ہیں، اور اُس کا موازنہ ایک صعب العلاج ناکارہ شخص یا قبر سے بچنے کی لاچار کوشش میں مصروف بوڑھے شخص سے کرتے ہیں! ہم یہ سوچنا پسند کرتے ہیں کہ جوانی ایک مقصد، مستقبل، معنی اور قدر رکھتی ہے، جبکہ اختتام کے قریب پہنچنا محض ایک بے معنی انقطاع ہے۔ اگر کوئی نوجوان شخص دنیا، زندگی اور مستقبل سے خوف زدہ ہو تو ہر کوئی اس چیز کو قابلِ افسوس، بے وقوفانہ اور مریضانہ بات سمجھتا ہے؛ اُسے بزدل اور ڈرپوک سمجھا جاتا

ہے۔لیکن جب کوئی بوڑھا شخص دل ہی دل میں لرزے اور یہ سوچ کر خوف زدہ ہو کہ اُس کی زندگی کے گنے چنے سال ہی باقی رہ گئے ہیں، تو تب ہمیں اپنی چھاتی میں پنپنے والے اِسی قسم کے مخصوص احساسات یاد آتے ہیں؛ ہم نظریں پھیر کر کسی اور موضوع پر بات کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نوجوان آدمی کو پرکھنے والی رجائیت یہاں ساتھ نہیں دیتی۔فطری طور پر ہم نے زندگی کے ہر واقعے کے لیے ایک دو موزوں مقولے تراش رکھے ہیں، جیسے "ایک نہ ایک دن سب کو مرنا ہے،" "ہمیشہ کے لیے تو کوئی بھی زندہ نہیں رہتا" وغیرہ۔لیکن رات کے وقت تنہائی میں ہم سالوں کی جمع و تفریق کرتے ہیں اور ناپسندیدہ حقائق کے طویل سلسلے کا حساب لگاتے ہیں جو بڑے بے رحمانہ انداز میں نشان دہی کرتے ہیں کہ ہمارے پاس کتنا وقت باقی رہ گیا ہے، کہ تاریکی کی وہ دیوار کتنی دور رہ گئی ہے جو ہر اُس چیز کو ہڑپ کر جائے گی جسے ہم محبت کرتے ہیں، جس کے لیے جدوجہد اور اُمید کرتے ہیں......تب زندگی کے متعلق ہماری تمام بصیرتیں کسی ناقابل دریافت غار میں جا چھپتی ہیں اور بے خواب وجود ایک دبیز کمبل جیسے خوف میں لپٹ جاتا ہے۔

بہت سے نوجوان لوگ دل کی گہرائی میں زندگی کا ایک مصیبت انگیز خوف رکھتے ہیں (اگرچہ وہ ساتھ ہی ساتھ اِس کے شدید خواہش مند بھی ہوتے ہیں)، اور بوڑھوں کی ایک کہیں بڑی تعداد موت کے اِسی خوف کی حامل ہے۔جی ہاں، میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو جوانی میں زندگی سے خوف زدہ تھے اور بعد میں موت سے بھی اُسی قدر خوف کھانے لگے۔جوانی میں وہ زندگی کے نارمل تقاضوں کے خلاف ایک بچگانہ مدافعت رکھتے ہیں؛ اِسی طرح بڑھاپے میں بھی وہ زندگی کے ایک نارمل تقاضے سے ڈرتے ہیں۔ہم اِس قدر گہرائی میں موت کو محض ایک اختتام مان چکے ہیں کہ اُسے ایک مقصد اور تکمیل کے طور پر لینے کا سوچتے تک نہیں، جیسا کہ جوانی میں پُرشباب مقاصد کے معاملے میں بلا تذبذب کیا کرتے ہیں۔

زندگی ایک توانائی کا عمل ہے۔توانائی کے ہر ایک عمل کی طرح یہ اصولی طور پر اُلٹایا نہیں جا سکتا۔چنانچہ یہ ہمیشہ ایک مقصد اور منزل کی جانب متعین ہوتا ہے۔یہ منزل سکون کی حالت ہے۔ طویل المیعاد میں واقع ہونے والی ہر چیز دائمی حالتِ سکون میں ایک ابتدائی گڑبڑ سے زیادہ کچھ نہیں۔زندگی بدرجۂ اُتم غائیت (Teleology) ہے؛ یہ ایک مقصد کی جانب خلقی جہد ہے، اور زندہ نامیہ سمت بند مقاصد (جو اپنی تکمیل کے خواہش مند ہیں) کا ایک نظام ہے۔ہر عمل کا اختتام

اُس کی منزل ہے۔توانائی کا تمام بہاؤ ایک ایتھلیٹ جیسا ہے جو پوری تندہی اور حتی المقدور کوشش کے ساتھ اپنی منزل تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔دنیا اور زندگی کے لیے عہدِ جوانی کی خواہش، اعلیٰ توقعات اور مشکل مقاصد حاصل کرنے کی جستجو زندگی کی بدیہی غایتی ترنگ ہے جو اگر کسی نقطے پر ماضی میں ہی پھنس جائے تو وہ بیک وقت زندگی کے خوف، نیوراتی مدافعت، ڈپریشنز اور فوبیاز (Phobias) میں تبدیل ہو جاتی ہے۔بلوغت حاصل کرنے پر اور حیاتیاتی ہستی کے نقطۂ عروج پر، زندگی کی کسی مقصد کی جانب تحریک ہرگز رکتی نہیں۔وسطی عمر کو پہنچنے سے پہلے زندگی جس شدت اور ناقابلِ مدافعت قوت کے ساتھ اوپر کی جانب جاتی ہے، اب اُسی زوردار قوت کے ساتھ نیچے کی جانب اُتراؤ شروع کرتی ہے؛ کیونکہ منزل یا مقصد چوٹی پر نہیں بلکہ اُس وادی میں ہے جہاں سے اوپر کی جانب سفر شروع ہوا تھا۔

تاہم، زندگی کا نفسیاتی خط اِس قانونِ فطرت کے ساتھ مطابقت اختیار کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔کبھی کبھی عدم موافقت کا آغاز چڑھائی شروع کرنے کے ابتدائی مرحلے پر ہی ہو جاتا ہے۔ ہم اپنے گزشتہ سالوں سے بندھے رہتے ہیں، اپنے بچپن کو یوں سینے سے لگائے رکھتے ہیں کہ جیسے اِسے خود سے جدا نہ کر سکتے ہوں۔ہم گھڑی کی سوئیاں روک کر سمجھتے ہیں کہ وقت بھی رک جائے گا۔کچھ تاخیر کے بعد جب ہم دوبارہ، نفسیاتی اعتبار سے، چوٹی پر پہنچیں تو ستانے لگتے ہیں، اور خود کو دوسری طرف اُترتے ہوئے دیکھنے کے باوجود اپنی حاصل کردہ چوٹی پر ہی چمٹے رہتے ہیں۔ جیسے قبل ازیں خوف زندگی کی راہ میں حائل تھا، اُسی طرح اب یہ موت کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔شاید ہم یہ تسلیم بھی کر لیں کہ زندگی کا خوف ہمیں پیچھے چڑھائی والی ڈھلوان پر بھی روکے رکھتا ہے، لیکن اِسی تاخیر کی وجہ سے ہم اپنی حاصل کردہ چوٹی پر ہی جمے رہنے کا زیادہ سے زیادہ دعویٰ جتاتے ہیں۔ہماری تمام تر مدافعتوں کے باوجود زندگی جب اپنا آپ منوا لے تو بھی ہم کوئی توجہ نہیں دیتے اور اِسے ساکت و جامد رکھنے میں لگے رہتے ہیں۔تب ہماری نفسیات اپنی فطری بنیادوں سے محروم ہو جاتی ہے۔شعور اوپر ہوا میں ہی ٹھہرا رہتا ہے، جبکہ زندگی کا قوسی خط ہر لحظہ بڑھتی ہوئی رفتار کے ساتھ نیچے کی جانب جاتا ہے۔

فطری زندگی روح کی غذا بخش مٹی ہے۔زندگی کے سنگ آگے بڑھنے میں ناکام ہو جانے والا کوئی بھی شخص بیچ ہوا میں معلق اور ساکت رہتا ہے۔اِسی لیے اِتنے بہت سے لوگ بڑھاپے میں

غیر لچک دار بن جاتے ہیں؛ وہ پیچھے ہی دیکھتے اور ماضی سے چمٹے رہتے ہیں جبکہ اُن کے دلوں میں موت کا ایک خفیہ خوف بسا ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے عمل سے، کم از کم نفسیاتی طور پر، کٹ جاتے اور نتیجتاً ناسٹلجیا کے ستونوں کے ساتھ بندھے بندھے جوانی کو یاد کرتے رہتے ہیں لیکن حال کے ساتھ کوئی جان دار تعلق نہیں بنا پاتے۔ زندگی کے درمیانی نقطے سے آگے کے سفر میں صرف وہی شخص جان دار انداز میں زندہ رہتا ہے جو زندگی کے سنگ مرنے کو تیار ہو۔ کیونکہ زندگی کی دوپہر کی کسی خفیہ ساعت میں موت دوبارہ جنم لیتی ہے۔ زندگی کا دوسرا نصف چڑھائی، اُٹھان، انکشاف، افزودگی اور وفور کی نہیں بلکہ موت کی نشان دہی کرتا ہے کیونکہ خاتمہ اِس کی منزل ہے۔ زندگی کی تسکین و تکمیل سے انکار بھی اِس کے اختتام کو قبول کرنے سے انکار کے مترادف ہے۔ دونوں کا مطلب زندہ رہنے کی خواہش نہ ہونا ہے؛ زندہ رہنے کا خواہش مند نہ ہونا بھی مرنے کی خواہش نہ ہونے جیسا ہے۔

جب بھی ممکن ہو، ہمارا شعور اِس ناقابلِ تردید سچائی کے ساتھ کوئی مصالحت کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ عام طور پر ہم اپنے ماضی سے چمٹے اور جوانی کے سراب میں مبہوت رہتے ہیں۔ بوڑھا ہونا نہایت غیر مقبول ہے۔ کوئی بھی شخص یہ سمجھتے ہوئے نظر نہیں آتا کہ بوڑھا ہونے کے قابل نہ ہونا بھی اُتنا ہی لغو ہے جتنا کہ بچوں والے سائز کے جوتوں سے بڑا نہ ہونا۔ تیس سال کے بدستور بچگانہ مرد کو یقیناً لعنت ملامت کی جائے گی، لیکن کیا ایک جوانی کی ترنگ سے بھرپور ستر سالہ شخص کو باعث مسرت نہیں خیال کیا جاتا؟ البتہ دونوں ہی نفسیاتی اعتبار سے کج رویاں ہیں۔ جو نوجوان لڑے اور فتح نہ کرے وہ اپنی جوانی کا بہترین حصہ ضائع کر دیتا ہے، اور جو بوڑھا شخص وادی کی چوٹیوں سے نیچے لڑھکتے ہوئے چشموں کے اِسرار پر کان نہ دھرے وہ قابلِ فہم نہیں ہوتا۔ وہ ایک روحانی ممّی ہوتا ہے جو ماضی کی ایک بوسیدہ یادگار کے سوا کچھ بھی نہیں۔ وہ زندگی کے دھارے سے الگ کھڑا ہو کر آخری سانس تک خود کو دوہراتا رہتا ہے۔

موجودہ دور کے اعداد و شمار سے ظاہر ہونے والی ہماری نسبتاً طویل العمری تہذیب کی پیداوار ہے۔ قدیم لوگوں کا بڑھاپے کی عمر کو پہنچنا نہایت غیر معمولی تھا۔ مثلاً جب میں مشرقی افریقہ کے قدیمی قبائل میں گیا تو سفید بالوں والے چند ایک آدمی ہی نظر آئے جن کی عمر شاید ساٹھ برس سے کچھ زیادہ ہو۔ وہ اپنی عمر کو خود پر اِس حد تک طاری کر چکے تھے کہ ہمیشہ سے بوڑھے لگتے تھے۔ وہ ہر

اعتبار سے ایسے ہی تھے۔ ہم لوگ ہمیشہ کم و بیش وہی رہتے ہیں جو ہم اصل میں ہوں۔ یوں سمجھ لیں کہ ہمارا شعور کسی نہ کسی طرح اپنی فطری بنیادوں سے ہٹ گیا اور اب اُسے نہیں معلوم کہ فطرت کی گھڑی کے ساتھ ساتھ کیسے چلنا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم شعور کے گھمنڈ میں مبتلا ہیں جو ہمیں اِس یقین میں اُلجھائے ہوئے ہے کہ ہمارا دورِ حیات محض ایک سراب ہے جسے ہم اپنی خواہش کے مطابق بدل سکتے ہیں۔

اُڑتے ہوئے توپ کے گولے کی طرح زندگی کا اختتام موت میں ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اِس کی اُٹھان اور انتہائے عروج بھی منزل تک پہنچنے کے محض مراحل اور ذرائع ہی ہیں۔ یہ متناقض (پیراڈاکسیکل) فارمولا محض اِس حقیقت سے منطقی استنباط ہے کہ زندگی ایک منزل کی جانب بڑھتی اور اپنے مقصد کے لحاظ سے متعین ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہاں میں مختلف تشبیہات اور استعاروں سے نہیں کھیل رہا۔ ہم زندگی کی اُٹھان کو مقصد اور منزل تفویض کرتے ہیں، تو اُترائی کے ساتھ ایسا کیوں نہیں کرتے؟ اگر انسان کی پیدائش مفہوم سے لبریز ہے تو موت کیوں نہیں؟ کوئی بیس سال تک بڑھتے ہوئے انسان کو اپنی انفرادی فطرت مکمل طور پر آشکار کرنے کے لیے تیار کیا جاتا ہے، تو بوڑھا آدمی موت کے لیے خود کو تیار کرنے میں بیس برس کیوں نہیں لگاتا؟ یقیناً نقطۂ عروج پہ پہنچ کر آپ کچھ پاتے ہیں۔ لیکن موت کی منزل پہ پہنچ کر کیا حاصل ہوتا ہے؟

اِس نقطے پر میں اچانک جیب میں سے کوئی عقیدہ نکال کر پیش کرنا اور قاری کو کوئی یقین دلانا نہیں چاہتا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ مَیں خود بھی کبھی یہ کام نہیں کر پایا۔ چنانچہ مَیں یہ نہیں کہوں گا کہ آپ موت کو دوسرے جنم، حیات بعد الموت کا آغاز سمجھیں۔ مجھے اِس پر یقین نہیں۔ لیکن میں اِتنا ضرور کہوں گا کہ اجتماعی رائے نے موت کے متعلق خیالات کا فیصلہ کیا ہے جن کا اظہار دنیا کے تمام عظیم مذاہب میں واشگاف طور پر ہوتا ہے۔ آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اِن مذاہب میں سے زیادہ تر موت کے لیے پیچیدہ تیاریوں کے نظام ہی ہیں...... حتیٰ کہ اِن نظاموں میں زندگی کی اہمیت محض موت کے حتمی مقصد کے لیے تیاری کے سوا کچھ بھی نہیں۔ عیسائیت اور بدھ مت دونوں میں ہستی کا اختتام ہی اِس کا مفہوم ہے۔

عہدِ روشن خیالی کے بعد سے مذہب کی نوعیت کے بارے میں ایک نقطۂ نظر نے ترقی پائی جو استدلالی غلط فہمی پر مبنی ہونے کے باوجود قابلِ غور ہے (نہایت وسیع پیمانے پر مقبول ہونے کے

باعث)۔ اِس نقطۂ نظر کے مطابق تمام مذاہب فلسفیانہ نظاموں جیسے ہیں، اور فلسفیانہ نظاموں کی طرح ہی وہ دماغ کی پیداوار ہیں۔ کسی دور میں کسی شخص نے دیوتا اور چھوٹے موٹے عقائد ایجاد کیے اور اِس "تکمیلِ خواہش" تخیل بازی کے ساتھ انسانیت کو ناک سے پکڑ کر چلایا۔ لیکن یہ رائے اِس نفسیاتی حقیقت سے میل نہیں کھاتی کہ مذہبی علامات کے متعلق سوچنے کے معاملے میں دماغ یا سر ایک قطعی ناکافی عضو ہے۔ مذہبی علامات کا ماخذ دماغ نہیں بلکہ کوئی اور جگہ ہے؛ شاید دل۔ اِسی لیے مذہبی علامات ایک ممیز طور پر "الہامی" تاثر رکھتی ہیں؛ وہ بالعموم لاشعوری نفسیاتی فعالیت کی خود رو پیداواریں ہیں۔ وہ سوچ بچار کا نتیجہ نہیں؛ اِس کے برعکس ہزاروں برس کے دوران اُنہوں نے پودے کی مانند انسانی سائیکی کے فطری مظاہر کے طور پر ترقی پائی۔ حتیٰ کہ آج بھی ہم افراد میں حقیقی اور کارآمد مذہبی علامات کی خودرو پیدائش دیکھ سکتے ہیں جو لاشعور میں سے اُبھرتی ہیں...... انوکھی قسم کے پھولوں کی طرح...... جبکہ شعور ایک طرف کھڑا حیران و پریشان رہتا ہے، اور اُسے سمجھ نہیں آتی کہ اِن تخلیقات کا کیا کرے۔ کافی آسانی سے تجزیہ کیا جاسکتا ہے کہ ہیئت اور جوہر کے اعتبار سے یہ انفرادی علامات نوعِ انسانی کے عظیم مذاہب کے طور پر ایک ہی جیسے لاشعوری ذہن یا "روح" (یا اِسے کوئی بھی نام دے لیں) میں سے اخذ ہوئیں۔ تمام مواقع پر تجربہ دکھاتا ہے کہ مذاہب ہرگز شعوری تخلیق یا ایجاد نہیں بلکہ یہ لاشعوری سائیکی کی فطری زندگی میں سے اُبھرے اور اِسے کچھ حد تک موزوں اظہار دیتے ہیں۔ یہ چیز اُن کی ہمہ گیر موجودگی اور ساری تاریخ کے دوران اِنسانیت پر زبردست اثرات کی وضاحت کرتی ہے۔ اگر مذہبی علامات انسان کی نفسیاتی فطرت کی سچائیاں نہ ہوتیں تو یہ چیز ناقابلِ فہم ہو جاتی۔

میں جانتا ہوں کہ بہت سے لوگوں کو لفظ "نفسیاتی" کے ساتھ مشکلات ہوتی ہیں۔ نقادوں کو کچھ تسلی دینے کی خاطر میں اِس میں اضافہ کرنا چاہوں گا کہ کوئی بھی شخص نہیں جانتا کہ "سائیکی" کیا ہے، اور آپ کو اُتنا تھوڑا سا علم ہی ہوتا ہے جتنی دور تک فطرت "سائیکی" کے اندر جائے۔ چنانچہ ایک نفسیاتی حقیقت بھی جسمانی یا طبعی حقیقت جتنی ہی قابلِ قدر اور قابلِ احترام چیز ہے...... اول الذکر صرف سائیکی اور مؤخر الذکر صرف مادے تک محدود رہتی ہے۔

لہٰذا موت کو محض ایک بے معنی اختتام کی بجائے زندگی کے مفہوم کی تکمیل اور درست ترین انداز میں اِس کے مقصد کا حصول سمجھنا انسانیت کی اجتماعی سائیکی کے ساتھ زیادہ مطابقت میں

معلوم ہوتا ہے۔ اِس بارے میں ایک استدلالی رائے رکھنے والا شخص نفسیاتی طور پر خود کو الگ تھلگ کر لیتا اور اپنی ہی بنیادی فطرت کے بالمقابل کھڑا ہو جاتا ہے۔

یہ آخری جملہ تمام نفسیاتی امراض کے متعلق اساسی صداقت کا حامل ہے، کیونکہ نفسیاتی امراض اساسی طور پر اپنی جبلتوں سے بیگانگی پر مشتمل ہیں...... سائیکی کے مخصوص بنیادی حقائق سے شعور کی علیحدگی۔ چنانچہ استدلالی آراء غیر متوقع طور پر نیوراتی علامات (Symptoms) کے قریب آجاتی ہیں۔ اِن کی طرح وہ بھی مسخ شدہ سوچ پر مشتمل ہیں جو نفسیاتی اعتبار سے درست سوچ کی جگہ لے لیتی ہے۔ مؤخر الذکر قسم کی سوچ دل کے ساتھ، سائیکی کی گہرائیوں کے ساتھ ہمیشہ اپنا رابطہ برقرار رکھتی ہے۔ کیونکہ روشن خیال ہو یا نہ ہو، شعور ہو یا نہ ہو لیکن فطرت خود کو موت کے لیے تیار کرتی ہے۔ اگر ہم جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے والے کسی نوجوان شخص کی سوچ کا تجزیہ اور ریکارڈ رکھ سکیں تو پتا چلے گا کہ حافظے کی چند شبیہوں کے علاوہ اُس کے تخیلات مرکزی طور پر مستقبل سے متعلق ہیں۔ بہ امرِ حقیقت بیشتر تخیلات قیاسات (Anticipations) پر مشتمل ہوتے ہیں۔ وہ زیادہ تر مستقبل کی مخصوص حقیقتوں سے نمٹنے کے لیے تیاریوں کے اہتمامات ہی ہوتے ہیں۔ اگر ہم کسی بوڑھے شخص کے ساتھ...... اُسے بتائے بغیر...... بھی یہی تجربہ کریں تو اُس کے تخیلات میں جوان شخص کی نسبت ماضی کی یادیں کہیں زیادہ تعداد میں ملیں گی کیونکہ وہ پیچھے کی جانب دیکھنے کا میلان رکھتا ہے۔ لیکن اِن ماضی کے تخیلات کے علاوہ ہمیں حیرت انگیز طور پر موت کے قیاسات سمیت بہت بڑی تعداد میں دیگر قیاسات بھی ملیں گے۔ عمر کے سالوں میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ موت کی سوچوں کا ڈھیر بڑھتا چلا جاتا ہے۔ بوڑھا شخص چاہے اَن چاہے خود کو موت کے لیے تیار کرنے لگتا ہے۔ اِسی لیے میرے خیال میں فطرت خود بھی اختتام کے لیے تیاریاں شروع کر چکی ہوتی ہے۔ معروضی اعتبار سے یہ معاملہ اہم نہیں کہ انفرادی شعور اِس کے متعلق کیا سوچتا ہے۔ لیکن موضوعی اعتبار سے یہ چیز زبردست فرق ڈالتی ہے کہ شعور سائیکی کے ساتھ ہم قدم رہتا ہے یا نہیں، یا اُلٹی آراء سے چمٹا رہتا ہے جن کے متعلق دل کچھ نہیں جانتا۔ بڑھاپے میں موت کی منزل کی جانب توجہ مرکوز نہ کرنا بھی اُسی طرح نفسیاتی مرض ہے جیسے جوانی میں مستقبل سے متعلقہ تخیلات کو دبانا۔ اپنے کافی طویل نفسیاتی علاج کے تجربہ میں مَیں نے ایسے بہت سے لوگوں کا مشاہدہ کیا ہے جن کی نفسیاتی سرگرمی کو موت سے کچھ ہی قبل جاننے کا موقعہ ملا۔ اصولی اعتبار سے قریب آتے

ہوئے انجام کی نشان دہی بھی اُنہی علامات کے ذریعہ ہوتی تھی جو نارمل زندگی میں بھی نفسیاتی حالت کی تبدیلیوں کا اعلان کرتی تھیں...... دوبارہ جنم کی علامات جیسے مقام، سفر وغیرہ کی تبدیلیاں۔ مَیں نے مشاہدہ کیا ہے کہ کوئی ایک سال پہلے ہی خوابوں کے سلسلے میں نزدیک آتی ہوئی موت کی نشان دہی ہونے لگی، حالانکہ بیرونی حالات اِن کے برخلاف تھے۔ چنانچہ مرنے کا عمل موت آنے سے کافی پہلے شروع ہو جاتا ہے۔ نیز، موت سے کافی پہلے ہی شخصیت میں کچھ مخصوص تبدیلیاں اِس چیز کو ظاہر کرنے لگتی ہیں۔ بہ حیثیتِ مجموعی مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ لاشعور سائیکی موت کے بارے میں کس قدر کم پریشان ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے لاشعور کی اصل دلچسپی اِس بات میں ہے کہ موت ''کیسے'' آتی ہے؛ یعنی شعور کا رویہ مرنے کے ساتھ ایڈجسٹ ہوتا ہے یا نہیں۔ مثلاً ایک مرتبہ مجھے 62 سالہ ایک عورت کا علاج کرنا پڑا۔ وہ اِس عمر میں بھی خوش دل اور اوسط درجے کی ذہین تھی۔ وہ اپنی ذہنی صلاحیتوں کی وجہ سے اپنے خوابوں کو سمجھنے میں ناکام نہیں تھی۔ بدقسمتی سے اُس کا اُنہیں سمجھنے کا ''خواہش مند'' نہ ہونا کافی واضح تھا۔ اُس کے خواب بالکل سیدھے سادے لیکن ناخوش گوار تھے۔ اُس نے اپنے ذہن میں یہ یقین قائم کر رکھا تھا کہ وہ اپنے بچوں کی بے عیب ماں تھی، لیکن بچوں کا نقطۂ نظر ہرگز یہ نہیں تھا، اور خواب بھی کافی حد تک برعکس یقین ظاہر کرتے تھے۔ دو ہفتوں کی بے کار کوششوں کے بعد علاج کا سلسلہ روکنا پڑا (کیونکہ مجھے پہلی عالمی جنگ شروع ہونے پر فوجی سروس کے لیے جانا تھا)۔ دریں اثنا مریضہ ایک صعب العلاج مرض میں گرفتار ہو گئی اور چند ماہ میں ہی اُس کا اختتام بالکل قریب نظر آنے لگا۔ وہ زیادہ تر وقت ہذیانی کیفیت میں رہتی اور اِس ذہنی حالت میں خود بخود تجزیاتی کام دوبارہ شروع کر دیتی۔ اُس نے دوبارہ اپنے خواب بتائے اور تسلیم کیا کہ قبل ازیں وہ بہت کچھ چھپاتی رہی تھی۔ ذاتی تحلیل نفسی کا یہ عمل چھ ہفتے تک روزانہ کئی کئی گھنٹے جاری رہتا۔ اِس عرصے کے اختتام پر وہ عام علاج کے دوران کسی مریض کی طرح بالکل پرسکون ہو گئی اور مر گئی۔

ایسے ہی کئی دیگر تجربات کی بنیاد پر مَیں یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہوں گا کہ کم از کم ہماری سائیکی فرد کے مرنے کے عمل سے لاتعلق نہیں ہے۔ موت کے قریب پہنچے ہوئے لوگوں میں غلطیوں کو ٹھیک کرنے کی خواہش بھی اِسی چیز کی نشان دہی کرتی ہے۔

اِن تجربات کی تشریح اور تعبیر کرنے کے طریقے کا مسئلہ تجربی سائنس کی اہلیت اور ہماری عقلی

استعدادوں سے بالاتر ہے، کیونکہ کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے کے لیے آپ کو موت کا حقیقی تجربہ ہونا ضروری ہے۔ بدقسمتی سے یہ واقعہ مشاہدہ کرنے والے کو ایک ایسی حالت میں مبتلا کر دیتا ہے کہ اپنے تجربات کا کوئی معروضی بیان دینا اور اُن کی بنیاد پر نتائج اخذ کرنا ممکن نہیں رہتا۔ شعور کی حدود بہت تنگ ہیں؛ آغاز اور اختتام کے درمیان کے مختصر عرصے میں نیند مزید ایک تہائی کی کر دیتی ہے۔ جسم کی زندگی کچھ زیادہ عرصہ تک ہوتی ہے؛ یہ ہمیشہ شعور سے پہلے شروع اور بعد میں ختم ہوتی ہے۔ تاہم، قریبی تجزیہ کرنے میں یہ دیکھنا نہایت مشکل ہے کہ ایک عمل کہاں ختم اور دوسرا کہاں شروع ہوتا ہے، کیونکہ واقعات اور عوامل، آغاز اور اختتام ایک دوسرے میں مدغم ہو کر ایک ناقابل تقسیم تسلسل تشکیل دیتے ہیں۔ ہم صرف پہچان اور تمیز اور تفہیم میں آسانی کی خاطر ایک عمل کو دوسرے سے الگ کرتے اور بخوبی جانتے ہیں کہ ہر عمل اپنی گہرائی میں من مانا اور روایتی ہے۔ یہ عمل کسی بھی طرح دنیاوی عمل کے تسلسل کی خلاف ورزی نہیں کرتا، کیونکہ ''آغاز'' اور ''اختتام'' بنیادی طور پر شعوری ادراک کے لوازمات ہیں۔ ہم معقول قطعیت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم سے متعلقہ انفرادی شعور اختتام پذیر ہو گیا ہے۔ لیکن یہ امر بدستور مشکوک رہتا ہے کہ آیا اِس کا مطلب نفسیاتی عمل کا تسلسل معطل ہو جاتا ہے یا نہیں، کیونکہ پچاس برس پہلے کی نسبت آج ذہن کے ساتھ سائیکی کا تعلق کہیں کم تیقن کے ساتھ تصدیق کیا جا سکتا ہے۔ نفسیات کے لیے لازمی ہے کہ وہ سب سے پہلے کچھ مخصوص ورائی نفسیاتی حقائق کو ہضم کرے، جنہیں وہ اب تک نہیں کر پائی۔

لاشعوری سائیکی اُن خوبیوں کی حامل نظر آتی ہے جو زمان و مکاں کے ساتھ اِس کے تعلق پر نہایت خصوصی روشنی ڈالتی ہیں۔ میں اُن مکانی اور دنیاوی ٹیلی پیتھک مظاہر کے بارے میں سوچ رہا ہوں جو ہماری معلومات کے مطابق وضاحت سے زیادہ نظر انداز کرنا آسان ہیں۔ اِس حوالے سے سائنس نے، چند ایک قابلِ تعریف مستثنیات کے ساتھ، اِنہیں نظر انداز کرنے کا آسان طریقہ ہی اختیار کیا ہے۔ تاہم، میں تسلیم کرنا چاہوں گا کہ سائیکی کی نام نہاد ٹیلی پیتھک صلاحیتیں میرے لیے کافی دردِ سر کا باعث بنیں، کیونکہ ''ٹیلی پیتھی'' کی اصطلاح کچھ بھی وضاحت نہیں کرتی۔ زمان و مکاں میں شعور کی تحدید ایک اِس قدر واضح حقیقت ہے کہ جب بھی یہ بنیادی سچائی سامنے آتی ہے تو اِسے اعلیٰ ترین تھیورٹیکل اہمیت کا واقعہ قرار دینا لازمی ہے، کیونکہ یہ ثابت کرتی ہے کہ زمان و مکاں کی تحدید کو معطل کیا اور جھٹلایا جا سکتا ہے۔ جھٹلانے والا عامل سائیکی ہی

ہو گا کیونکہ اِس کے ساتھ زمان ومکاں ایک نسبتی اور مشروط خصوصیت کے طور پر ہی منسلک ہوتا ہے۔ مخصوص حالات میں یہ اپنی ایک اساسی خوبی کی وجہ سے بھی زمان ومکاں کی تحدیدات کو توڑ سکتا ہے...... یہ خوبی اِس کا ورائے زمان اور ورائے مکاں فطرت کا حامل ہونا ہے۔ زمان ومکاں سے یہ ممکنہ ماورائیت بے اندازہ اہمیت کی حامل ہے۔ تاہم، ہمارے شعور میں موجودہ ترقی اِس قدر پسماندہ ہے کہ عمومی طور پر ہمارے پاس اب بھی ایسے سائنسی وعقلی آلات کا فقدان ہے کہ جو سائیکی کی فطرت پر اثر انداز ہونے والے ٹیلی پیتھی کے حقائق کی جانچ پڑتال کر سکیں۔ میں نے اِن مظاہر کا ذکر صرف یہ بتانے کے لیے کیا ہے کہ دماغ کے ساتھ سائیکی کا لگاؤ، یعنی اِس کی زمان ومکاں تحدید، اب پہلے کی طرح خود توضیحی اور نا قابلِ تردید نہیں رہی۔

دستیاب اور توثیق شدہ ورائی نفسیاتی (پیرا سائیکالوجیکل) مواد کا کم سے کم علم رکھنے والا شخص بھی جان لے گا کہ نام نہاد ٹیلی پیتھک مظاہر نا قابلِ تردید حقائق ہیں۔ دستیاب ڈیٹا کا ایک معروضی اور تنقیدی جائزہ دکھا دے گا کہ ادراکات واقع ہوتے ہیں، کہ جیسے جزوا نہ کوئی مکاں اور جزوا نہ کوئی زماں موجود ہے۔ فطری بات ہے کہ آپ اِس سے یہ مابعد الطبیعیاتی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے کہ اشیاء کی دنیا میں نہ مکاں اور نہ زماں موجود ہے، اور یہ کہ زمان-مکاں کیٹگری ایک جال ہے جس میں انسانی ذہن نے خود کو سراب کی صورت میں بُن رکھا ہے۔ زمان ومکاں ہمارے لیے نہ صرف نہایت دوٹوک اور قطعی ہیں بلکہ وہ تجربی لحاظ سے بھی واضح ہیں، کیونکہ ہر قابلِ مشاہدہ چیز زمان ومکاں میں ہی واقع ہوتی ہے۔ ٹیلی پیتھک مظاہر کی فطرت کو ماننے میں منطق کو مشکل پیش آنا قابلِ فہم ہے۔

سائیکی کی فطرت ہماری تفہیم کی حد سے کہیں آگے تک دھندلکوں میں جاتی ہے۔ اِس میں اُتنی ہی پہیلیاں ہیں جتنی کہ ہماری کائنات میں کہکشائیں۔ انسانی تفہیم کا انتہائی غیر قطعی پن دانشورانہ شور وغل کو نہ صرف مضحکہ خیز بلکہ قابلِ تضحیک طور پر غبی بھی بناتا ہے۔ چنانچہ اگر ہم اپنے دل کی ضرورتوں کے مطابق، یا انسانی دانش کے قدیم اسباق کی مطابقت میں، یا ٹیلی پیتھک ادراکات واقع ہونے کی نفسیاتی حقیقت کے احترام میں یہ نتیجہ اخذ کریں کہ سائیکی اپنی عمیق ترین پہنائیوں میں زمان ومکاں سے ماوراوجود کی ایک صورت میں حصہ دار ہے تو تنقیدی استدلال کو سائنس کی non liquet کے سوا اور کسی دلیل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ نیز آپ کو نامعلوم زمانوں سے

موجود اور ہمہ گیر انسانی سائیکی کے ایک رجحان کے ساتھ مفاہمت کا بے اندازہ فائدہ بھی ہوتا ہے۔ تشکیکیت یا پھر روایت کے خلاف بغاوت کے باعث یہ نتیجہ اخذ کرنے والے شخص کو ذہن کا پہل کار بننے کا بہت کم امکان میسر ہوتا ہے، لیکن اُس کا اپنے خون کی سچائیوں کے ساتھ تضاد میں پڑ جانا بلاشبہ یقینی ہے۔ بہر حال ہم کبھی نہیں جان پائیں گے کہ یہ سچائیاں مطلق ہیں یا نہیں۔ اُن کا ہمارے اندر ایک ''رجحان'' کے طور پر موجود ہونا کافی ہے۔ خون کی سچائیوں سے انحراف اعصابی بے سکونی پیدا کرتا ہے۔ بے سکونی لایعنیت کو جنم دیتی ہے، اور زندگی میں معنی کا فقدان روحانی عارضہ ہے جس کی مکمل وسعت اور اہمیت کا اندازہ ہمارا دور ابھی نہیں کر پایا۔

کارل گستاو ینگ

9
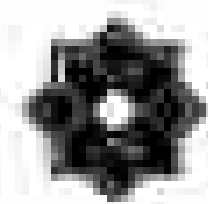
موت کی جانب رویے

یہودیوں کی مقدس کتاب تالمود میں ایک جگہ کہا گیا ہے، "ابتداً سے ہی تمام مخلوقات کے لیے موت تیار کر دی گئی ہے۔" زندہ ہونے کا مطلب موت اور نیستی کے امکان کا سامنا کرنا ہے۔ جہاں تک ہم تعین کر سکتے ہیں، انسان واحد ایسا جانور ہے جو اپنے مرنے کا شعور رکھتا ہے۔ موت ایک ایسی چیز ہے جو جلد یا بدیر ہم سب کو اپنے شکنجے میں کس لے گی۔ لائف انسورنش، یاد منانے کے دن، لافانیت پر یقین ...... یہ سب چیزیں ہماری دلچسپی اور تشویش کا ثبوت ہیں۔ تاریخی اور نسلیاتی انفارمیشن سے پتا چلتا ہے کہ موت کے حوالے سے غور وفکر ابتدائی ترین معلوم تہذیبوں میں بھی موجود تھا، اور اب عملاً تمام لوگوں میں ملتا ہے۔ کچھ محققین کا کہنا ہے کہ موت کا خوف ہمہ گیر ردعمل ہے اور یہ کہ کوئی بھی اِس سے آزاد نہیں۔ مثلاً فرائیڈ کے مطابق لاشعوری جبلت مرگ ہر کسی میں موجود ہے؛ وہ اِسے خود کو تباہ کرنے کے مخصوص رجحانات کے ساتھ جوڑتا ہے۔ ہمیں بس ٹل فائٹنگ جیسی کھیلوں، شراب یا منشیات کے عادی افراد کے طرز عمل کو ذہن میں لانے کی ضرورت ہے۔ میلانی کلائن کو یقین ہے کہ موت کا خوف تمام تر ذہنی تصورات کی جڑ ہے، اور لہٰذا وہ بالواسطہ تمام ذہنی پریشانی کی وجہ بھی ہے۔ ماہر دینیات پال ٹلچ (جس نے امریکی نفسیاتی علاج پر گہرا اثر ڈالا) نے اپنے نظریہ تشویش کی بنیاد اِس وجودیاتی بیان پر رکھی کہ انسان محدود اور فانی ہے۔ دیگر کے خیال میں وقت ہمارے لیے صرف اِس وجہ سے مفہوم رکھتا ہے کیونکہ ہم اپنے

مرنے کا احساس رکھتے ہیں۔ سٹیکل نے تو یہ مفروضہ بھی پیش کر دیا کہ ہمارا ہر خوف موت کے خوف کا ہی عکس ہے۔

سائیکوپیتھالوجی میں موت کے موضوعات اور تخیلات نمایاں ہیں۔ کچھ نفسیاتی مریضوں میں موت کے نظریات بار بار سامنے آتے ہیں۔ حقیقی عوامل سے شیزوفرینیائی انکار بھی ایک لحاظ سے موت کے امکان سے بچنے کا حیلہ ہے۔

موت زندگی کی لازمی اور بنیادی حقیقتوں میں سے ایک ہے۔ اِس کے باوجود کیموفلاج اور غیر صحت مندانہ گریز نے ہماری سوچ اور افعال کو کافی حد تک متاثر کیا ہے۔ حتیٰ کہ ہم روزمرہ زبان میں موت کا ذکر بھی اشاروں کنایوں میں کرتے ہیں: مثلاً "فلاں کے دن پورے ہو گئے؛" "فلاں گزر گیا۔" کرسچین سائنس مانیٹر نامی ایک مؤقر اخبار کچھ عرصہ پہلے تک "موت" کا لفظ اپنے صفحات میں شامل کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ زیادہ تر موویز ایلیے سے گریز اور ہمیشہ پرمسرت اختتام ہی پیش کرتی ہیں۔ مغرب میں اب مردے کو "بالکل زندہ" انداز میں آخری رسوم کے لیے تیار کرنے کے اشتہارات عام ہیں۔ انگلش ماہر بشریات جیوفری گورر کے مطابق آج ایک خاص مفہوم میں موت ہمارے لیے وہی ناقابل ذکر حیثیت اختیار کر گئی جو وکٹورین عہد میں سیکس کی تھی۔ وہ نشان دہی کرتا ہے کہ اُنیسویں صدی میں بیشتر پروٹسٹنٹ ممالک جسم کی گنہگاری اور حیات بعدالموت پر یقین رکھتے تھے۔ بیسویں صدی میں یہ تصورات کمزور پڑنے پر لوگ فطری موت اور جسمانی انتشار/اجزا پر بات کرنے سے اب زیادہ نہیں ہچکچاتے۔

نفسیاتی سوچ میں مستقبل کی حیثیت پر ضرورت سے کم سوچ بچار حیران کن ہے، کیونکہ بہت سے مواقع پر انسان سابقہ کی نسبت آئندہ واقعات کی روشنی میں ردعمل دیتا ہے۔ بے شک کسی شخص کی کچھ بننے کی جستجو کی بنیاد ماضی کے حالات پر ہو سکتی ہے۔ ماضی ایک تصور ہے جو اپنے بارے میں ہمارے تصور کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہم ماضی پر نظر ڈالنے کے ذریعہ "سیکھتے" اور آگے کی جانب دیکھنے کے ذریعہ "زندہ رہتے" ہیں۔ کسی شخص کی سوچ اور رویہ اُس کے نظریات، اُمیدوں اور موت کے خدشات سے کافی متاثر ہو سکتا ہے۔

دینیات اور فلسفہ دونوں نے موت اور اِس کے مفہوم کے مسئلے سے نمٹنے کی کوشش کی۔ تاہم، نفسیاتی ادب کا جائزہ لینے پر احساس ہوتا ہے کہ اِس شعبے کو باقاعدہ سائنسی تحقیق کے ماتحت لانے

کی کتنی کم منظم کوششیں ہوئی ہیں۔ میں موت کی جانب رویوں سے متعلق اپنی تحقیق کے کچھ عمومی نتائج کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ اِن تحقیقات کا تعلق شخصیت کی زیادہ گہری تہوں کی نسبت شعور اور عوامی رویوں کے ساتھ زیادہ ہے۔ نتائج کی بنیاد تین بڑے گروپس پر ہے: (1)-85 ذہنی مریض.......اوسط عمر 36 سال؛ (2)-40 بوڑھے افراد.......اوسط عمر 67 سال؛ (3)-85 ''نارمل'' اور 50 جوان افراد.......اوسط عمر 26 سال؛ اور 35 پروفیشنل لوگ.......اوسط عمر 40 سال۔

اس سوال کے جواب میں دو مرکزی نکتہ ہائے نظر سامنے آئے: ''آپ کے لیے موت کا مفہوم کیا ہے؟'' ایک نکتۂ نظر کے مطابق موت زندگی کے عمل کے فطری اختتام کا فلسفیانہ رنگ لیے ہوئے ہے۔ دوسرا نکتۂ نظر مذہبی نوعیت کا ہے جس کے مطابق موت جسمانی زندگی کی تحلیل اور ایک نئی زندگی کا آغاز ہے۔ ایک لحاظ سے یہ تحقیق فکری تاریخ میں موت کی تفسیر کو پیش کرتی ہے۔ مارکیوزے کے خیال میں اِن دو متضاد دھڑوں سے دو ممیز اخلاقی نظام وضع کیے جاسکتے ہیں۔ ''ایک طرف موت کی جانب رویہ ناگزیر کی رواقی یا تشکیکی قبولیت، یا حتیٰ کہ زندگی کے ذریعہ موت کی سوچ کو دبانا ہے؛ دوسری طرف موت کی نظریاتی تجلیل جو زندگی کو معنی دیتی ہے۔''

نارمل نوجوان لوگوں کے سوا تمام گروپس میں فلسفیانہ نکتۂ نظر بنیادی اور غالب ہے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ تمام گروپس، بالخصوص ذہنی مریضوں میں آپ موت کے متعلق سوچ کو اِس قدر باعثِ پریشانی پاتے ہیں کہ وہ اِس بارے میں کبھی سوچنے سے ہی انکار کردیتے ہیں۔ مریضوں کے تصورِ موت کا ایک پہلو بھی قابلِ بحث ہے: موت کو متشدد ذرائع سے واقع ہونے کے طور پر پیش کرنا۔ قیاس ہے کہ موت پر پرتشدد تصور دوسروں اور اپنے خلاف جارحانہ جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

دوسرا سوال یہ پوچھا گیا کہ ''اگر آپ کی موت یقینی ہو اور آپ کے پاس ایک آخری کام کرنے کی ہی مہلت باقی ہو تو آپ کیا کرنا پسند کریں گے؟'' ذہنی مریض افراد نے سماجی اور مذہبی قسم کی سرگرمیوں کو ترجیح دی، مثلاً اپنی ساری املاک کو خیرات کرنا، اگر ممکن ہو تو جنگ کو روکنا، خدا کے بارے میں جاننا، وغیرہ۔ نارمل گروپس نے ذاتی خوشیوں اور خواہشات کی تسکین پر زور دیا، مثلاً ساری دنیا کا سفر کرنا، نئے گھر میں رہنا، وغیرہ۔

گروپس سے پوچھا گیا کہ اُن کے خیال میں عمر کے کن حصوں میں موت کا خوف سب سے زیادہ اور کم ہوتا ہے۔ مریضوں اور بوڑھے افراد نے ستر برس سے زائد عمر کے حصے کو اِس لحاظ سے

سب سے زیادہ خوف ناک بتایا'' کیونکہ تب تک آپ موت کے کافی قریب پہنچ چکے ہوتے ہیں۔'' تاہم نارمل گروپس نے چالیس اور پچاس کی دہائیوں (یعنی چالیس تا پچاس سال کی درمیانی عمر) کو موت کی خوف ناک سوچوں کا دور بتایا؛ ''کیونکہ تب موت ایک واضح امکان بن جاتی ہے اور آپ اُسے نظر انداز نہیں کر پاتے؛'' ''آپ اپنی کامیابیوں کا پھل کھانا چاہتے ہیں جبکہ کچھ کرنے کی زندگی ختم ہو رہی ہوتی ہے۔'' دلچسپ بات یہ کہ بوڑھے لوگوں نے ستر سال سے زائد عمر کے علاوہ بچپن کو بھی موت کے متعلق سوچوں کا دور بتایا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ابتدائی زندگی کے تجربات موت کی جانب رویوں کو کافی حد تک متاثر کرتے ہیں۔ متعدد حوالوں سے اِس امر کے شواہد ملے ہیں کہ ذہنی مریضوں کی اکثریت کا تعلق ایسے گھرانوں سے ہے جہاں اُنہوں نے استرداد اور محرومی کا تجربہ کیا ہوتا ہے۔ موت کا خوف سب سے کم محسوس ہونے کی عمر کے متعلق سوال کا جواب دیتے ہوئے نارمل لوگوں نے بچپن کا ذکر کیا۔ یعنی اُن کے خیال میں بچپن میں موت کا خوف سب سے کم ہوتا ہے، ''کیونکہ تب آپ موت سے واقف نہیں ہوئے ہوتے، اور ساری زندگی آگے پڑی نظر آتی ہے۔'' ستر سال اور زائد عمر کے دور کو بھی موت کے خوف سے عاری بتایا گیا، ''کیونکہ آپ موت کو تسلیم کر چکے ہوتے ہیں، اور زندہ رہنے کو زیادہ کچھ باقی نہیں ہوتا۔'' کچھ بوڑھے افراد کے جوابات سے حاصل کردہ نتائج کے مطابق مخصوص لوگ بڑھاپے میں موت سے زیادہ بیکاری اور بے وقعتی سے ڈرتے ہیں۔

لگتا ہے کہ ذہنی بیماری یا پریشانی کی زیادہ یا کم شدت موت کی جانب مریضوں کے مجموعی رویوں پر بہت کم اثرات ڈالتی ہے۔ اعصابی اور نہ ہی نفسیاتی مرض موت کی جانب کوئی ایسا رویہ پیدا کرتا ہے جو نارمل مریضوں میں نہ ملتا ہو۔ جذباتی گڑبڑ مخصوص رویوں کو بس سطح پر ہی لے آتی ہے۔ یہ نتائج برومبرگ اور شلیڈر کی تحقیقات کی توثیق کرتے ہیں۔

جنس کی مناسبت سے اعداد و شمار کا تجزیہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ مردوں کی نسبت عورتیں موت کے متعلق زیادہ سوچتی ہیں۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ موت کے متعلق سوچنے اور موت کے خوف کے درمیان کوئی لازمی تعلق نہیں ہے۔

''آپ عموماً کس بیماری کو اپنی موت کا سبب بنتے ہوئے تصور کرتے ہیں؟'' پروفیشنل لوگوں کے گروپ میں ماہرین نفسیات اور ڈاکٹروں کے سوا سبھی نے اِس سوال کا جواب ''کوئی بھی نہیں''

دیا۔ ڈاکٹروں نے اس کی وجہ بتائی: ''کیونکہ یہ پیشہ ورانہ مسئلہ ہے اور میں اِس بیماری میں مبتلا بھی ہوں۔'' ماہرین نفسیات کے خیال میں: ''یہ بیماری ہمارے خاندان میں ہے اور مجھے اِس کے اثرات محسوس ہونے لگے ہیں۔'' اس کے علاوہ کینسر کا ذکر سب سے زیادہ کیا گیا کیونکہ ''میرے مریض اِس بیماری کا شکار ہوئے، یہ بہت عام ہے اور یہ چھپ کر وار کرتی ہے۔'' کچھ نارمل لوگ خود کو کسی ایکسیڈنٹ میں موت کا شکار ہوتے تصور کرتے ہیں۔ جبکہ بوڑھے لوگوں نے خود کو گاڑی کے نیچے آ کر یا گولی لگنے کے باعث مرتا ہوا تصور کیا۔

مرنے کے قابل ترجیح انداز، جگہ اور وقت کے متعلق پوچھے جانے پر سبھی گروپس کی ایک واضح اکثریت نے کہا کہ وہ کم سے کم تکلیف کے ساتھ ایک دم مرنا چاہتے ہیں...... پرامن طریقے سے سوتے ہوئے۔ بقیہ کچھ لوگوں نے مرنے کا لمحہ آنے سے پہلے کافی مہلت کو ضروری خیال کیا تاکہ اپنے عزیز و اقارب کو الوداع کہہ سکیں۔ ''گھر میں'' یا ''بستر پر'' موت کے لیے بالخصوص قابلِ ترجیح مقامات ہیں۔ البتہ کچھ ایک نے انوکھی جگہیں بھی بتائیں...... مثلاً باغ میں، سمندر کا نظارہ کرتے ہوئے، وغیرہ۔ ہر گروپ میں پندرہ تا بیس فیصد کے مطابق موت آنے کی جگہ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ سوچتے ہیں کہ آیا یہ جواب کسی سطح پر ہمارے مرنے کے جدید طریقے کا ردِعمل تو نہیں۔ اب ہم لوگ اپنے گھروں کے اندر اہل خانہ کے درمیان، اور کم سے کم ادویات لیتے ہوئے نہیں مرتے۔ ہم اعلیٰ طبی سہولیات سے لیس کسی ''بڑے'' ہسپتال میں دم توڑتے ہیں، ہماری رگوں میں مختلف نالیاں اور منہ پر آکسیجن ماسکس لگے ہوتے ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ موت کو ایک پبلک واقعہ بنا کر اِس کی حقیقت کو مبہم بنا دیا گیا ہے...... ایک ایسی چیز جو ہر کسی کے ساتھ پیش آتی ہے نہ کہ کسی ایک مخصوص شخص کے ساتھ۔

موت کے وقت کے حوالے سے زیادہ تر لوگوں نے کہا کہ وہ رات کے وقت مرنا چاہتے ہیں کیونکہ اِس طرح تمام متعلقہ افراد کو زیادہ مصیبت نہیں اٹھانا پڑے گی۔ ''مصیبت'' کے متعلق یہ ترجیح شدید بیمار مریضوں کے رویوں میں واضح ہے۔ غالباً ہمارا ثقافتی رویہ دوسروں پر منحصر ہونے کی حالت میں ہمارے اندر احساسِ جرم پیدا کرتا ہے۔ نیز موت گرفتہ مریض موت کی لازمی منزل سے بچ کر مزید جینے کی خواہش ظاہر کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ رات کے وقت سکون سے مرنے کی خواہش متعدد علامتی اہمیتیں رکھتی ہے۔ ایلیڈ میں ہومر نے نیند (ہپناس) اور موت (تھاناٹوس)

کو جڑواں بھائی بتایا...... اور بہت سی مذہبی دعاؤں میں نیند و موت کے تصورات باہم گندھے ہوئے ہیں۔ مثلاً بنیاد پرست یہودی صبح بیدار ہونے پر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اُس نے ایک مرتبہ پھر زندگی کو بحال کر دیا۔

ڈیٹا جمع اور اُس کی جانچ پڑتال کرنے کے دوران پتا چلا کہ موت سے خوف زدہ مخصوص لوگ مذہبی نکتۂ نظر میں پناہ لیتے ہیں۔ میرے خیال میں مذہبی اور غیر مذہبی لوگوں کے درمیان موازنہ کرنا مفید رہے گا۔ مذہبی گروپ (تعداد 40) کی اوسط عمر 31.5 سال تھی؛ اور غیر مذہبی گروپ (تعداد 42) کی 34 سال۔ مذہبی گروپ کے خصوصی عقائد حیات بعد الموت، کائنات پر خدا کی قدرتِ مطلق اور مذہبی صحائف کی صداقت پر یقین رکھتے تھے۔ سبھی مذہبی افراد کو ایک جیسا نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہی معاملہ غیر مذہبی لوگوں کے ساتھ ہے۔ افراد اپنی اقدار (معاشرتی طرزِ عمل، جذباتی سہارا، احساسِ رفاقت وغیرہ) مذہبی رکنیت کے ذریعہ اخذ کر سکتے ہیں اور اُن کا مذہبی عقیدے پر کاربند ہونا لازمی نہیں۔ اِسی طرح افراد کسی باقاعدہ مذہبی لگاؤ کے بغیر ہی کسی مذہبی روایت سے تعلق کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ اور اکثر کسی فرد کی اقدار اور اُس کے عقیدے کی تقاضا کردہ اقدار کے درمیان فرق بھی ہوتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر کچھ لوگ مذہبی عقائد پر تو اصرار کرتے ہیں مگر اُن پر عمل نہیں کرتے۔ کچھ دیگر لوگ ''بے رحم تقدیر کے تھپیڑوں سے بچنے کی خاطر'' مذہب کو بطور ڈھال اپناتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو مذہبی عقائد کو روزمرہ زندگی کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ اِس شعبے میں زیادہ واضح اور ممیز کیٹگریاں بنانے کی ضرورت ہے۔ مثلاً موت کی جانب رویے مختلف عقائد کے حامل گروپس میں مختلف ہو سکتے ہیں۔ تاہم، یہاں ہمارا مقصد بنیاد پرست اور غیر بنیاد پرست نکتۂ نظر میں کچھ عمومی رجحان کا اندازہ کرنا تھا۔

مذہبی شخص غیر مذہبی شخص کے مقابلے میں ذاتی طور پر موت سے زیادہ ڈرتا ہے۔ غیر مذہبی شخص کے خوف کی وجوہ اور قسم کی ہوتی ہیں، مثلاً ''میرے خاندان کی کفالت کون کرے گا؛'' ''میں مرنے سے پہلے فلاں فلاں کام کرنا چاہتا ہوں؛'' ''میں زندگی سے مزہ اُٹھا رہا ہوں اور مزید جینا چاہتا ہوں۔'' یعنی غیر مذہبی شخص اگلی زندگی میں حاصل ہونے والی چیزوں کی بجائے اِس دنیا میں پیچھے رہ جانے والی چیزوں کے بارے میں فکر مند ہوتا ہے۔ مذہبی شخص پر دباؤ دوگنا ہے: حیات بعد الموت کے حوالے سے پریشانیاں، مثلاً ''شاید میں دوزخ میں جاؤں؛'' ''ابھی میں نے اپنے

گناہوں کا کفارہ ادا نہیں کیا''...... اس کے علاوہ وہ دنیاوی زندگی کے خاتمے سے بھی خوف کھاتا ہے۔ موت سے ذاتی خوف کو تسلیم کرنے میں مذہبی شخص کے زیادہ ایمان دار ہونے یا نہ ہونے کا اندازہ کرنے کے لیے میرے خیال میں موت سے انفرادی خوف اور جنت و دوزخ کے خوف کے درمیان تعلق کا تعین کرنا مفید ہوگا۔ اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ اپنے جنت میں جانے کا یقین بھی کچھ مذہبی لوگوں کو موت کے خوف سے راحت دلانے کے لیے کافی نہیں۔ مذہب کی جانب مائل لوگوں کی جانب سے آخری عمر میں ظاہر کردہ موت کا خوف اور ان نتائج کو ملا کر دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ کچھ لوگ مذہب کو بطور دفاعی ڈھال استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے مطالعہ میں آنے والے مذہبی افراد غیر مذہبی افراد کی نسبت آخری عمر میں زیادہ منفی رجحان رکھتے ہیں۔

اس تناظر میں مجھے یقین ہے کہ ہمارے معاشرے کے بہت سے دھڑوں میں ''چشمۂ شباب'' کی تلاش کافی حد تک موت سے متعلقہ پریشانیوں کا عکس ہے۔ بوڑھوں کو مسترد کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ہمیں موت کی یاد دلاتے ہیں۔ پروفیشنل لوگوں، بالخصوص ڈاکٹروں (جنہیں صعب العلاج مریضوں سے واسطہ پڑتا ہے) نے اپنے اندر گریزانہ رجحانات دیکھے ہیں۔ مثلاً میڈیکل انٹرنز میں موت کی جانب خلافِ خوف (Counterphobic) رویے دیکھے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹروں کا یہ رویہ قابل فہم ہے۔ لیکن میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ کچھ ڈاکٹر موت گرفتہ مریضوں کو اس لیے اُن کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ وہ اُن کے اندر اپنی موت کے خوف جگاتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ تحقیق دلچسپ ہوگی کہ جان بچانے والے مسیحائی پیشے سے وابستہ لوگوں کا موت کی جانب اپنا رویہ کس قسم کا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بیشتر صحت مند لوگ کسی اور کو مرتا دیکھ کر ذہنی پریشانی محسوس کرتے ہیں۔ موت کی حقیقت سے براہِ راست سامنا ہونے پر غالباً اُن کی ایگو کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔

یہ امر بھی متعلقہ ہے کہ جب نفسیاتی ادب میں موت کے متعلق ذہنی پریشانی کا ذکر آئے تو اسے ہمیشہ ایک ضمنی اور ثانوی مظہر بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ فرائیڈ نے موت سے خوف کو آختگی کی تشویش اور محبت کا معروض کھونے کے خوف سے اخذ کیا...... یعنی ماں سے علیحدہ ہونے کا خوف۔ اس بات کا ٹھوس کلینکل ثبوت موجود ہے کہ اس قسم کی اُلجھن پیدا ہوتی ہے۔

معاملہ چاہے کچھ بھی ہو، میرے خیال میں ہم صعب العلاج مریضوں کے ساتھ سلوک میں

جو نہایت سنگین غلطیاں کرتے ہیں اُن میں سے ایک غلطی زندہ اور موت گرفتہ شخص کے درمیان نفسیاتی رکاوٹ قائم کر دینا ہے۔ کچھ لوگوں کے خیال میں موت گرفتہ لوگوں کے ساتھ موت کے متعلق بات کرنا ظالمانہ فعل ہے۔ لیکن میری تحقیقات کے مطابق مریض موت کے متعلق اپنے خیالات و احساسات پر بات کرنے کے بہت زیادہ خواہش مند ہوتے ہیں، لیکن ہم زندہ لوگ انہیں ایسا نہیں کرنے دیتے۔

موت کی جمہوریت ہم سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہ اپنی اصل آمد سے بھی پہلے موجود ہوتی ہے۔ اسے مسترد یا نظر انداز کرنے سے زندگی کا انداز مسخ ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ کہیں گے کہ ''موت کے بارے میں سوچ کر وقت ضائع مت کرو۔ جتنا وقت ہے اُسے اچھی طرح گزارو۔ ہر چیز کے خاتمے کو ذہن میں رکھنے سے ہمارے حال کی کوششیں بے کار محسوس ہونے لگتی ہیں۔'' لیکن انفرادی شعور کے خاتمے کو ذہن میں نہ لانا کس قسم کی توافق پذیری ہے؟ موت کے بارے میں ہماری تشویش زندگی سے انکار یا اغماض کی علامت نہیں۔ بلکہ موت سے آگہی حاصل کرنے میں ہم زندگی کے بارے میں اپنی آگہی کو تیکھا کرتے ہیں۔ سینٹ آگسٹائن نے اپنی مشہور کتاب ''اعترافات'' میں کہا ہے کہ موت کا سامنا کرنے کے ذریعہ ہی انسان کی حقیقی ذات جنم لیتی ہے۔ انسان زندگی میں موت کے تصور کو رچانے کے ذریعہ ہی خود کو مکمل طور پر سمجھنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ پہلی صدی عیسوی میں رومن فلسفی سینیکا نے یہ بات اِن الفاظ میں کہی: ''زندگی کا حقیقی ذائقہ وہی چکھتا ہے جو اسے خیر باد کہنے کو تیار اور آمادہ ہو۔'' 1956ء میں امریکی شاعر جے سٹوارٹ نے دل کے حملے سے صحت یاب ہونے کے بعد کہا تھا: ''کوئی بھی شخص موت کے قریب جائے بغیر حقیقی معنوں میں جینا شروع نہیں کرتا۔''

موت کو اپنے ذہن سے باہر رکھنے یا اسے کوئی اہمیت نہ دینے کی کوششیں انسان کی خود فریبی ہے۔ انسان اپنی زندگی کی اس ناگزیر حقیقت کو نظر انداز کرنے کی چاہے کتنی ہی کوشش کر لے مگر اس میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ایک خاص مفہوم میں موت کو قبول کرنے کی آمادگی زندگی کی ایک لازمی شرط نظر آتی ہے۔ جینے کی ایک نا قابلِ فرار خواہش کے تابع ہوئے بغیر ہم اپنے کسی بھی فعل میں آزاد نہیں ہو سکتے۔ اس اعتبار سے روزمرہ زندگی کے خطرات، مثلاً ڈرائیونگ، بے معنی ہو جاتے ہیں۔ زندگی تب تک حقیقی معنوں میں ہماری نہیں بنتی جب تک ہم اسے مسترد نہ کر دیں۔

مانٹینی نے کہا کہ ''صرف وہی آدمی غلامی سے آزاد ہوتا ہے جو موت کے خوف میں مبتلا نہ رہے۔'' اس چیز نے ہماری سائنس، طب اور ٹیکنالوجی میں بہت سی ترقیوں کو مہمیز دی ہے۔ انسان موت کے خوف پر غلبہ پائے بغیر سات سمندروں میں جہاز رانی یا ہوابازی نہیں کرسکتا۔ اور مستقبل میں یہ شرط خلا کی نئی وسیع وعریض دنیاؤں کو ہماری اقلیم علم کا حصہ بنائے گی۔

اوپر مہیا کیے گئے مواد کی مطابقت میں اخذ کردہ کچھ ابتدائی نتائج کا تعلق صعب العلاج مریضوں میں موت کی جانب رویے سے ہے۔ اُن میں سے بیش تر افراد اپنے ڈاکٹروں کے ساتھ بیماری کی سنگین نوعیت کے متعلق سیدھی سادی اور ایماندارانہ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ وہ خوف زدہ یا سراسیمہ ہونے کی بجائے اپنی بات سمجھانے اور موت کے متعلق گفتگو کو بہتر خیال کرتے ہیں۔ اس خیال میں سچائی موجود ہے کہ نہایت خوف ناک حیثیت کے مقابلہ میں نامعلوم کا خوف کہیں زیادہ سنگین ہوتا ہے۔ صعب العلاج مریضوں کی ایک وسیع اکثریت نے کوئی خارجی ردعمل ظاہر نہ کیے۔ کچھ ایک نے تو موت کے متعلق گفتگو کا موقعہ فراہم کرنے پر انٹرویو کرنے والی ٹیم کا شکریہ ادا کیا۔ موت گرفتہ شخص کو اِس احساس سے زیادہ دکھ کسی چیز کا نہیں ہوتا کہ اُسے چھوڑ دیا اور مسترد کر دیا گیا ہے۔ مریض بہ آسانی یہ اطلاع ہضم اور برداشت کرسکتے ہیں کہ مستقبل قریب میں اُنہیں موت آجائے گی، لیکن وہ اِس کی جانب آہستہ آہستہ اور مرحلہ بہ مرحلہ جانا چاہتے ہیں۔

مرنے کا عمل انحصاریت، لاچار، بے بسی، ندامت اور تکلیف کے خوف سے منسلک ہے۔ کچھ لوگوں کے لیے یہ سارا عمل بذاتِ خود موت سے کہیں زیادہ خوف ناک ہوتا ہے۔ اِس کے علاوہ کلینیکل مشاہدے سے پتا چلتا ہے کہ بہت سے افراد کے لیے موت کو دنیاوی چیز سمجھنا اور موت کو اپنے قریب دیکھنا دو قطعی مختلف معاملات ہیں۔ یہ اطلاع آپ پر کوئی شدید اثرات نہیں ڈالتی کہ مستقبل قریب میں آپ کی موت واقع ہوجائے گی۔

مختلف لوگ اِس معلومات کو مختلف انداز میں لیتے ہیں۔ موت ایک کثیر پہلو علامت ہے، جس کی نوعیت اور تقدیر کا انحصار فرد کی ذاتی نشوونما اور اُس کے ثقافتی تناظر پر ہے۔ بہت سے لوگوں کے لیے موت ایسی ماورائی صداقتیں سکھاتی ہے جنہیں زندگی کے دوران سمجھا نہیں جاسکتا۔ دیگر کے خیال میں موت ایک دوست ہے جو پرامن نیند کے ذریعہ دکھ سے نجات دلاتی ہے۔ شیکسپیئر کا میکبتھ مقتول بادشاہ ڈنکن کے بارے میں کہتا ہے: ''زندگی کے ہیجان انگیز بخار کے بعد وہ امن

میں سو رہا ہے؛'' ہائنے کا خیال تھا، ''موت ایک سرد رات ہے۔'' دیگر، مثلاً لارڈ بالفور نے موت کو ایک ایڈونچر خیال کیا...... ایک عظیم اور نیا آنے والا تجربہ۔ کسی اور کا کہنا ہے کہ موت ایک عظیم تخریب کار ہے، جس کے ساتھ آخری دم تک لڑنا چاہیے۔

آخر میں ہم یہ کہیں گے کہ کسی شخص کی زندگی میں پیدائش ایک اختیار سے باہر واقعہ ہے، لیکن زندگی سے رخصت ہونے کا انداز فلسفۂ زندگی و موت کے ساتھ ایک قطعی تعلق رکھتا ہے۔ موت کی جانب رویے اور فرد کے لیے اس کا مفہوم ردعمل کو فیصلہ کن انداز میں متشکل کرسکتے ہیں۔ میرے خیال میں موت کے نفسیاتی اور سماجی پہلوؤں کو زیادہ بہتر انداز میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔

ہرمان فیفل

10
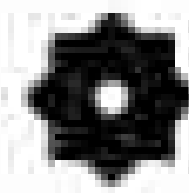
موت کا خوف

گزری صدیوں کے پردے پر خاکے کی مانند کھنچا ہوا طبعی انسان زیادہ تر ایک جامد شبیہ ہے۔ نوحجری دور کی بشریات کے ماہرین ہمیں بتاتے ہیں کہ ہمارے بعیدی اجداد کے جسم بالکل ہمارے جسموں کی طرح کام کرتے تھے۔ اُن میں بھی ہمارے والی تمام خوبیاں اور خامیاں موجود تھیں۔ تاہم، سماجی اور متفکر انسان اپنے کرومیگنن بھائی کی نسبت ایک کافی مختلف مخلوق ہے۔ کیونکہ اُس نے اپنی ہوشیاری کی مدد سے سیکھا کہ فطرت کی مخالف قوتوں کے خلاف طاقت کی بجائے دماغ سے کیسے کام لینا ہے۔ جسمانی طاقت کی بجائے ذہنی قوت استعمال کرنے کے ذریعہ ہی اُس نے غار سے جھونپڑے کی جانب درجہ بدرجہ سفر کیا۔

اس ساری پیچیدہ ترقی کے عمل میں موجودہ انسان کو ماضی کے انسان سے ممیز کرنے والا نہایت بیّن وصف طبعی حالات کو بدلنے اور کنٹرول کرنے میں پیہم بڑھتی ہوئی قابلیت ہے۔ یہ حقیقی معنوں میں جدید انسان کا طرۂ امتیاز ہے۔ اور آج کا انسان تاریخ کے کسی بھی دور کے انسان کی نسبت طبعی دنیا پر کہیں زیادہ مختار بن گیا ہے۔ ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں اُس نے نہ صرف تیز رفتاری سے حرکت کرنا اور بہ آسانی ایک سے دوسری جگہ جانا بلکہ پہاڑوں اور دریاؤں کو بھی اپنی جگہ سے ہلانا سیکھ لیا ہے۔ اُس نے اپنی زندگی کو زیادہ آرام دہ بنانے کے لیے ایٹم سے کام لینا سیکھا ہے اور اپنے ساتھ بھی اسی قدر مہارت وسیادت کا مظاہرہ کیا ہے۔ انسان نسل در نسل سے جسمانی تکلیف کی اذیت میں مبتلا تھا۔ نئی اور بہتر ادویات نے اس لعنت سے کافی حد تک چھٹکارا دلایا۔ علم

طب کے ذریعہ انسان اپنے لیے اوسطاً 36.7 سال فالتو زندگی حاصل کرنے کے قابل ہوا۔ ہمارے اجداد کے برعکس آج کروڑوں لوگ شدید بھوک کے تجربے سے گزرے بغیر ہی اپنی زندگی کا سفر بہ آسانی طے کرنے کے قابل ہیں۔

یہ انسان اور اُس کی تسخیرات کا دور ہے، اور ہم اس بات کو ایک یقینی اور تسلیم شدہ چیز کے طور پر لینے لگے ہیں کہ انسان کسی بھی مشکل سے نمٹ سکتا اور کسی بھی مسئلے کا حل ڈھونڈ سکتا ہے۔ کامیابی نوعِ انسانی کی عادت بن گئی ہے۔ چنانچہ ہمارا اس یقین کی جانب مائل ہونا حیرت انگیز نہیں کہ ٹھوس ارادے اور عزم کے ذریعہ کچھ بھی کر کے دکھایا جا سکتا ہے۔

لیکن انسانی فتوحات کی اس مناجات کی ایک واضح استثنیٰ موجود ہے...... ایک ایسا مسئلہ جس میں ہمارا تمام تیقن، قابلیت اور مہارت، عقل و دانش بے کار ہو جاتی ہے؛ ایک ایسا پہلو جو ہماری استعدادوں سے باہر ہے۔ یقیناً میری مراد مظہرِ موت سے ہے۔ انسان اپنی تمام تر چالاکی اور ہوشیاری کے باوجود اس حوالے سے بے بس ہے۔ وہ موت کو مؤخر کر سکتا، اُسے منطقی دلائل کے ذریعہ مسترد تو کر سکتا ہے لیکن اس سے فرار نہیں پا سکتا۔

چنانچہ ہم اس پریشانی سے نمٹنے کی کوشش میں جادو اور غیر منطقی پن میں رجعت کا ہمہ گیر رجحان رکھتے ہیں...... حالانکہ آج کے دور میں سائنس اور سائنسی طریقہ کار پر یقین راسخ ہو چکا ہے۔

غور و فکر کرنے پر ہی پتا چلتا ہے کہ ہم ایسا کس حد تک کرتے ہیں۔ اول، ہم موت کا ذکر بطور موت نہیں کرتے، بلکہ ''گزر گئے'' یا ''چلے گئے'' جیسے استعاراتی الفاظ ہی استعمال کرتے ہیں۔ ہر ثقافت کے ہر عہد میں ایسا ہوا۔ انگریزی کا لفظ ''Perish'' لاطینی کے لفظ ''گزر گئے'' سے مشتق ہے؛ یعنی اُس دور میں بھی زندگی کے دنوں کو ختم ہونے والے اور محدود سمجھنے سے انکار کیا جاتا تھا۔ ہم نے خود بھی ایک نہایت مہنگی صنعت قائم کر رکھی ہے جس کا واحد مقصد ہمیں اس کی موجودگی کے سنگین حقائق سے محفوظ رکھنا ہے۔ ہم مردے کو محفوظ رکھنے اور دیدہ زیب بنانے اور اُسے عارضی نیند کی حالت میں دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ نیز، ہم میں سے زیادہ تر لوگ ایسے مذہبی اور فلسفیانہ نظاموں کو مانتے ہیں جو یقین دلاتے ہیں کہ موت اصل میں موت نہیں بلکہ ایک مصنوعی تجربہ ہے، نئی اور زیادہ اہم ہستی پانے سے پہلے ایک عارضی عبوری دور ہے۔ ان میں سے زیادہ تر کا مقصد ایک لافانی حالت کی موجودگی کی ضمانت دینا ہی ہے۔ ہم اس قدر پُرعزم انداز میں اپنی

اموات کی حقیقت سے فرار پاتے اور نہایت ساحرانہ اور مدافعتی طریقے اختیار کرتے ہیں کہ انسانی مسائل کے کسی اور شعبے میں انہیں لاگو کرنے سے یہ نہایت واضح ہو جائیں گے۔

تاہم، یہ ذہن میں رکھنا ہوگا کہ یہاں میرا مقصد ان دساتیر اور عقائد کی حوصلہ شکنی یا تردید کرنا نہیں، بلکہ صرف اُنہیں بیان کرنا ہے؛ کیونکہ ہمہ گیر سطح پر اُن کی موجودگی اور وسیع قبولیت کی وجہ سے ہم اُن کے دفاعی مقصد اور پیراڈاکسیکل کردار کو نہیں دیکھ پاتے۔

واضح نظر آتا ہے جدید انسان اس معاملے میں قدیم انسان سے کچھ زیادہ دور نہیں گیا۔ وہ اپنے چرم پوش جدامجد کے ساتھ اس عقیدے میں شریک ہے کہ موت ایک ظاہری تجربہ ہے اور حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہیں۔ نیز، وہ ذرہ برابر بھی ثبوت کی عدم موجودگی میں یہ رائے رکھتا ہے۔ یہاں وہ حقیقت کی کسوٹی سے بچنے میں قطعی ہٹ دھرمی دکھاتا ہے۔ لیکن میں ہستی کے ایک مرکزی اور ناقابلِ فرار امر، یعنی محدودیت اور فانی پن سے نوعِ انسانی کے گریز پر بات نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ میرا مقصد یہ نشان دہی کرنا ہے کہ ساحرانہ سوچ اور سرابِ خیال پر بہت زیادہ انحصار فرد اور معاشرے دونوں کے لیے جذباتی بیماری اور صحت کے مسائل پیدا کرتا ہے، جو براہِ راست نفسیاتی علاج کا شعبہ ہے۔

نفسیاتی علاج کا شعبہ ہمیشہ سے انسانی کردار اور سوچ کے اُن پہلوؤں کی تشریح و توضیح میں منہمک رہا ہے جنہیں اوسط انسان ماننے سے انکار کرتا ہے۔ تاہم، یہ ایک حیرت انگیز اور اہم حقیقت ہے کہ موت کا خوف یا (خوفِ مرگ-Thanatophobia) اس کے متعلق پریشانی کے بارے میں نفسیاتی یا تحلیلی نفسیاتی لٹریچر میں کوئی وضاحت نہیں ملتی۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ دیگر فانی انسانوں کی ہی طرح ماہرین نفسیات بھی ایک ایسے مسئلے کی تفتیش کرنے سے کتراتے ہیں جو ہر انسان کے دل میں بسا رہتا ہے؟ شاید اپنے مریضوں کی طرح وہ خود بھی ڈی لا روشے فوکالڈ کے اس قول کو مانتے ہیں کہ ''آپ سورج یا موت کی جانب براہ راست نہیں دیکھ سکتے۔'' یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ نفسیاتی لٹریچر میں موت کے متعلق ذہنی پریشانی کا ذکر اکثر ایک اختراعی اور ثانوی مظہر کے طور پر آیا۔

موت کے خوف اور اس سے بچنے کے لیے دفاعی ساحرانہ حربوں کا مطالعہ زبردست اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ نفسیاتی علاج کا یہ تجربہ مستقل نوعیت کا ہے کہ کسی بنیادی داخلی یا خارجی حقیقت

سے متواتر فرار میں مدد دینے والا کوئی بھی دفاعی حربہ نفسیاتی لحاظ سے بہت مہنگا پڑتا ہے۔ یہ گریز یا انحراف دیگر ذرائع سے آنے والی توانائی کو استعمال کر لیتا ہے اور ایک بے دھڑک، آزاد اور تخلیقی انداز میں زندگی گزارنے کے قابل نہیں رہنے دیتا۔ خود کو اور زندگی کو صاف اور کُھلی طور پر دیکھنے میں ایک فائدہ اور برتری ہے، اور ہم اپنے مسائل کے حل یا اپنے اعتقادات کی تشکیل میں فرار پسندی، فریب خوردگی، ساحرانہ سوچ یا دفاعی حربوں کی جتنی زیادہ کفایت کریں گے ہماری زندگیاں بالعموم اُتنی ہی خوش گوار اور بھرپور بنتی جائیں گی۔ ابھی ہمیں یہ تعین کرنا ہے کہ کیا موت کا خوف اپنے ماخذ (یعنی موت) کی حقیقی اور بے اختیار نوعیت کی وجہ سے اس مقولے سے مستثنٰی ہے۔ لیکن اگر قطعی نہیں تو نشان دہی کرنے والے جواب ضرور موجود ہیں۔ اور یہ بات عیاں ہے کہ موت کا خوف اور اس کا اثر گھٹانے کے غیر منطقی طریقے ایک پیراڈاکس پیش کرتے ہیں جن کی تفتیش اُنہی طریقوں کی مدد سے کی جا سکتی ہے جو کرداری سائنسز انسانی فنکشن یا توافق پذیری کے کسی بھی اور پیراڈاکسیکل پہلو کے مطالعہ میں استعمال کرتی ہیں۔

ماہر نفسیات انسانی زندگی میں کسی غیر منطقی پیراڈاکس سے سابقہ پڑنے پر اس کی تشریح و توضیح کے لیے متعدد ذرائع سے رجوع کرتا ہے۔ سب سے پہلا ذریعہ تو اُس کی اپنی ذات ہے، اور وہ ایک تفصیلی ذاتی تحلیل نفسی کی صورت اختیار کرتا ہے۔ کھوج کا دوسرا بڑا میدان سائیکو پیتھالوجی کا شعبہ ہے...... نیوراتی (اعصابی) یا نفسیاتی خلل والا رویہ ظاہر کرنے والے افراد کا مطالعہ۔ شاید آپ سوچیں کہ ایک ابنارمل ذہنی عمل کا مطالعہ ہمیں ''نارمل'' کے بارے میں کچھ کیسے سکھا سکتا ہے۔ تاہم، معاملہ یقیناً ایسا ہی ہے۔ کیونکہ ذہنی اور جذباتی عارضے کی ہر ایک مثال میں انسانی سائیکی کے مختلف پہلو بہت نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں۔ جس طرح خردبینی جرثوموں کا مطالعہ کرنے والا شخص خردبین سے خلیوں کو بہت بڑا کر کے دیکھتا ہے اور اپنے دیکھے ہوئے مختلف حصوں کی بنیاد پر ایک مکمل تصویر بناتا ہے، اُسی طرح نفسیاتی معالج کا ہر کیس نفسیاتی فنکشن کے مختلف پہلوؤں کو ملا کر ایک واضح اور اُبھری ہوئی تصویر تراشتا ہے۔ اس طرح وقت گزرنے پر تجربہ کار ماہر نفسیات نارمل نفسیاتی ڈھانچے کی بالکل درست ترکیب قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

خوابوں کا مطالعہ لاشعوری ذہن کی مخفی سرزمین میں جانے کا ایک اور راستہ ہے، وہ سرزمین جہاں ماہر نفسیات کو بار بار جانا پڑتا ہے۔ قدیمی نسلوں اور تصویری تحریروں میں پیش کردہ ''نوسِل

سوچ'' (جیسی کہ قدیم مصریوں یا چینیوں کے ہاں ملتی ہے) ان کے علاوہ دیگر راستے ہیں۔

لیکن لاشعور کا مطالعہ کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ بچوں کا مطالعہ کرنا ہے۔ بچے میں ہم اپنی قدیمی ذاتوں کو سالوں کے وزن اور پریشانی و ذہنی دباؤ کی تہوں سے آزاد صورت میں دیکھنے کے قابل ہیں۔ اگر ہم دیکھنے کی کوشش کریں تو بچے میں موت کی یہ قدیمی پہیلیاں، اور اس خوف ناک انجام کے ساتھ نمٹنے کے لیے ہمارے طریقے ملیں گے۔

تاہم، ہم بالکل حال ہی میں اس ماخذ سے کچھ سیکھنے کے قابل ہوئے ہیں۔ قبل ازیں سمجھا جاتا تھا کہ بچوں کو موت کا خوف یا خیال زیادہ نہیں ہوتا۔ خود فرائیڈ نے بھی کہا تھا کہ بچے کے لیے موت محض ایک روانگی یا سفر سے کچھ ہی زیادہ ہے، اور اُس نے محسوس کیا کہ موت کے شعوری تصور کے لیے کوئی لاشعوری رابطہ نہیں ملنے والا۔ اگر موت کا خوف مشاہدے میں آتا بھی ہے تو صرف اڈیپل (Oedipal) عہد کے بعد، اور اُس کی وضاحت آختگی (Castration) کے خوف کی علامتی پیداوار کے طور پر ہی کی جا سکتی تھی۔ موجودہ دور کا تجربہ ان خیالات کی حمایت نہیں کرتا۔ بچے کی عمر کے تیسرے سال میں بھی آپ اس کا ثبوت دیکھ سکتے ہیں۔ اس کا ظہور تشکیلی تصور اور تشکیلی احساسِ جرم کی ترقی کے ساتھ منسلک ہے جو دونوں ہی اڈیپس کمپلیکس سے کافی پہلے واقع ہوتے ہیں۔ یہ اندرون خانہ ذہنی دباؤ کی بہت سی مختلف صورتوں کے ساتھ منسلک نظر آتا ہے۔ ان میں مشترک معلوم ہونے والے واحد عوامل ان سب کا شدید ذہنی دباؤ، طیش یا پریشانی کا محرک بننا ہے۔ پھر بھی بہت سے بچے ابتدائی ترقی کے اس سارے عمل سے موت کے کسی بدیہی خوف کے بغیر ہی گزرتے ہیں۔ ہم اس بظاہر متناقض صورتحال (پیراڈاکس) کی کیا توجیہہ پیش کریں؟

اس موقعہ پر بچے کے ذہن میں تضاد کو سمجھنے کے لیے ہمیں اُس کی ترقی پاتی ہوئی حسِ علیت (Causality) کے دو پہلوؤں پر غور کرنا ہوگا۔ ایک تا چار سال کا بچہ علت اور معلول کا تسلسل مکمل انداز میں سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ ابتداً میں وہ یہ جاننے کے قابل بھی نہیں ہوتا کہ اُس کی جسمانی ضرورتوں کی تسکین دوسروں کی جانب سے دیکھ بھال پر منحصر ہے۔ کیونکہ جب وہ خواہش کرتا ہے تو وہ پوری کر دی جاتی ہے، اس لیے وہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ دونوں واقعات کے درمیان ایک علتی تعلق موجود ہے اور بیرونی حالات اُس کی اپنی طاقت ور خواہشات کے ذریعہ متعین ہوتے ہیں۔ جب اُسے پتا چلتا ہے کہ خواہشات ہمیشہ ہی پوری ہونا لازمی نہیں تو قادرِ مطلق ہونے کے اِس تصور میں

کچھ ترمیم ہو جاتی ہے۔ بایں ہمہ، خود پرستانہ اختیارِ کل کے لیے یہ رجحان تمام لوگوں کی ساری زندگی کے دوران موجود نظر آتا ہے۔ اسے دبائے جانے پر متعدد مفید ضمنی پیداواریں حاصل ہوتی ہیں۔ ایک نتیجہ تحفظ اور کافی پن کے انفرادی احساسات کا پیدا ہونا ہے۔ اس میکنزم اور والدین کے ساتھ خود کو شناخت کرنے کے میکنزم کے ذریعہ بچہ ایسے نئے حالات سے نمٹنے میں خود کو ایک پر اعتماد اور باصلاحیت شخص تصور کرتا ہے جنھیں کامیابی سے حل کرنے کا وہ کوئی سابقہ تجربہ نہ رکھتا ہو۔ بہ الفاظِ دیگر اس اعتماد کا ایک حصہ وہ ساحرانہ انداز میں اپنے والدین سے ''مستعار'' لیتا ہے...... خود کو اُن کی صلاحیت اور طاقت کے ساتھ شناخت کرنے کے ذریعہ۔ ایک اور حصہ قادرِ مطلق ہونے کے احساسات کی باقیات سے مل کر بنتا ہے۔ تاہم، یہ نشوونما صرف ''محبت یافتہ'' بچے میں ہی اس طرح سے ہوتی ہے۔ اُس صورت میں مہربان اور مشفقانہ اختیارِ کل کا احساس تقریباً بالکل ہی مٹ جاتا ہے جب بچہ لاچار حالات سے دوچار ہو یا جب والدین غیر حاضر، محبت اور دیکھ بھال کرنے والے نہ ہوں۔

چنانچہ، محبت یافتہ اور غیر مسترد شدہ بچے کا ساری زندگی کے دوران بچپن والے قادرِ مطلق ہونے کے اِس احساس کو برقرار رکھنا زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ یہ وہ رجحان ہے جو ہر اوسط شخص موت کی پریشانی سے نمٹنے میں استعمال کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ یہ ہمیں اس قابل بناتا ہے کہ خود کو موت کے امکان سے مؤثر طور پر الگ کر سکیں۔ تب ہم موت کو سر اُٹھا کر دیکھ سکتے ہیں۔ خود کو زد پذیر نہ سمجھنے کا یہ مستقل احساس اِتنا زوردار ہے کہ نوعِ انسانی کی اکثریت موت کو تمام انسانوں کا اور اپنا ناگزیر انجام ماننے سے گریز کرنے کے قابل بنا دیتا ہے۔

تاہم، اگر ہمارے قادرِ مطلق ہونے کے ساحرانہ احساسات موت کی پریشانی سے بچنے کا مرکزی وسیلہ ہیں تو یہ پیراڈاکس بہت دلچسپ ہے کہ کافی حد تک یہی عامل اِس کی موجودگی کا ذمہ دار ہے۔ بچے کی سوچ کا مخصوص وصف، یعنی اُس کی خواہشات کا اثر انگیز ساحرانہ قوت کا حامل ہونا، ایک دو دھاری تلوار ہے۔ یہ ناقابلِ شکست اور لافانی ہونے کے لیے ہماری خواہشات کو باوزن بناتا ہے، لیکن یہ بچے کو نفرت کرنے، تباہ کرنے اور تخریبی سوچوں کی ذمہ داری قبول کرنے کے قابل بھی بناتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنی مہربانہ بلکہ مخاصمانہ خواہشات کو بھی ساحرانہ انداز میں تکمیل پاتے ہوئے تصور کرتا ہے۔ وحشی انسان کی طرح بچہ بھی اتفاق کے تصور سے نا آشنا ہے۔ وہ

ہر انجانی یا غیر ضروری واقعیت کو کسی شخص یا متوسل کی بدخواہی کا نتیجہ خیال کرتا ہے۔ بچہ سوچ کو اصلی اور حقیقی قرار دیتا ہے۔ وہ اصل چیز اور اُس کی علامت کے درمیان تمیز نہیں کرتا، اور نہ ہی معروضی علیت اور تمنائی علیت کے درمیان فرق کرتا ہے۔ کوئی بھی بچہ اپنی بلوغت کے عمل کے دوران خاصی زیادہ فرسٹریشن کا تجربہ کیے بغیر کرتا ہے جو عموماً کافی درد انگیز اور تکلیف دہ ہوتی ہے۔ بلاشبہ یہ کسی بھی طرح ایک ناقابلِ خواہش چیز نہیں۔ تاہم، یہ درست ہے کہ فرسٹریشن یا خفگی کے لیے بچے کا بے داغ ردِعمل فرسٹریشن کا باعث بننے والے شخص کو نکال باہر پھینکنے (Banishment) کی خواہش ہے۔ یہ خواہشات اُس کی زندگی کے ابتدائی سالوں میں فرسٹریشن کا باعث بننے والی اشیاء کی جانب ''خواہشاتِ مرگ'' کے ساتھ مربوط ہو جاتی ہیں۔ اخراج یا نکال باہر پھینکنے کی خواہش کا موت کی خواہش کے ساتھ یہ ربط بہ آسانی قائم ہو جاتا ہے، کیونکہ اُس دور میں موت کو ایک لامحدود اور دائمی حالت تصور نہیں کیا گیا ہوتا، جیسا کہ بچوں کی کھیلوں میں صاف نظر آتا ہے۔

''کاؤبوائز اور انڈینز'' نامی کھیل میں دونوں حریف ٹیمیں دوسری ٹیم کو ہلاک کرتی ہیں، اور پھر سب کھلاڑی دوبارہ زندہ ہو کر ایک اور کھیل کھیلنے لگتے ہیں۔ اس موقعہ پر موت محض ایک عارضی اخراج ہی لگتی ہے۔ یہ امر بھی باعثِ دلچسپی ہے کہ پُرتشدد موت اور اِس سے نکلنے کا ساحرانہ انداز سبھی نسلوں اور ثقافتوں کی پری کہانیوں اور لوک روایات میں ملتا ہے۔ یہ عمیق اور ہمہ گیر خواہش بچوں کے ادب میں ایک کلاسیک موضوع ہے اور یہ ہمیں دکھاتا ہے کہ یہ معاملہ بچے کے لیے کس قدر اہمیت رکھتا ہے۔ بعد میں وقت کی احساس میں ترقی ہونے پر بچے کو معلوم ہونے لگتا ہے کہ موت کوئی عارضی اور نہ ہی قابلِ واپسی واقعہ ہے۔ تب وہ اپنے پیارے اور اہم لوگوں کی جانب موت کی خواہشات کے متعلق خوف زدہ اور سراسیمہ ہونے لگتا ہے۔ وہ انہیں دبانے یا الفاظ کے ذریعہ جھٹلانے کی کوشش کرتا ہے، جیسا کہ قدیمی لوگ بھی جادو منتر کے ذریعہ کیا کرتے تھے۔ غور کریں کہ بچوں کی قدیم ترین اور مقبول ترین دعا میں موت کے خوف کے خلاف ایک درخواست شامل ہے (''اگر میں سو کر اُٹھنے سے پہلے مر جاؤں'')۔ اور خوفِ مرگ میں مبتلا بچے میں آشکار ہونے والی ابتدائی ترین علامات میں سے ایک اِس دعا کے اختتام پر مخصوص افراد کے لیے دعا کرنا ہے۔ اگر اُس نے دعا کے آخر میں افراد کے لیے دعا نہ کی ہو تو وہ سمجھتا ہے کہ اب اُن کی زندگی جاری نہیں رہے گی۔ یہ تخریبی اور نفرت آمیز سوچیں دوگنی خوف ناک ہیں، کیونکہ بچہ اپنی خواہشات

مرگ عمل میں آنے پر اپنے والدین کی موت سے خوف زدہ ہوتا ہے۔ نتیجتاً وہ اپنی موت سے ڈرنے لگتا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سوشلائزیشن کے عوامل تمام بچوں کے لیے تکلیف دہ اور باعثِ خفگی ہیں۔ لہٰذا کوئی بھی بچہ سوشلائزیشن کرنے والوں کے بارے میں موت کی معاندانہ خواہشات سے پاک نہیں رہتا۔ چنانچہ، کوئی بھی براہ راست یا علامتی صورت میں ذاتی موت کے خوف سے بچ نہیں پاتا۔ احساس عموماً اِس قدر فوری اور مؤثر ہوتا ہے کہ ہم شاذ و نادر ہی اِس عمل کو اصلی صورت میں دیکھتے ہیں۔ تاہم، اگر سوشلائزیشن میں بیرونی حالات کے ذریعہ مایوسیاں (فرسٹریشنز) بہت زیادہ بڑھ جائیں تو یہ عمل بہت زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ عموماً یہ حالات محبت نہ کرنے والے اور مارنے پیٹنے والے والدین کی جانب سے بچے کی تضحیک و تردید کی پیداوار ہوتے ہیں۔

الختصر، ہم دیکھتے ہیں کہ بچے کا تصورِ موت کوئی واحد چیز نہیں، بلکہ تناقضات کا ایک ملغوبہ ہے۔ اول، موت کو ذات کے ساتھ تعلق داری میں ایک امکان کے طور پر تصور نہیں کیا جاتا: بلکہ اِس کے برعکس، اگر طاقت ور اور توانا جوان آدمی مر جاتے ہیں تو کم طاقت ور بچہ اُس سے کیسے بچ سکتا ہے؟ دوم، موت کو کبھی بھی اتفاق یا ایک فطری واقعہ کا نتیجہ نہیں سمجھا جاتا۔ علیت یا وجہ مجسم صورت میں ہوتی ہے اور بچہ کسی موت کے بعد احساسِ جرم کا شکار ہوتا ہے، کہ جیسے وہ خود خفیہ قاتل ہو۔ تاہم، متناقض طور پر وہ ساتھ ہی ساتھ مرنے والے کی جانب ایک غیظ و غضب کا تجربہ بھی کرتا ہے، کہ جیسے اُس شخص نے اُسے دیدہ و دانستہ چھوڑ دیا ہو۔ شعوری اعتبار سے یہ متضاد خیالات آپس میں ایک دوسرے کو خارج کرتے ہیں، لیکن ہمیں ذہن میں رکھنا چاہیے کہ لاشعور میں پیراڈاکسز کی یہ اقسام کسی تضاد اور اختلاف کے بغیر ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو موجود ہو سکتی ہیں۔

چنانچہ، ہم نے دیکھا کہ موت بذاتِ خود محض ایک حالت نہیں بلکہ ایک پیچیدہ علامت ہے جس کی اہمیت ہر شخص اور ہر ثقافت کے لحاظ سے مختلف ہوگی، اور اِس کا انحصار کافی حد تک نشوونمائی عمل کی نوعیت اور گرد و پیش پر بھی ہے۔ ہم نے یہ بھی غور کیا کہ موت، ہستی کے ایک اختتام کے طور پر، حقیقت کے ایسے پہلو رکھتی ہے جو قادرِ مطلق اور خود پرست نفس (Self) کے لیے پسندیدہ نہیں، اور اسی لیے اِسے تسلیم کرنے کے خلاف مضبوط حصار بنائے جاتے ہیں۔

موت کے خوف کو شدید کرنے والی علیت میں بچے کی دلچسپی کا ایک تیسرا پہلو بھی ہے۔ اِس کا تعلق اِس مسئلے سے متعلق براہ راست حقیقی ڈیٹا حاصل کرنے کی عدمِ قابلیت کے ساتھ ہے۔ ایک

مرتبہ سگمنڈ فرائیڈ نے کائنات کی فطرت کے متعلق بچے کے تجسس کو ''ابوالہول کی پہیلی'' قرار دیا تھا۔ مثلاً بچہ یہ صدیوں پرانا سوال کرتا ہے کہ ''میں کہاں سے آیا؟'' یا ''بچے کہاں سے آتے ہیں؟'' فرائیڈ نے جنسی تجسس کو دبائے جانے کے نتیجے میں وسیع شخصیتی بدہیئتی پر تفصیلاً بات کی، کیونکہ والدین اور اُس کی تہذیب اس ٹیبو زدہ موضوع کی ممنوعہ فطرت کے بارے میں بتاتی ہے۔

فرائیڈ اور دیگر فرائیڈ پسندوں کی مہربانی سے جدید والدین اب کافی حد تک اپنے بچے کی جنسیت کو ایک منطقی اور سمجھ دار انداز میں لینے کے قابل ہو گئے ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں گزشتہ پچاس برس کے دوران ہسٹریا جیسے اعصابی ونفسیاتی مسائل میں کافی کمی واقع ہوئی ہے۔

البتہ میرے خیال میں ''ابوالہول کی پہیلی'' کا ایک دوسرا نصف حصہ بھی ہے: ''میں کہاں جاؤں گا؟'' یا ''موت کیا ہوتی ہے؟'' اِس معاملے میں بھی کلینکل مواد وافر مقدار میں دستیاب ہے کہ بچے پہیلی کے دونوں حصوں میں ایک جتنی ہی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اِس الجھن کا ایک جواب ڈھونڈنے کی کوشش میں آج اُسے ویسے ہی رویے کا سامنا کرنا پڑتا ہے جیسے 1890ء کی دہائی کے دوران جنسیت سے متعلق سوال پوچھنے پر کرنا پڑتا تھا۔ موت کے متعلق اپنی پریشانیوں اور الجھنوں کی وجہ سے اوسط والدین جواب تلاش کرنے میں بچے کی کوئی زیادہ مدد نہیں کر پاتے۔ اور دیے جانے والے جواب اُن کہانیوں جیسے ہی ہوتے ہیں جو اُسے کوئی تیس چالیس سال قبل جنسی سوالات کے جواب میں سنائی جاتی تھیں: کہ فرشتہ تمہیں ٹوکری میں رکھ کر چلا گیا تھا۔ بچوں کے جنسی تجسس کو قبول کرنے یا سلجھانے میں والدین کی نااہلی کے نتائج ہم نے کافی واضح طور پر دیکھے ہیں۔ یہ واضح ہو چکا ہے کہ یہ تجسس ایک پیچیدہ چیز ہے۔ یہ نہ صرف جنسی اعضاء وعمل کی کارکردگی اور نوعیت میں بچے کی دلچسپی، بلکہ ہماری نوع کے ماخذ کے متعلق ایک عمیق حیرت اور تشویش بھی لیے ہوئے ہے۔ تجسس کے اِس وسیع حلقے میں ''میں کہاں سے آیا'' کا سوال شامل ہے: فرد اپنی ساری زندگی کے دوران یہ سوال ہر لحظہ بڑھتی ہوئی پیچیدگی کے ساتھ کرتا رہتا ہے۔ یہ چیز ہمیں سنجیدگی سے غور کرنے کے قابل بناتی ہوگی کہ کیا انسان کی نوعیت اور انجام کے متعلق بچے کے سوال کو ممنوع بنائے جانے کا بھی اِسی قدر خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ اپنے بچوں میں اِن اُلجھنوں سے نمٹنے کی خاطر بالغوں کا کلاسیکی انداز یہ یقین ہے کہ بچے موت کی 'کسی بھی' صورت کا تصور نہیں کرتے، لہٰذا اُنہیں اِس کے حوالے سے کوئی یقین دلانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کو چند عشرے

پہلے کا یہ مقبولِ عام یقین یاد آ جاتا ہے کہ بچے میں کوئی جنسی جذبات نہیں ہوتے، لہٰذا بچپن کی جنسیت کے حوالے سے کوئی مسئلہ نہیں ہو سکتا۔ سِلویا انتھونی[1] کی شان دار تحقیق اور قابلِ قدر کلینکل تجربہ اِس نظریے کی تردید کرتا ہے۔ بچوں اور بڑوں کی نفسیاتی تحلیل میں اپنے کام کی بنیاد پر میں یہ کہنے کے قابل ہوں کہ اُن کی بہت سی ذہنی پریشانیاں، اُلجھنیں اور دیگر اعصابی مسائل جینی لحاظ سے موت کے خوف یا اِس کی علامتی صورتوں کے ساتھ منسلک ہیں، اور یہ علامات بھی جنسی احتباسات کی ہی طرح اِس موت کی پریشانی کو دبانے کی متبادل کوششوں کا اظہار ہیں۔ خود کُشی[2] کے مظہر پر تحقیق میں یہ تعلق داریاں خاص طور پر واضح ہیں۔

تو کیا ہم اِس مظہرِ موت کو ممنوعہ باطنیت کے کھاتے میں ڈالنے میں حق بجانب ہیں، جبکہ ہم جدید زندگی میں کسی بھی اور مظہر کے ساتھ ایسا نہیں کرتے؟

میں ایک مرتبہ پھر سو سال پہلے جنسی جذبات کو دبائے یا مسترد کیے جانے کی مثال دوں گا۔ جنسیت کے خوف کی طرح موت کا خوف بھی دبائے جانے پر وسیع اور عمیق علامتی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جب ہم موت سے شدید اور مسلسل خوف کھائیں تو اکثر موت کی لاشعوری غیر منطقی علامتی صورتوں سے خوف کھا رہے ہوتے ہیں۔ لہٰذا موت کا خوف اصل میں دو چیزوں پر مشتمل ہے: ایک حقیقت پسندانہ تشویش کہ ایک دن ہم موجود نہیں ہوں گے؛ اور دوم، دیگر متنوع قسم کی تشویشات جو خوفِ مرگ کے غلاف میں ساتھ ساتھ چلتی ہیں اور جن کا کردار اور دائرہ کار مختلف ہے۔ اِن میں سے کچھ علامتی متبادل خوفِ علیحدگی سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ایک نہایت پیچیدہ طریقہ کار کے تحت اِس خوف کو مسرت، انتقام، لافانیت اور طاقت وغیرہ کے ساتھ بھی جوڑا جا سکتا ہے۔ ہماری آگاہی کی حالت ایسی نہیں کہ ہم موت کے بارے میں کچھ بھی مطلق یقین کے ساتھ کہہ سکیں، لیکن یہ جاننا بہت زیادہ مدد دے گا کہ موت کیا نہیں ہے۔ سپینوزا نے کہا تھا کہ اپنی موت کو ایک عمل کی تکمیل کے طور پر دیکھنے اور بھرپور انداز میں زندگی گزارنے والا بالغ شخص اِس سوچ کو قبول کر سکتا ہے کہ ایک دن اُس کی ہستی ختم ہو جائے گی۔

اور اِس معاملے میں ہمارے پاس اُس سے اچھی کوئی اور مثال نہیں جو سگمنڈ فرائیڈ نے مہیا کی۔ مظہرِ موت کی تحقیق اکثر موت گرفتہ لوگ نہیں کرتے۔ بوڑھے لوگ خود کو سر پہ منڈلاتی ہوئی موت سے لاتعلق نہیں رکھ سکتے، لہٰذا معروضی سائنسی تفتیش ممکن نہیں ہوتی۔ فرائیڈ چند مستثنیات

میں سے ایک ہے۔ فرائیڈ نے ایک مہلک کینسر کے ساتھ زندگی کے سولہ برس گزارے۔ اُس نے نشان دہی کی کہ موت کے متعلق اپنے رویے کی حقیقی فطرت کو بھرپور انداز میں سمجھنا ہمارے لیے بہتر ہوگا، وہ رویہ جسے ہم دباتے اور کچلتے رہتے ہیں۔ اُس نے کہا، ''موت کی نفسیات کے ساتھ بہتر انداز میں نمٹنے کے ذریعہ ہم معاملات کو صحیح طرح جاننے اور اپنے لیے زندگی کو زیادہ پائیدار بنانے کے قابل ہو سکتے ہیں۔'' شاید یہ توقع بہت بلند معلوم ہو، لیکن نوع انسانی کی ترقی کا انحصار باطنیت پسندوں کے وعدوں پر نہیں، بلکہ اس قسم کی ایک توقع پر ہی ہے۔

سی ڈبلیو ولسن

✿

حصہ سوم

ادب اور آرٹ

11
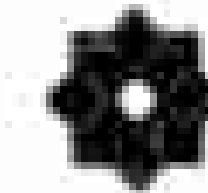
فانی پن اور جدید مغربی ادب

اس قسم کا موضوع بہت کم زیر بحث آیا ہے، لہٰذا اس کی نوعیت اور نفس مضمون کے بارے میں کچھ بنیادی باتیں طے کرنا ضروری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جدید ادب میں موت کے حوالے سے پیش کردہ بصیرتوں کے بارے میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ لیکن آرا بہت متنوع ہیں۔

1

پہلا لازمی قضیہ یہ ہے کہ بیسویں صدی کے ادب میں موت کی جانب جھکاؤ کسی اور صدی کے ادب کی نسبت مختلف ہے۔ یہ نہ صرف وسیع پیمانے پر جنگ کا مظہر بلکہ جسمانی اور روحانی سطح پر انسانی توقعات کا توازن کافی حد تک تبدیل ہو جانے کی وجہ سے بھی ہے۔ عمومی طور پر بات کی جائے تو موجودہ وقت اور مستقبل کی توقعات کے درمیان توازن بگڑ گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ممکنہ باتوں کے ایک نہایت وسیع ایریا پر اپنا یقین کھو چکے ہیں۔ ''بسٹری'' کے تصور کی نوعیت کافی حد تک تبدیل ہو گئی ہے۔ ایک اعتبار سے اب ہم اپنی فطرت کے اسرار سے کہیں زیادہ مغلوب ہیں کیونکہ ہم بہت کچھ جانتے ہیں؛ اب ہمارے لیے یہ ممکن ہے کہ ''سائنسی لحاظ سے'' اپنے ماخذ، پیدائش، نشوونما، انحطاط اور موت کو کھوج سکیں۔ موت کی وضاحت کسی نہ کسی ''اسطورہ'' یا کہانی کی صورت میں کی گئی جس میں اعلیٰ فطرتوں کو کم تر فطرتوں کے اخلاقی انحطاط کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ ان حالات میں باقاعدہ الٰہیات کے زیر اثر موت کو ابدیت کی جانب سفر میں ایک مقام یا ابدیت کا نقطۂ آغاز تصور کیا گیا۔ تب موت کی سوچ زیادہ ناخوشگوار بھی نہیں تھی۔

یہ ایقانات اور منظوریاں ہمارے اخلاقی منظرنامے سے پوری طرح غائب تو نہ ہوئیں، لیکن کم سے کم قابلِ اعتبار بنتی گئیں۔ چونکہ وہ ثابت نہیں کی جاسکتیں، اس لیے انھیں بطور ''توہمات'' یکسر مسترد کر دینا یا پھر جوں کا توں مان لینا لازمی ہے۔ سائنس کا ایک بڑا مقصد موت کو ایک لازمی انسانی تجربے سے حتمی طور پر محو کرنا تھا۔ یہ بات درست ہے کہ کسی بھی سائنس دان نے موت کو بالکل ختم کرنے کا دعویٰ یا پھر اسے ختم کرنے کی اُمید نہیں کی۔ سائنس کے زیادہ حقیقت پسندانہ عزائم بیماری کو ختم کرنا اور سہولت میں اضافہ کرتا رہے ہیں۔ بیماری کا خاتمہ موت کو مؤخر کرنے کی جانب ایک قدم تھا؛ جبکہ سہولت میں اضافہ کرنے کے باعث انسانی تفہیم کا ناگہانی پن کم ہوا؛ تیسرا اقدام کرۂ ارض پر ایک متبادل جنت تخلیق کرنا تھا۔ اِس نہایت حقیقی اور قابلِ تعریف عزم نے روایتی مذہبی نکتۂ نظر کے مخصوص بنیادی عناصر کو ختم یا نظر انداز کرنے کے ذریعہ انسانی طبعی اور اخلاقی دولت کو مسخ کیا۔ مسیحی تاریخ میں شیطان کی اسطورہ مؤثر ترین ہے۔ شیطان اور خدا کے درمیان جھگڑا زندگی کے تانے بانے کا ایک ناگزیر جز ہے۔ شر کو بیماری، پریشانی یا ''قابلِ علاج حالات'' کے ساتھ جوڑنے کا مطلب ایک اخلاقی مفہوم کی ترقی میں انسان کی شمولیت کو انسانی نفسیات میں سے ختم کر دینا ہے۔

چونکہ کبھی کوئی شخص موت کا تجربہ کرنے کے بعد اسے بیان کرنے کے قابل نہیں رہا، اس لیے موت کی حقیقی فطرت کا انحصار ہمیشہ تخیلاتی قیاس آرائی پر ہی ہوگا۔ موت کو بطور ایک واقعہ اور بطور ایک آغاز بیان کرنے کے استعاروں پر بہت زیادہ توانائی خرچ کی گئی ہے۔ موت سے منسلک بہت سی تشبیہات طویل عرصہ قبل وضع کر لی گئیں، لیکن نئی تشبیہات کی ضرورت بہرحال موجود رہی۔ تشبیہات کی دو بڑی اقسام ہیں: ایک حقیقت پسندانہ اور دوسری تخیلاتی۔ مؤخر الذکر صورت میں تخیل روحانی ابتدا کے متبادل پیش کرنے کے ذریعہ جسمانی انتشار کے ثبوتوں کو ہر ممکن حد تک ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر، دوسری قسم کی تشبیہات کے ذریعہ ہم موت کو ایک ماورائی مفہوم میں لیتے ہیں۔ تمام ماورائی التباسات کا ماخذ انسان کی دنیاوی فطرت سے انکار کرنے کی خواہش میں ہے۔

بلاشبہ فانی پن کے متعلق ادبی نقطۂ نظر کے حوالے سے کہنے کو بس اِتنا کچھ ہی نہیں ہے۔ تشبیہ اور استعارے کا 'انتخاب' ہمارے اعتقاد کی نسبتاً تسہیل یا مشکل پر اور معادیات کے نظاموں کی

قوت پر ہے۔ فانی پن کے ادب میں تمام عناصر سے زیادہ اہم عنصر زمان ومکاں کا تعلق ہے۔ یہ تعلق ناگزیر طور پر ابدیت اور وقت کی پیائش یا احساس کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ مثلاً ابدیت کی اُمید کرنے اور اُس پر یقین رکھنے والا شخص اپنے دنیاوی تجربات میں زیادہ دلچسپی نہیں لے گا۔ لافانیت یعنی انفرادی سطح پر ابدیت پر کم سے کم قطعی بنتے جانے کے ساتھ ساتھ وقت پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی جاتی ہے اور وقت ایک مکانی وصف اختیار کر لیتا ہے۔ وقت کا گزرنا ایک مکانی معروض یا معروضات کا سلسلہ بن جاتا ہے۔ اگر کسی دور کے لوگ لافانیت پر کم یقین رکھتے ہوں یا اس کی اُمید نہ رکھتے ہوں تو عموماً وہ ایسے ادب کو تخلیق کریں گے جو زندگی کی مکانی خصوصیات پر زور دیتا ہو۔ اگر موت ایک راستہ نہیں بلکہ دیوار ہو تو تجربے کی رفتار کم پڑ جاتی ہے، وقت پر توجہ مکاں میں ایک انجذاب بن جاتی ہے، اور تبدیلی کی ہر ایک تفصیل سنبھال کر رکھی جاتی ہے۔ ہم معروضات اور تجربات کی ایک وجودیات حاصل کرتے ہیں۔ موت ہمیں زندگی کی جانب موڑ دیتی اور ہمیں اس کی تعریف وتوصیف (چاہے ہم مایوس ہی ہوں)، وقت کے گزرنے سے خائف ہونے اور انجام کار نتائج سے نا اُمید ہونے پر مجبور کرتی ہے۔

تناظر کی یہ تبدیلی شاید سٹیونز کی ایک نظم میں نہایت آسانی سے دیکھی جا سکتی ہے۔ اِس نظم میں موت کو زماں میں ایک ایسی حالت کے طور پر دیکھا گیا ہے جسے تسلیم کرنا ضروری ہے، جو ناگزیر ہے اور جسے بعد از موت بہشت کے تصورات کے ذریعہ دبایا نہیں جا سکتا۔ اِس صورت میں موت ''حسن کی ماں'' بن جاتی ہے، اور یہ تمام معروضات کے ساتھ تجربات کا حسن ہے۔

2

میں اپنی تحقیق کے اہم حصوں کو اِن تین اصطلاحات کے تحت بیان کرنا چاہتا ہوں: رحمت (Grace)، تشدد (Violence) اور نفس (Self)۔ میں نے اُنھیں خام سی زمانی ترتیب میں رکھا ہے؛ شاید آپ کہیں کہ رحمت کے امکانات کی تباہی نے موت کے ساتھ سمجھوتے کی ذمہ داری نفس یا ذات پر ڈال دی ہے۔ بہرصورت، یہ فرض کرنا کچھ حد تک قابل توجیہہ ہے کہ یہ اصطلاحات ہمارے نظریۂ موت کے تین بنیادی مراحل کو پیش کرتی ہیں۔

رحمت منظوری کی شرط ہے۔ انسانی توانائی اِس پر انحصار کر سکتی ہے۔ یہ مختلف امتناعات اور اصولوں کے ساتھ لافانیت کی یقین دہانی کی ایک صورت ہے۔ رحمت ایک تخیلاتی کاوش کی

متقاضی ہے؛ ہمارے لیے چیزوں کے معجزات پر یقین رکھنا ضروری ہے۔ یہ ہمیں اپنی توانائیاں کو بانٹنے میں مدد دیتی ہے؛ ساری کی ساری توانائیوں کو موجودہ خواہشات پر صرف کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ اُنھیں مرتب اور ذخیرہ، اور موٴخر کیا جا سکتا ہے۔ رحمت کی توقع یا اُمید میں ہم قسط وار بنیادوں پر برائی کرتے ہیں؛ ہم ہمیشہ کفارے اور توبہ کی لازمی صورتوں سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اگر ہم رحمت پر یقین رکھتے ہوں تو لافانیت پر بھی یقین لاتے ہیں؛ المختصر ہم ''یقین رکھتے'' ہیں۔ اِس قسم کی صورت حال ہماری اپنی استعارہ کی قوت پر زبردست اثر ڈالتی ہے۔ ہم اسے بعد از مرگ دنیا کے تصور میں بھی اُتنا ہی خرچ کرتے ہیں جتنا کہ دنیا کو موت کا ایک انداز بیان کرنے میں۔ اِس کا مطلب یہ نہیں کہ دنیا کی اہمیت کم ہو جاتی ہے؛ اس کے برعکس لافانیت کا یقین اکثر گناہ کو زیادہ واضح اور ممکن بنا دیتا ہے؛ ہم ایک باعث نجات رحمت سے مایوس ہو کر نہیں بلکہ اُس کی اُمید میں گناہ کرتے ہیں۔ یہ چیز گناہ کی کیفیت کو بھی متاثر کرتی ہے، اور ہر صورت میں گناہ کا ارتکاب اور کفارہ زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔

تکفیرِ دین کو رحمت کی ضرورت کا ایک اظہار تصور کرنا ممکن ہے۔ بودلیئر پر ٹی ایس ایلیٹ کے ایک مضمون (1930ء) میں یہ تصور بہت اچھے طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ وہ ''حقیقی تکفیرِ دین'' کو ''عقیدے کی توثیق کا ایک طریقہ'' بتاتا ہے۔ بودلیئر کو پڑھنے کا ایک طریقے کے مطابق اُس کی نظموں میں موت، تاریکی اور سوقیانہ پن کا غلبہ جدید زندگی میں رحمت کے زیاں پر چیخ وپکار ہے۔ بلاشبہ یہ کہنا بہت غلط ہے کہ رحمت پر یقین سارے خوف بہ آسانی دور کر دیتا ہے۔ انسانی زندگی میں رحمت کے کردار کے برعکس اثر کی فصیح ترین شہادت صرف جدید سپین کے ادب میں ملتی ہے۔ ایک طرف (Unamuno کے فکشن میں) ہمیں لافانیت کا التباس قائم رکھنے کی جانب پرجوش تحریک ملتی ہے۔ نیز، لورکا کے ڈراموں میں ہمیں موت کی تمثیل فانی پن کے کرب کا اعلان کرتے اور رحمت کی یاد دلاتے نظر آتی ہے۔ جدید سپین پر لکھنے والے تقریباً ہر مصنف نے اِس کا ذکر کیا ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ بیسویں صدی میں کبھی کوئی دور ایسا آیا ہے جب ابدی زندگی کی توقعات ہمہ گیر یا وسیع طور پر قائم کی گئیں۔ رحمت کی موجودگی کو موضوع بنانے والے بیش تر اہل قلم نے تشبیہاتی اصطلاحات استعمال کیں۔ کچھ ایک نے رحمت کے نزول کا وقت ماضی میں بتایا اور تاریخ

وروایت سے رحمت کی مؤثر تشبیہات مستعار لیں۔ دیگر نے رحمت کو کافی حد تک ایک نجی معاملہ سمجھا: انسان کی زندگی کی حقیقت کا تعین کرنے کے ذرائع کی تلاش تشبیہ کے ایک سکوپ کا تقاضا کرتی ہے جو اعتقاد کی ایک علامت کی بجائے فانی پن سے متعلقہ تخیلاتی قیاس آرائی کے شعبہ کے طور پر موجود ہے۔

اپنے بارے میں انسان کی رائے سیکولر بننے کے باعث اُس کے نظریۂ رحمت پر کافی اثر پڑا۔ کبھی کبھی رحمت کو جسمانی یا معاشرتی صحت مندی کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ یعنی اگر ہم 'سائنسی' یا 'قابلِ توثیق' طور پر اچھے ہیں تو رحمت کے حق دار ہیں۔ اِس مفہوم میں شخصی لافانیت معاشرتی لافانیت میں جذب ہو جاتی ہے۔ کسی ریاست کو درجہ بدرجہ استحکام ملتا ہے؛ برائی سے آہستہ آہستہ نجات ملتی ہے؛ اور میں بطور شہری مسرت کی (نہ صرف اپنے بلکہ آنے والی اولادوں کے لیے بھی) اُس آئندہ حالت کی جانب عمل کرتے ہوئے بعد از مرگ اُس میں شریک ہوتا ہوں۔ رحمت کا یہ تصور مستقبل پر ایک تقریباً قطعی ایمان پر منحصر ہے۔ اِس معاملے میں صرف مستقبل کا وقت اہم ہے؛ ماضی صرف یہ دکھانے کے لحاظ سے قابل قدر ہے کہ مستقبل کو بہتر بنانے کی خاطر ہمیں حال میں کس بات سے گریز کرنا چاہیے۔

یقیناً لافانیت کو ایک خالصتاً سیکولر تجرید کے طور پر دیکھنا ممکن ہے۔ نہایت مادیت پسندانہ سماجی نظام اکثر راسخ العقیدہ شہدا رکھتے ہیں۔ اِس قسم کی لافانیت موت والی طرف کی بجائے کسی اور طرف سے متوقع ہوتی ہے۔ یہ ایسے دور کا خاصہ ہے جب ''دوسری طرف'' کو تصور کرنا محال ہو۔ اِس میں مستقبل پر نہایت جذباتی اور حتیٰ کہ غیر منطقی ایمان ملوث ہے۔ اِس معاملے میں ساری زندگی ایک سیکولر رہبانیت سے عبارت ہوتی ہے۔ موت ایک موزوں انجام ہے، نہ کہ ایک آغاز۔ یہ مستقبل کی نذر کی گئی ایک قربانی ہے۔ تمام انسان یسوع مسیح ہیں۔ وہ معاشرے کے تصور کو حقیقی روپ دینے کی خاطر تکلیف سہتے ہیں۔

سیکولر رحمت اور روحانی رحمت کے درمیان متعدد ظاہری مشابہتیں موجود ہیں: اِس دنیا میں طرزِ عمل کے لیے منظوریاں اور ہدایات دینے کے لیے طریقوں میں؛ بعد از موت حالت میں رحمت حاصل ہونے کا تصور؛ اور نفس کے ساتھ یگانگت اور مکمل وابستگی کا احساس۔ بنیادی فرق سیکولر رحمت میں تاریخ کو دی گئی اہمیت کا ہے؛ روحانی رحمت میں یہ چیز نہیں ملتی۔

رحمت کو کسی ثقافت کے جوہر کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ تجرید کی ایک اور صورت ہے۔ ایک انتہا پر یہ ذوقِ سیاحت کی تحلیل یافتہ صورت ہے۔ امریکی خاص طور پر اِس کی زد میں آئے: فلک بوس عمارتوں میں ایک ''روحانی'' چیز کا فقدان محسوس کرتے ہوئے اُنہوں نے اِسے گرجا گھروں میں تلاش کیا۔ پہلی عالمی جنگ کا ادب اِس نوعیت کی رحمت کی متعدد مثالیں پیش کرتا ہے۔ یہاں فنِ تعمیر، باغات، کسی ثقافت کی ظاہری صورتیں باعثِ تحریک ہیں۔ نیم ا۔ کا کے نوجوان فرانس میں ''اچھے ذوق'' کی خاطر مرے۔ اِن صورتوں میں لافانیت کی شرائط پر غور و فکر آسان نہیں؛ لیکن مجھے یقین ہے کہ اِس معاملے میں بھی رحمت کامیابی کے ساتھ زندگی۔ لافانی پن کے تعلق کو متاثر کرتی ہے۔ عبادت گاہیں روایت کی علامات اور لافانی پن کی صورتیں ہیں: اُن کے تباہ ہونے پر انسان مایوسی کی کھائی میں جا گرتا ہے۔ ثقافت اچھائی، نیکی اور روحانی دنیا کے ساتھ منسلک ہے جو بصورت دیگر واضح نظر نہیں آتی۔ ثقافت کو زندہ رکھنے کی خاطر مرنے والے نوجوان عبادت گاہوں کی ابدیت کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ اُن کی توقعات دنیاوی نوعیت کی تھیں، لیکن مبہم طور پر کلاسکس اور فرانس کے ساتھ منسوب تھے۔ خدا کو باذوق انسان کے انداز میں تصور کیا گیا تھا۔

میں جدید ادب میں رحمت کے کچھ معانی بیان کرنا چاہوں گا۔ اول: یہ نہایت طاقت ور ہے، حتیٰ کہ روحانی سکون کی فطری صورتوں میں بھی۔ ''غیر مسیحی'' ادب کی کچھ انتہائی صورتیں اس کی پائیداری کی شہادت پیش کرتی ہیں۔ دوم: رحمت کی موجودگی روایت کے ایک تسلسل کی تصدیق کرتی ہے۔ جدید ادب میں رحمت کو عموماً ماضی کی ایک شرط کے طور پر رکھا گیا۔ لافانی پن کے متعلق سوچنے پر ہمیں ماضی یاد آتا ہے۔ متعدد ابہام ظاہر ہوتے اور جدید ادب کا مفہوم جاننے کے لیے ایک اہم اشارہ فراہم کرتے ہیں۔ سیکولر تبدیلیٔ خیالات بھی تبدیلیٔ مذہب کے ساتھ کافی کچھ مشترک رکھتی ہے۔ مثلاً ارنسٹ ہیمنگوے کے ''For Whom the Bell Tolls'' میں El Sordo کی پہاڑی پر جو آکوئین کے معاملے میں: اُس کا کمیونسٹ نظریہ اختیار کرنا بالکل مسیحی انداز میں تھا، لہٰذا وہ انجام کار مسیحی عقیدے کا پیروکار بن گیا۔ چنانچہ اکثر جدید ادب لافانی پن کے روایتی التباسات کی صورتوں پر عمل کرتا ہے، مگر ساتھ ہی ساتھ اُنہیں مسترد کرتے ہوئے بھی نظر آتا ہے۔ تاہم، جدید ادب میں رحمت کے حقیقی مواقع ماضی کے ساتھ منسلک ہیں جو حال سے قطعی مختلف ہے۔

زیادہ خصوصی طور پر لافانی پن موت کے مناظر کی تصویر کشی پر ایک عمیق اثر رکھتا ہے۔ اِس قسم

کے جتنے چاہے کیسز پر غور کر لیں۔ موت ایک علت کے طور پر زندگی کے ساتھ منسلک ہے، لیکن یہ بعد از مرگ مستقبل کے ساتھ بھی تعلق رکھتی ہے۔ موت گرفتہ شخص اُس مستقبل کا راز جاننے کی آخری حد پر ہوتا ہے۔ اُس کا جسم منتشر ہوتا ہے، روح خلا میں پرواز کر جاتی ہے جو شروع میں محدود لیکن آخر میں لامحدود ہو جاتی ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ موت تطہیر کا ایک ذریعہ ہے۔ ایسی کسی لافانیت کا تصور نہیں کیا گیا جو جسم کی آلائشوں کو جاری رکھے۔

فانی پن کا ادبی نکتۂ نظر کافی حد تک موت کے بارے میں ان خیالات کا مرہونِ منت ہے۔ موت کے منظر کا بنیادی ابہام آخری وقت تک شیطان کے ساتھ جدوجہد میں مضمر ہے۔ موت محض ابدیت تک جانے کا ایک راستہ نہیں، یہ ایک عدالت میں داخلے کا نام بھی ہے۔ شیطان سارے عرصے کے دوران حواس کے ساتھ منسلک رہتا ہے، وہ جسم کی مسرتوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ چنانچہ موت گرفتہ آدمی کو پاک کرنا ضروری ہے؛ اسی لیے سفیدی، کھلے پن، پاکیزگی اور خالی پن کی شبیہیں بہت غالب ہیں۔ یہ ایک خواہش کردہ حالت ہے، لیکن اس سے خوف بھی کھایا جاتا ہے؛ اور یہ اُن لوگوں کو دلگیر کر دیتی ہے جو تمام گناہوں کو نسبتاً اور مطلق تطہیر کے حوالے سے جانچتے ہیں۔ جدید ادب بنیادی طور پر مظہرِ موت پر بات کرتے ہوئے کشادگی اور تنگی کی شبیہوں میں واضح فرق کرتا ہے۔ تنگ جگہوں پر ہونے والی موت ہمیں قبر کی تنگی کی یاد دلاتی ہے۔ قبر ایک تنگ اور غیر آرام دہ جگہ ہے، اور اسی طرح جیل کی کوٹھڑی، ہسپتال کا وارڈ، خندق اور شہر کا بازار بھی۔ ان میں سے کوئی بھی جگہ خدا کے ساتھ وصال کے لیے موزوں نہیں۔ لافانی پن پر ایمان کا زیاں پیش کرنے والی بہت سی جدید شبیہیں اسی قسم کی تنگ جگہ پر زور دیتی ہیں۔ وہ زمین پر جنگ کی صورتیں ہیں۔ اس کے برعکس لافانی پن کو نہایت وسعت میں پیش کیا جاتا ہے: سمندر، آسمان، صحرا، کھلی جگہیں۔

رحمت کی اہمیت کا دارومدار موت گرفتہ شخص اور اُس کی لافانی پن کی اُمید کے درمیان تعلق کی قابلِ پیش گوئی حیثیت میں ہے۔ اُسے پیشگی یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ وہ مر جائے گا، کہ موت ناگزیر ہوتے ہوئے بھی ایک ایسا واقعہ ہے جس کے لیے وہ تیاری کر سکتا ہے۔ اگر وہ اچانک مر جائے تو موت پر منتج ہونے والے واقعات کو قابلِ فہم ہونا چاہیے۔ المختصر، اُسے زندگی انجام پانے کے زمان و مکاں دونوں پر قادر و مختار ہونا چاہیے۔

3

تشدد موت بذاتِ خود لافانی پن میں یقین کی متقاضی نہیں۔ اگر کسی شخص کی موت کا تشدد جوش کے ساتھ قابلِ محسوس تعلق کا حامل ہو...... یعنی اگر موت کی صورتِ حال اِس کی وجہ بننے والی توانائی کے موافق ہو...... تو زندگی، موت اور لافانی پن کا توازن تب بھی قائم رکھا جا سکتا ہے۔

تاہم، تشدد کی دو اقسام ایسی ہیں جن میں یہ توازن حاصل نہیں ہوتا: توقع میں زیادتی کا تشدد (جذباتی تشدد) اور غیر شخصی تشدد۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ کوئی تشدد تبھی قابلِ فہم ہے جب وہ کسی شخص پر کیا جائے۔ ان حدود سے ماورا کوئی بھی تشدد قابلِ فہم نہیں۔ آپ کے لیے یہ جاننا لازمی ہے کہ آپ کی موت کس وجہ سے اور کس کے ہاتھوں ہو رہی ہے۔ موت کی تاریخ نپے تلے خطرے یا قابلِ پیش گوئی نتیجے والے حالات سے غیر شخصی، غیر معقول، غیر حقیقی اور ان دیکھی صورتِ حال کی جانب جاتا ہے۔ تمام اخلاقی اور مذہبی نظام ان معاملات میں حقیقت یا پیش گوئی کا ایک لازمی عنصر رکھتے ہیں۔ آپ کو کم از کم تخیلاتی سطح پر ہی اپنی موت کے حالات کو قبول کرنا لازمی ہے۔ کافکا کے ہیروز اس کی مثال ہیں۔

ہماری ثقافت کی تاریخ کافی مناسب طور پر ان معاملات میں واضح ہے۔ طبعی قانون ایک مرتبہ ہماری دنیا کی حدود بیان کر دے تو ہمارا ادب اُس کی حدود کے اندر کام کرنے لگتا ہے؛ وہ تقدیر اور قسمت کے وسیع اور مبہم استعارے مستعار لیتا ہے؛ وہ انسان پر چھائی ہوئی وسیع فطری قوتوں کی شبیہیں بناتا ہے۔

غیر شخصی تشدد زندگی، موت اور لافانی پن کے تعلق کا توازن بگاڑ دیتا ہے۔ اس میں وجہ اور نہ ہی ایک لاش ہوتی ہے۔ ہمارا ادب تشدد کو نفسیاتی مفہوم میں لیتا ہے۔ درحقیقت جدید ادب میں موت کے ساتھ منسلک کیے گئے زیادہ تر ابہام اس لیے پیدا ہوتے ہیں کیونکہ عقل نے موت کے ایجنٹ کی حیثیت سے جذبے کی جگہ لے لی ہے۔ موت کی معتبریت اور قبولیت دونوں کا انحصار وجہ کو جاننے، محسوس یا تصور کرنے پر ہے۔ اگر موت "اچانک" آ جائے تو تب بھی اِسے جسم، ذہن یا روح کی کسی نہ کسی خرابی کا نتیجہ خیال کیا جا سکتا ہے۔ تاہم، متشدد موت تمام معقول یا قابلِ تصور توقعات کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ بیسویں صدی اور اس کے ادب میں تشدد کی تاریخ انہی خطوط پر چلتی ہے، یعنی حملہ آور کے کردار کے حوالے سے: حملہ آور بطور انسان، بطور آلہ، بطور مشین اور بطور منظر (لینڈ

سکیپ)۔ موخرالذکر معاملے میں حملہ آور نہ تو انسان اور نہ ہی مکینکل ہے، بلکہ وہ سارا ماحول، دھرتی یا دنیا یا نظامِ شمسی ہے۔ ادب میں اس صورت حال کا اظہار صحرا کے وسیع لینڈ سکیپ یا کوہستانی تناظر کی صورت میں کیا گیا۔ دوسری عالمی جنگ کے متعلق کی گئی زیادہ تر شاعری تشدد کے لینڈ سکیپ یعنی جنگ کے استعارے کو ایک ایسی خلا کے طور پر لیتی ہے جو فوجی کے ماضی اور مستقبل کے درمیان معلق ہے۔ فوجی کو ایک نمبر دیا جاتا ہے، اُسے بے نام ہو جانے کو کہا جاتا ہے...... یعنی کہ وہ اپنا جذبہ فوج کو دیدے تاکہ اُسے فوجی ضروریات کی مطابقت میں استعمال کیا جا سکے۔ اپنی شناخت کو مستقل یا عارضی طور پر کھونے کے باعث وہ غیر حقیقی پن اور بے نامی کی ایک حالت میں وجود رکھتا ہے جو اُس کی موت کے حالات تشکیل دیتی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ اُسے شناخت کے بغیر موت کا خطرہ مول لینا پڑتا ہے۔ وہ ایک ''نامعلوم فوجی'' بن جاتا ہے۔ دوسری عالمی جنگ کی نسبت پہلی عالمی جنگ کے ادب میں صدمے کا اظہار زیادہ تیکھا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی عالمی جنگ سے قبل تشدد کی کوئی وسیع مثال موجود نہیں تھی اور لہٰذا اِس کی توقع بھی نہیں کی جا رہی تھی۔ صورت حال نے فوجی کو اپنی جانی پہچانی حقیقت سے بالکل الگ کر دیا۔ ہمارا زیادہ تر ادب غیر متوقع تشدد یا آئندہ ممکنہ تشدد کی پیدا کردہ ٹینشن کا ادب ہے۔

4

جدید ادب میں نفس کا کردار زبردست تبدیلیوں سے گزرا ہے۔ اِس کا آغاز ولیم جیمز کے ''خالص، عملی'' شعور کے ساتھ ہوتا ہے۔ اِس نے ایک ایسے دور میں ترقی پائی جب خود آگہی ایک مزیدار کھیل سے کچھ ہی زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ برگساں کے ''elan vital'' (تخلیقی قوتِ حیات) میں بھی اِس کا آغاز ہوا۔ نفس یا خود آگہی کا غلبہ ہونے کے ساتھ ہی اِس کے خلاف طنز شروع ہو گیا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں رمباؤ اور لافورگ اِس طنزیہ رجحان کے نمائندہ تھے۔ ایلیٹ، ایزرا پاؤنڈ، جیمز جوائس، آندرے ژید، اور حتیٰ کہ ولیم فاکنر نے بھی تضحیکی مراقبہ کی کچھ صورتیں پیش کیں۔ بہر صورت، ذات یا نفس کو ہجوم سے الگ کر دیا گیا۔ 1930ء کی دہائی میں جب نفس ریاستی سطح پر جگہ نہ پا سکا تو یہ ایک مسترد کردہ ذہانت کے طور پر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

نفس کے بارے میں اہم ترین اور کئی اعتبار سے نہایت ''حقیقت پسندانہ بیان وجودیت پسندوں کا تھا۔ اِس نے نفس کی وضاحت کرنے میں مذہب کا سہارا نہ لیا۔ سارتر نے وجود کی

بنیادوں پر ایک تکوینیات، ایک معادیات، ایک زمین اور دوزخ بنائی۔ آپ زندگی کو سہتے ہیں، کیونکہ آپ ''موجود'' ہیں۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سارتر ''موت بطور انتقام'' پر زور نہیں دیتا۔ پھر بھی موت کا کردار اور انسانی توقعات پر اِس کا اثر اتنی اہمیت کا حامل ضرور ہے کہ اُس نے سارتر کی فکر میں ایک کافی اعلیٰ حیثیت حاصل کر لی۔ سارتر کی مرکزی دہشت لاشیئیت یا خالی پن ہے، لیکن موت اِس لاشیئیت سے تصوراتی نجات کا ایک اہم ترین ذریعہ بھی ہے۔ ''The Wall'' اور ''The Victors'' نامی دونوں کہانیاں انسان پر موت کی قطعیت کے گہرے اثر کی توثیق کرتی ہیں۔

یہاں میں نے رحمت، تشدد اور نفس کے حوالے سے جدید ادب میں موت کے متعلق تاثرات پر بات کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرے خیال میں نفس، ہستی کے اصولِ اول کے طور پر، جدید ادب کی تہہ میں موجود غالب ترین نظریہ ہے۔

فریڈرک جے ہوفمین

12
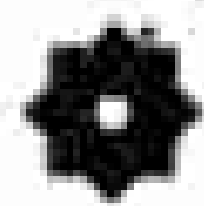
جدید آرٹ اور موت

فرد کی ہستی میں پیدائش اور شادی کے ساتھ موت بھی ایک اہم ترین واقعہ ہے۔ لہٰذا آرٹ میں موت کو ایک عام موضوع کے طور پر استعمال کیا جانا باعثِ حیرت نہیں۔

ہمارے موجودہ دور نے وسیع پیمانے پر قتل عام اور اموات دیکھی ہیں جن کے مقابلے میں قرونِ وسطیٰ کے دوران بیماریوں سے ہونے والی ہلاکتیں ہیچ نظر آتی ہیں۔ تاہم، حیرت انگیز طور پر جدید آرٹ میں موت کا اظہار کچھ کم پڑ گیا ہے۔ اُنیسویں صدی کے آخر میں چند ایک آرٹسٹوں نے ہی اِسے بطور خصوصی موضوع اپنایا۔ اِمپریشنسٹس، Matisse اور Fauves، بونارڈ اور ویولارڈ وغیرہ جیسے آرٹسٹوں کے پورے پورے گروہوں نے اس سے دامن بچایا۔ جدید آرٹ کے ایک اہم حصے نے اس ناگزیر اور نظر انداز کیے ہوئے موضوع کو پیش کیا۔ مثلاً پینٹر ڈیگاس کو ہی لیں: وہ ایک دھوبن کو کپڑے دھونے کی بجائے جمائیاں لیتے یا بوتل کو غور سے دیکھتے ہوئے دکھاتا ہے؛ اور نائٹ میں موجود عورت اب خوب صورتی کا معروض نہیں رہی...... بلکہ وہ اپنی کمر کھجلا رہی ہے۔

موت کے تصور کو اہم ماننے سے انکار کرنے والے جدید آرٹ نے حزن و ملال کے ایک تاثر کو زائل کرنا چاہا جو ہماری تاریخ کے آخری سو سال کے دوران ہونے والے خوف ناک واقعات کی پیداوار تھا۔ Matisse نے کہا کہ وہ اپنے آرٹ کے ذریعہ نسلِ انسانی کو ذہنی سکون دینا چاہتا ہے۔ اگر اوپر بیان کردہ قضیہ درست ہے تو لگتا ہے کہ ہمارا دور سنگ دلانہ اور خوف ناک سوچوں سے لڑنے کے لیے اُنھیں دبا رہا ہے، جبکہ چودھویں اور پندرھویں صدیوں میں اُنھیں پیش کرنے

کے ذریعہ 'خارج' کیا گیا۔ اُنیسویں صدی کے آخری عشروں کے دوران موت میں دلچسپی کا ایک دور اِس تصور کے ساتھ منسلک تھا کہ سب کچھ ختم ہونے والا ہے۔ ادب میں اِس کا ذکر جا بجا آیا۔ نہ صرف اُنیسویں صدی بلکہ ایک اندازِ حیات بھی اختتام پذیر ہو رہا تھا۔ صنعتی دور کا بورژوا خلائی دور کے مبہم ہُو کو جگہ دے رہا تھا۔ یہ صورت حال ایک سوال پیش کرتی ہے کہ آیا موت میں حد سے زیادہ دلچسپی اور ایک عہد کا اختتام اتفاقی ہے یا نہیں: اس نے قرونِ وسطیٰ کے اختتام اور جدید دور کے آغاز کی نشان دہی کی۔ شاید موت کے موضوع کا استعمال آنے والی تبدیلی کو محسوس کرنے والے آرٹسٹ کی ایک خصوصی صلاحیت کا نتیجہ تھا۔

تمام بصری موضوعات کو متعدد طریقوں سے پیش کیا جا سکتا ہے: اُنھیں ارفع، طنزیہ یا علامتی روپ دینا ممکن ہے۔ نیز، انفرادی موضوع آرٹسٹ کے لیے مخصوص مسائل پیش کرتا ہے۔ موت کے معاملے میں آرٹسٹ یا تو موت کا مجرد تصور یا پھر کسی شخص کی موت کا تجربہ دکھا سکتا ہے۔ ایک مجرد تصور کے طور پر موت کو علامتی صورت دی جا سکتی ہے۔ مخصوص واقعہ وقت، موقعے اور صورت حالات کے انتخاب کی اجازت دیتا ہے۔ اُس کے پاس موت کو مختلف طریقوں سے دکھانے کی سہولت ہوتی ہے: موت سے پہلے یا بعد کی حالت، تنہائی میں موت یا خودکشی، فوجی کی ہلاکت، بوڑھے آدمی کی نارمل موت، بچے کی بے وقت موت، یا کوئی قتل۔ موت ایک نجات دہندہ یا پھر تباہ کنندہ کے طور پر ہم تک آ سکتی ہے۔ اِسے خوش آمدید کہا یا پھر اِس سے خوف کھایا جاتا ہے۔ اِس سب میں سے کوئی ذریعۂ اظہار منتخب کرتے وقت آرٹسٹ زندگی اور موت کے متعلق اپنے رویے ظاہر کرتا اور یوں اپنے کردار کی جھلکیاں پیش کرتا ہے۔ اِسی طرح موت کے موضوع کو پسند کرنے کی ذاتی وجوہ بھی کثیر التعداد ہیں؛ مثلاً تشدد اور جارحیت کی جانب رجحان، آنے والی تباہی کا احساس، وغیرہ۔ یہاں میرا مقصد 1850ء اور 1950ء کے درمیانی عرصے میں موجود رجحانات پر بحث کرنا اور سابقہ ادوار کے ساتھ اُن کا مقابلہ کرنا ہے۔

موت کی شخصی صورتیں

عہد نامۂ عتیق میں موت کا ذکر خدا کے بھیجے ہوئے فرشتے کے طور پر آیا ہے (سلاطین دوم، 19:97-35)، جبکہ عہد نامۂ جدید نے اِسے زرد گھوڑے پر سوار شخص کہا (مکاشفہ، 6:8)۔ ہومر نے

ایلیڈ میں موت کو نیند کا بھائی قرار دیا جو متوفی سارپیڈون کی لاش لے جاتا ہے۔ بصری آرٹس میں بھی اِس قسم کے اظہار ملتے ہیں۔ بہت سی قبروں پر موت کے فرشتے کی تصاویر بنائی گئیں اور قدیم گھڑوں کی بہت بڑی تعداد پر فرشتۂ موت کی شبیہ بنی ہے۔ ڈیورر کے دو پرنٹس ''The Four Horsemen'' اور ''Knight, Death and Devil'' زرد گھوڑے کے سوار کی مثال ہیں۔ مؤخر گوتھک عہد نے اِن شبیہوں میں موت کا ایک نیا اور نہایت زوردار پورٹریٹ شامل کیا: لاش۔ ابتداً میں ایک ممیائی اور سکڑی ہوئی لاش دکھائی گئی، لیکن پچاس سال کے اندر اندر اِس نے ایک ہڈیوں کے ڈھانچے کی صورت اختیار کر لی جس کا گوشت گل سڑ چکا تھا۔ عہد نامۂ عتیق اور جدید کی شبیہیں موت کو ایک فرشتے یا گھوڑ سوار کے طور پر دکھاتی ہیں، جبکہ ایلیڈ اور 1400ء کی دہائی والی شبیہیں موت کو ایک ہڈیوں کے ڈھانچے یا نیند کے بھائی کی صورت میں پیش کرتی ہیں۔

جدید آرٹ نے موت کو مجسم صورت میں پیش کرنے کے حوالے سے کوئی حصہ نہیں ڈالا۔ جدید مصوروں اور سنگ تراشوں نے اِس تشبیہ سے دامن بچایا اور عموماً علامات پر ہی انحصار کیا۔ ہم علامتی صورت میں ہی تخیل کی کارفرمائی دیکھتے ہیں۔

موت کی روایتی علامات

موت کے لیے کچھ روایتی علامات درانتی اور ریت گھڑی (جو دیوتا کرونوس یعنی ''وقت'' سے مستعار لی گئیں)، تیر اور کمان (جو دیوتا ایروس یعنی محبت سے مستعار لی گئیں)، اُلٹی مشعل اور تلوار ہیں۔ کھوپڑیاں اور ہڈیوں کے ڈھانچے بھی موت کا اظہار کرتے ہیں۔ آرٹسٹوں نے یہ تمام علامات بہت زیادہ استعمال کی ہیں۔ تاہم، اِن کے استعمال کا مقصد ہر دور میں بدلتا رہا۔ مصری اور رومن ضیافتوں میں چاندی کے ڈھانچے یا تابوتوں میں مصنوعی لاشیں بصورت جلوس لیجائی جاتی تھیں۔ ہیروڈوٹس نے اپنی ''تواریخ'' کی کتاب دوم میں اِس کا ذکر کیا ہے۔ یہ علامات مہمانوں کو اپنے مقدر کی یاد دلا کر زندگی سے حظ اُٹھانے کی تحریک دیتی تھیں۔

قرونِ وسطیٰ کا عیسائی آرٹ کھوپڑیاں اور ہڈیاں پیش کرنے کا ایک بالکل مختلف مقصد رکھتا تھا۔ یہ ہمیں دنیاوی زندگی کے عارضی اور غیر اہم ہونے کی یاد دلانا چاہتا تھا۔ پندرھویں صدی کی ابتداً میں متوفی کو ممی، گلتی ہوئی لاش یا ہڈیوں کے ڈھانچے کے طور پر مقبرے پر دکھایا جاتا تھا۔ یہ

شبیہ مردے کی تمثیل سمجھنی چاہیے کیونکہ یہ اُس دور تک سنگ ہائے مزار پر استعمال ہونے والے پورٹریٹس کا متبادل ہیں۔ اِس قسم کی بہترین مثال آوی نیون میں کارڈینل لاگرانج (وفات 1402ء) کا مقبرہ ہے۔ کندہ تحریر میں کہا گیا ہے: ''تم غرور کیوں کرتے ہو؟ تم بھی راکھ ہو اور جلد ہی میری طرح کیڑوں کی خوراک بنو گے۔'' کچھ صورتوں میں دو شبیہیں بنائی جاتیں: ایک میں متوفی کو زندہ اور دوسری میں ممی، لاش یا ڈھانچے کے طور پر پیش کیا جاتا۔ یہاں زندگی اور موت کا فرق دکھانا مقصود تھا۔ یہ تصور اُن پینٹنگز میں بھی پیش ہوا جن میں بچے کو کسی کھوپڑی کے روبرو دکھایا گیا۔

بہت سے جدید آرٹسٹوں نے کھوپڑی، درانتی یا اُلٹی مشعل کی روایتی علامات استعمال کی ہیں...... حتیٰ کہ قیزانے (Cezanne) نے بھی، جس کا موضوع نئے اسلوب کے ساتھ موازنے میں قطعی روایتی نظر آتا ہے۔ قیزانے نے اپنی زندگی میں دو مرتبہ کھوپڑی، شمع اور بند کتاب پیش کرنے میں دلچسپی لی: جوانی میں (1865-67ء) اور زندگی کے آخری عشرے (1894ء تا 1905ء) میں۔ اُس کی ایک پینٹنگ ایک جوان آدمی کو کھوپڑی کے بالمقابل دکھاتی ہے۔ یوں اُس نے انسانی ہستی کے مفہوم میں فلسفیانہ انہماک کا اظہار کیا۔ یہ اُن نادر مثالوں میں سے ایک ہے جب قیزانے اپنے عظیم ہم عصر واں گاگ سے مماثلت اختیار کرتا ہے۔ ستمبر 1889ء میں واں گاگ نے ایک غلے کا کھیت پینٹ کیا جس کے اوپر ایک بڑا سا سورج روشن تھا اور ایک کسان درانتی پکڑے کٹائی میں مصروف تھا۔ واں گاگ نے ایک خط میں پینٹنگ کے متعلق کہا: ''.....ایک مبہم شبیہ سخت گرمی میں شیطان کے ساتھ نبرد آزما ہے تاکہ اپنا کام پورا کر سکے...... مَیں اُس میں موت کی شبیہ دیکھتا ہوں...... انسانیت ہی وہ فصل ہے جسے وہ کاٹ رہا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اِسے بوائی کرنے والے شخص کا متضاد کہہ لیں جو میں نے قبل ازیں پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اِس موت میں کوئی باعثِ ملال بات نہیں...... وہ دن دیہاڑے اور کھلی روشنی میں باہر نکلی ہے......'' واں گاگ نے روایتی موضوع کو اپنی ذاتی تعبیریں دیں۔ یہ اُس کا خصوصی وصف تھا۔

زندگی اور موت کے مسئلے سے مسحور ایک اور آرٹسٹ گاگوین (Gauguin) تھا۔ تاہم، اُس نے طے شدہ علامتیں استعمال کرنے سے انکار کیا اور اپنی پینٹنگز کے عنوانات کے ذریعہ مفہوم واضح کرنا زیادہ بہتر سمجھا؛ مثلاً، ?Where do we come from، ?What are we، ?Where are we going جو 1897ء میں مکمل ہوئی۔ پکاسو بھی مابعد الطبیعیاتی غضب کی جانب بہت

زیادہ مائل تھا۔ لیکن اس دیوقامت شخصیت میں بیک وقت کئی رجحانات دیکھے جاسکتے ہیں۔ گاگوئین والے انداز میں ایک علامتی عنوان استعمال کرنے کے ساتھ آغاز لیتے ہوئے اُس نے قیزانے کی پیروی میں روایتی علامات کی جانب رجوع کیا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد اُس نے زندگی اور موت کو ''جنگ اور امن'' کے ساتھ جوڑا (1952ء)۔ بہت سے آرٹسٹوں کی نظر میں موت اور جنگ ہم معنی بن گئے تھے۔

موت کی شخصی صورتوں سے مستعار لی ہوئی علامات کے علاوہ کچھ دیگر علامات بھی ہمیشہ سے موجود تھیں اور اب بھی ہیں۔ انہیں چار گروپس میں رکھا جاسکتا ہے:

1۔ انسان کے علاوہ دیگر شعبوں میں موت سے ماخوذ موضوعات، مثلاً بے برگ شجر، آسمانی بجلی سے جلے ہوئے درخت، کھنڈرات، یا برفیلے اور منجمد مناظر۔ اس قسم کی جدید پینٹنگز میں قیزانے کی ''Quarries'' اور اَیرک ہیکل کی ''Spring in Flanders'' شامل ہیں۔

2۔ قبرستان اور تابوتوں، اور گدھوں پر مشتمل موضوعات۔ واں گاگ کے صنوبر کے درخت اور کوے اس ضمن میں آتے ہیں۔ اُس نے دیوانگی کے پہلے حملے کا شکار ہونے کے بعد انہیں اختیار کیا۔ پکاسو کی ''Woman Kissing a Crow'' (1904ء) اور Klee کی ''Purple Asters'' (1919ء) دیگر مثالیں ہیں۔

3۔ قتل و غارت گری سے متعلقہ موضوعات، مثلاً Goya میں مثلہ کی گئی ٹانگیں۔ علامات کے اوپر مذکور گروپس میں تشدد کی نشاندہی شامل نہیں، کیونکہ موت، تباہی اور انحطاط وقت گزرنے پر آئے۔

4۔ موت کی وجہ بن سکنے والے آلات: ہتھیار، چاقو، خنجر وغیرہ۔ میکس بیک مین کی پینٹنگز میں یہ بکثرت ملتے ہیں۔

یہ تمام موضوعات صرف ایک معنوی مفہوم میں ہی علامات بنتے ہیں؛ بصورت دیگر ناظر انہیں اولین تاثر کے طور پر ہی لیتا ہے۔ پکاسو کی ''Still Life with Blood Sausage'' میں مخفی مفہوم صرف اس لیے واضح ہے کیونکہ آرٹسٹ نے ڈیلر Janis کو بتایا تھا کہ دراز سے باہر نکلے ہوئے خنجر اور چھریاں اُس کے لیے ''عارضی صعوبت گاہ سے نکلی ہوئی روحیں'' ہیں۔

گھڑی موت کی جدید علامت کے طور پر

ریت گھڑی کا جدید متبادل گھڑیال یا گھڑی ہے اور یہ علامت جدید آرٹ کے نہایت مختلف حلقوں میں نظر آتی ہے۔ میں قیزانے، کلی (Klee)، سلواڈور ڈالی اور چاگال (Chagall) کے ہاں اس کے مفہوم پر بات کروں گی۔

تقریباً 1870ء میں قیزانے نے اپنی ابتدائی ''Skulls'' بنانے کے بعد ایک سٹل لائف ''The Black Clock'' پینٹ کی۔ اس میں قیزانے نے وقت کو جامد و ساکت دکھایا ہے جیسا کہ وہ ابتدائے آفرینش میں تھا۔ اُس نے یہ موضوع پھر کبھی نہ پیش کیا۔

Klee کا فلسفۂ حیات کچھ مختلف رنگ رکھتا اور ابدیت کی بجائے حیات بعد الموت پر زور دیتا ہے۔ اُس نے متعدد پینٹنگز میں ٹائم پیس استعمال کیا۔ تاہم، Klee کی گھڑیاں عموماً سوئیوں والی ہیں جو بھوتوں والے ٹائم یعنی بارہ بجے رات پر سیٹ ہیں۔ واٹر کلر ''Heavenly and Earthly Time'' میں گھڑیال بالکل خالی ہے۔ ریت گھڑیاں جابجا بکھری پڑی ہیں۔ اپنے دیے ہوئے عنوان کے ذریعہ Klee نے واضح کر دیا کہ اُس کے خیال میں ''آسمانی وقت'' موجود ہے۔

ڈالی نے گھڑیال (کلاک) کی بجائے گھڑی کا انتخاب کیا۔ اُس کی ''The Persistence of Memory'' اس قدر مشہور ہے کہ اُسے اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس پینٹنگ میں گھڑیاں کسی نہ کسی طرح ٹوٹی ہوئی ہیں اور یوں ایک ہی جگہ رک گئی ہیں۔ ایک میز پر اُگے ہوئے بے جان درخت سے معلق گھڑی دوہری کی ہوئی ہے۔ میز کے کنارے پر ایک اور خمیدہ گھڑی موجود ہے۔ ساتھ ہی ایک اور گھڑی حشرات کے ساتھ رینگ رہی ہے۔ مزید ایک لچکیلی گھڑی کمبل کی طرح ایک ہیولے کے گرد لپٹی ہوئی ہے۔ اس منظر کے پیچھے ایک خالی آسمان اور خالی کوہستان ہے۔ پینٹنگ کے عنوان میں ڈالی اُن لوگوں کا حوالہ دیتا ہے جو زمانہ حال کی بجائے یادوں میں زندگی گزارتے ہیں۔ مردہ ماضی حال کو آلودہ کرتا اور اُسے مسخ کر کے موت جیسا بنا دیتا ہے۔ ڈالی بے جان گھڑیوں کے ذریعہ ابدیت یا حیات بعد الموت نہیں بلکہ مردہ پن پیش کر رہا ہے۔ وہ مابعد الطبیعیاتی سوالات پر غور و فکر کیے بغیر موت کو ایک ویرانے کے طور پر دیکھتا ہے۔

دوسری طرف بے وقت گھڑی اگرچہ ابدیت کی غماز ہے، لیکن شاید موت کو پیش نہیں کر رہی۔ Chagall کی ''Time is a River without Banks'' اسی استعارے کو استعمال کرتی ہے۔

چوڑے دریا میں ایک چھوٹی سی کشتی تیر رہی ہے جو وقت کے دھارے پر انسانی زندگی کی علامت معلوم ہوتی ہے۔ دریا کے کنارے پر دو محبت کرنے والے لیٹے ہیں۔ وہ گزرتی ہوئی ساعتوں سے بے خبر اور وقت کے دھارے سے باہر ہیں۔ شلر نے ''والنسٹین'' میں کہا، ''خوش قسمت لوگوں کے لیے وقت ختم جاتا ہے۔'' اِسے سوئیوں کے بغیر ایک بڑے پنڈولم کلاک کے ساتھ دکھایا گیا ہے جو پینٹنگ کے وسط میں ہے۔ اس کے اوپر ایک پردار مچھلی اُڑتے ہوئے وائلن بجا رہی ہے۔ محبت کرنے والوں کی طرح مچھلی بھی وقت کے محدود دھارے سے باہر نکل آئی ہے...... آرٹسٹ اپنے آرٹ کے ذریعہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔

موت کو بیان کرنے کے غیر معروضی انداز

آرٹ کے بہت سے عظیم شاہکار مجرد اور غیر معروضی ہیں۔ یہ چیز ایک سوال اُٹھاتی ہے: کیا موت کو صرف Form کے ذریعہ بیان کیا جا سکتا ہے؟ مجھے یقین ہے کہ رنگ، لائن اور شیپ...... علیحدہ علیحدہ یا مل کر...... کسی حقیقت پسندانہ شبیہ کے ساتھ ساتھ موت کا تصور بھی منتقل کر سکتے ہیں۔ اِس حوالے سے فوراً کالے رنگ، آڑی ترچھی لائنوں اور ٹیڑھے میڑھے کونوں والی شیپس ذہن میں آتی ہیں۔ تاہم، اوپر مذکور میں سے کسی کو بھی ہمیشہ موت کا اظہار نہیں کہا جا سکتا۔ انہیں استعمال کیے جانے کا سیاق وسباق اُن کے پیغام کو سمجھنے کے لیے نہایت اہم ہے۔ کبھی کبھار آرٹسٹ اپنے کام کو عنوان یا اُس کے متعلق ایک بیان دینے کے ذریعہ اپنا مطمعِ نظر واضح کر دیتا ہے۔

کئی جدید آرٹسٹوں نے کالے رنگ اور اِس کے مختلف شیڈز سے کام لیا ہے۔ لوئی نیولسن نے لکڑی سے کالا پینٹ کی کوئی کنسٹرکشنز بنائیں۔ ایک کو اُس نے ''Sky Cathedral'' (1958ء) اور دوسری کو ''Moon Dial'' کا نام دیا۔ اِن عنوانات سے ظاہر ہے کہ اُس نے کالے رنگ کے ذریعہ موت کے بعد انسان کو پیش آنے والے حالات سے لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ پکاسو کی ''Still Life with Blood Sausage'' ایک خاکستری نمونہ ہے۔ آرٹسٹ نے تاریک اور مایوی زدہ فضا پیش کرنے کی خواہش کی۔ یہ پینٹنگ 1941ء میں جرمن قبضے کے دوران بنائی گئی۔ چونکہ موت کو ایک بہتر دنیا میں زندگی کے ساتھ ساتھ لاشیئیت سے بھی جوڑا جا سکتا ہے، اِس لیے کالے اور سرمئی رنگ کے علاوہ دیگر رنگ بھی استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

آڑی ترچھی لائنیں دو تصورات پیش کرتی ہیں: دانستہ دکھ اور مقید پن۔ Jean Bazaine، Mark Tobey، Willem de Kooning، Carzou، جمی ارنسٹ اور متعدد دیگر آرٹسٹوں نے اِنہیں استعمال کیا ہے۔ کالا رنگ انسان کی موت کے بعد کی تاریکی کی علامت ہے۔ ٹیڑھی میڑھی لائن ایک جارحیت پسند دنیا اور دیوار سے لگے ہوئے آدمی کے درمیان لڑائی کی نمائندہ ہے۔ موت سے عین پہلے کے لمحے میں فرار کی کوئی راہ باقی نہیں رہ جاتی۔

موت کی تصویر کشی میں آرٹسٹک مزاج کی عکاسی

موت ایک عظیم راز ہے۔ آرٹسٹ اپنے فطری مزاج کے مطابق ہی اِس کے ساتھ نبرد آزما ہوتا ہے...... چاہے وہ فلسفی ہو، ایک اخلاقیات پسند ہو، یا پھر مزاح نگار یا دہشت پسند۔ تین چیزیں اُسے موت کے موضوع سے رجوع کرنے پر مائل کر سکتی ہیں: کوئی ذاتی تجربہ، کوئی تاریخی واقعہ یا کوئی ذہنی حالت۔ کچھ صورتوں میں کوئی دو یا تینوں عوامل بھی موجود ہو سکتے ہیں۔ پکاسو کی ''Guernica'' 1937ء میں باسک شہر پر جرمن طیاروں کی بم باری کے بعد چھ ہفتے کے اندر مکمل ہوئی۔ تاہم، صرف ماں اور بچہ پکاسو کے آرٹ میں نئی علامات ہیں۔

فلسفے کو فکری نظاموں کی ملکہ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ موت کے حوالے سے مختلف آرٹسٹک مزاجوں کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم سب سے پہلے فلسفی کو ہی لیں گے۔ اُنیس سالہ Chagall نے 1908ء میں ''Death for Candles on a Dark Street'' بنائی۔ 1909ء میں ''Wedding'' پینٹ کی۔ 1910ء میں ایک اور ''Wedding''، ''The Birth'' اور پھر 1913ء میں ''Pregnant Woman'' بنائی۔ اِس سلسلے میں Chagall کی ''موت'' دورِ حیات کے ایک حصے کے طور پر ظاہر ہوئی۔ Chagall انسانی ہستی میں خصوصی مواقع کو پیش کرنے کی وجہ سے پرانی طرز کا مصور تھا...... سالگرہ، ہنی مون، وغیرہ۔ وہ انسانی زندگی میں اعلیٰ اور رفیع الشان لمحات کا متلاشی تھا، نہ کہ روزمرہ وقوعات کا۔

زیادہ اخلاقیات پسند آرٹسٹ موت کو ہماری سماجی اور سیاسی برائیوں کی نشان دہی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اُن کے موضوعات غیر شادی شدہ ماں کی بے وقت موت، فاقہ زدہ یتیم اور سپاہی ہیں۔ اُن کا مفہوم واضح کرنے کے لیے وہ اکثر ایک سیریز کی صورت میں بنائے گئے۔ Dix

کی "Dying Soldier" اِس رجحان کی عکاسی کرتی ہے۔ اخلاقیاتی رویہ بیسویں صدی کے جرمن اور میکسیکی آرٹسٹوں میں خاص طور پر عیاں ہے۔

موت کی تصویر کشی ایسے تخیلات کو ظاہر کرنے کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے جو کبھی خوف ناک تو کبھی طنزیہ ہوں۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں آرٹسٹوں کے پورے ایک گروپ نے موت کو اِسی حوالے سے دیکھا (مغربی یورپ میں Ensor، Willette اور Rops؛ میکسیکو میں پوساڈا)۔ یہ آرٹسٹ کافی حد تک ہڈیوں کے ڈھانچوں کے پیدا کردہ غیر موزوں تاثر پر انحصار کرتے ہیں جو زندہ انسانوں کے ساتھ ملتے جلتے اور اُنہی جیسا رویہ اپناتے ہیں۔ کسی نمونۂ فن میں بدصورتی اور خوفناکی کے درمیان تمیز کرنا ہمیشہ ہی آسان نہیں ہوتا، کیونکہ خطِ امتیاز بہت باریک ہے اور دیکھنے والے کے مزاج پر انحصار کرتا ہے۔ نمونۂ فن کو تخلیق کیے جانے کا مقصد کافی اہمیت کا حامل ہے۔

چنانچہ 18 جون، 1898ء کو منعقد ہونے والی "Old Montmartre" سوسائٹی کی ضیافت کے لیے Willette کا مینو کارڈ مجھے مزاحیہ لگتا ہے۔ اِس میں ایک مردہ برہنہ پیکر کو بربط کے ساتھ دکھایا گیا ہے، جبکہ اُسے پرندوں نے گھیر رکھا ہے، پس منظر میں مونت مارترے کی مشہور پن چکی ہے، اور ایک صلیب کے نیچے کھوپڑی اور ہڈیاں پڑی ہیں۔ میکسیکو میں سماجی اور سیاسی ناانصافیوں کے خلاف جذبے سے بھرپور پوساڈا کے ہڈیوں کے ڈھانچے مجھے بدصورتی کے عکاس معلوم ہوتے ہیں۔ اِس رجحان کا بہترین مطالعہ بلجیئن اینسر کے فن میں کیا جاسکتا ہے۔

اینسر ماسکس اور ہڈیوں کے ڈھانچے استعمال کرنے میں ماہر تھا۔ اُس نے یہ ذرائع خوف ناک پن کی وجہ سے منتخب کیے۔ ہیبت ناک نظارے پیش کرنے کے ذریعہ اینسر کا مقصد انسان کی اخلاقیاتی بدنمائی کو باہر لانا تھا: ماسکس، ڈھانچے اور دہشت ناک عفریت۔ 1888ء میں اُس نے "My Portrait in 1960" بنائی۔

کوئی دہشت پسند شخص آنے والی آفت کے الہامی احساس کے ذریعہ کسی تصور پر پہنچ سکتا ہے۔ جرمن شاعر اور پینٹر Meidner کے ساتھ یہی معاملہ لگتا ہے جس کی "Burning City" (1913ء) نے پہلی عالمی جنگ کی ہولناکیوں کو پیشگی تصور کر لیا تھا۔ جبکہ میڈنر کے ہم عصر میکس بیکمین نے 1912ء میں "Sinking of the Titanic" بنائی اور "Nightmare" میں تازی مظالم کو پیش کیا۔

Goya اور پکاسو بھی پرتشدد موت کی جانب مائل نظر آتے ہیں۔ لیکن اُن کے لیے اصل اہمیت موت کی ظالمانہ اور بےنظیر طاقت ہے، نہ کہ محض واقعات کو ریکارڈ کرنا۔ دونوں مصوروں نے بے پناہ طاقت کی علامت بیل کو رفعت دی۔ لیکن دونوں ہسپانوی بیکمین کی نسبت بہتر ماہر نفسیات تھے۔ وہ جانتے تھے کہ دہشتوں کو پیش کرنے میں لکیر کہاں کھینچی ہے: وہ اپنی پینٹنگز میں متشدد اقدامات کی تیاریاں نہیں دکھاتے۔ انسانی ذہن کٹی ہوئی ٹانگوں کو برداشت کرنے کے قابل نہیں لگتا، جب تک کہ قصاب خود ایک مجرد وجود نہ ہو۔ مجھے یقین ہے کہ ایک بم گرانے اور خنجر گھونپنے کے درمیان یہی فرق ہے۔

فلسفی، اخلاقیات پسند اور دہشت پسند ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ اُن کے مختلف رجحانات نے صدیوں کے دوران موت کو پیش کرنے کے انداز میں رنگینی اور تنوع پیدا کیا۔ چاگل، بیکمین اور ڈالی نے ذاتی تخیلات کو اظہار دینے کے باعث سابقہ آرٹسٹوں سے مختلف روش اختیار کی۔ بیسویں صدی کے آرٹ میں نفس اور نجی تخیل کے موضوعات بار بار ملتے ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ موضوع کے انتخاب میں زندگی کی جانب ایک جدید رویہ بھی موجود ہے۔ اب ہم اِسی پر بات کریں گے۔

موت کے پرانے موضوعات

کبھی کبھی کوئی آرٹسٹ ایک ایسا موضوع منتخب کرتا ہے جسے اُس کے معاصرین نظرانداز کر گئے ہوں۔ تاہم، وہ ایک ایسا تار چھیڑ دیتا ہے جس کا بھرپور جواب دیا جاتا ہے۔ نئے موضوع کو اپنا کر متعدد صورتیں دی جاتی ہیں۔ آرٹ کے مؤرخ کے لیے کسی موضوع کا جنم ہمیشہ مسحور کن مطالعہ کا معروض رہا ہے۔ وہ مخصوص موضوع کسی مخصوص وقت پر کیوں وجود میں آیا؛ اِس کا رجحان بڑھنے یا ختم ہونے کی وجہ کیا ہے...... یہ سوالات اُس کے ذہن پر غلبہ پا لیتے ہیں۔ موت کے جدید موضوعات پر بات کرنے سے قبل 1300ء اور 1500ء کے درمیانی عرصہ کا ایک طائرانہ جائزہ لے لینا مفید رہے گا۔

چودھویں اور پندرھویں صدیوں نے موت کے ساتھ نمٹنے کے لیے ہمیں موضوع ورثہ میں دیے۔ پہلے تین موضوعات نے شمال اور آخری نے اٹلی میں ترقی پائی۔ وہ "Encounter of the three Living with the three Dead"، "the Dance of Death"، "the Art of

Dying ''اور'' the Triumph of Death '' ہیں۔ پہلا موضوع شکار پر نکلے ہوئے تین نائٹس کو دکھاتا ہے جنہیں راستے میں تین لاشیں تابوت میں پڑی ملی ہیں۔ ایک ذرا مختلف شکل میں جوان اور خوب صورت لڑکی آئینے میں اپنے سر کو بطور کھوپڑی دیکھ رہی ہے۔ ''دی ڈانس آف ڈیتھ'' موت کے سامنے تمام انسانوں کی برابری پیش کرتی ہے۔ چاہے پوپ ہو یا کوئی مجرم، بوڑھا ہو یا بچہ، راہب ہو یا عاشق، کوئی بھی موت سے مبرا نہیں۔

دنیاوی زندگی میں کسی فرد کا رویہ اُس کے مقدر پر کسی اثر کا حامل نہ ہونے کا تصور کافی پریشان کن اور خطرناک ہے۔ مسیح اور شہداً کی مثالیں اِس پریشانی کا ازالہ بہ مشکل ہی کر پاتی ہیں۔ خدا کے وجود کے متعلق شکوک پیدا ہوتے ہیں؛ جواب میں یہ ماورا کا خوف پیدا کرتے ہیں۔ جہاں تک اطالوی ''Triumph of Death'' کا معاملہ ہے تو یہ موت کو خدا کے نمائندہ کی بجائے اُس کا متبادل بنا کر پیش کرتی ہے۔ مقدر کی ناانصافی سے بغاوت، نامعلوم سے خوف، موت کے حق میں خدا سے انکار...... یہ چودھویں اور پندرھویں صدی کے غالب موضوعات ہیں۔

حاصلِ بحث

ہر نمونہ فن کے دو اہم ترین پہلو اِسے پیش کرنے کا انداز اور اِس میں شامل پیغام ہیں۔ آیئے اب اِسی کو مدنظر رکھ کر اپنی بحث کو اختتام پر پہنچاتے ہیں۔

جدید آرٹسٹ موت کو شخصی صورت میں پیش نہیں کرتے کیونکہ وہ تشبیہ کی روح سے آشنا نہیں۔ موت کو علامات کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے۔ اِن میں سے ایک علامت کلاک ہے جس نے ریت گھڑی کی جگہ لی۔ موت کی ایک زیادہ انکشافی جدید علامت گلتا سڑتا ہوا زندہ انسانی وجود ہے۔ یہ ''جیتے جی موت'' ایک Surrealistic وصف رکھتی ہے۔ بے آہنگی، ٹینشن اور تخیلاتی تخلیقات کے لیے طاقت جدید ذہن کی دیگر خوبیاں ہیں۔

جہاں تک موت کی فلسفیانہ اہمیت کا تعلق ہے تو اِس کا مطلب تحسین کے ساتھ ساتھ لاشیئیت بھی ہو سکتا ہے۔ یہ باعثِ کشش یا باعثِ مدافعت ہو سکتی ہے۔ صاحب ایمان شخص اِسے انسانی زندگی کے حتمی مقصد جان کر اِس میں دلچسپی لے گا۔ ایمان سے عاری شخص بھی اِس میں دلچسپی ظاہر کرے گا کیونکہ اُس کے لیے یہ تخلیق کی ناقابلِ توضیح پراسراریت کا جز ہے۔ جدید آرٹ میں یہ

متضاد رویے پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔

کوئی بھی فن پارہ آرٹسٹ کی شخصیت اور اُس کے گرد و پیش کا عکاس ہوتا ہے۔ موت کی تصویر کشی ہماری صدی کا کردار آشکار کرتی ہے، جبکہ فن پاروں میں موت کو پیش کرنے میں آرٹسٹ کی پیش کردہ فلسفیانہ اہمیت اُس کی انفرادی شخصیت کو ظاہر کرتی ہے۔

کارلا گوٹ لیب

✿

13
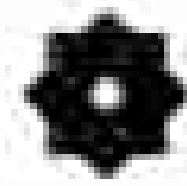
وجودیت اور موت

وجودیت کوئی مکتبۂ فکر نہیں بلکہ اُن متعدد فلسفیوں اور مصنفین کی تحریروں کی زمرہ بندی کے لیے استعمال کیا گیا ایک لیبل ہے جو چند ایک انتہائی تجربات کو فلسفیانہ سوچ کا بہترین نقطۂ آغاز تصور کرتے تھے۔ تحریک کے ممتاز ترین نمائندے کیرکیگارڈ نے ہیگل کے نظامِ فکر کو مسترد کیا اور "Fear and Trembling" (1843ء)، "The Concept of Anxiety" (1844ء) اور "The Sickness unto Death" (1849ء) کتابیں تحریر کیں۔ کوئی پون صدی بعد جیسپرز نے اپنی "Psychology of Weltanschauugen" (1919ء) کا ایک بڑا حصہ انتہائی صورت حالات کے لیے وقف کیا جن میں احساسِ جرم اور موت بھی شامل تھیں۔ لیکن اگر وجودیت کو محض انتہائی تجربات کی بجائے بالعموم موت سے منسلک کیا جاتا ہے تو اس کی وجہ ہیڈگر ہے جس نے اپنی "Being and Time" (1927ء) کا ایک 32 صفحات پر مشتمل باب موت پر بحث کے لیے لکھا۔ بعد میں سارتر نے اپنی "Being and Nothingness" (1943ء) میں موت کے موضوع پر بحث کی اور ہیڈگر کو تنقید کا نشانہ بنایا؛ البیر کامیو کی دو تصنیفات "The Myth of Sisyphus" (1942ء) اور "The Rebel" (1951ء) میں بالترتیب خودکشی اور قتل کو موضوع بنایا گیا۔

ہیڈگر نے ہی موت کو بحث کا مرکز بنایا تھا۔ لیکن جزواً اُس کے مخصوص انداز کی وجہ سے بحث اصل مظاہر کی بجائے اُس کی اصطلاحات پر ہی مرکوز رہی۔ چنانچہ وجودیت اور موت کی بحث کا

آغاز ہیڈگر سے ہی خیال کیا جانا چاہیے۔ اور سب سے پہلے اُس کے نکتۂ نظر پر کچھ توجہ دینے سے وجودیت پر کافی روشنی پڑے گی۔

1

ہیڈگر کی اہم تصنیف "Being and Time" کا آغاز چالیس صفحات پر محیط دیباچے اور اختتام "The Outline of the Treatise" پر ہوتا ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ کتاب کی دو جلدیں ہیں اور ہر جلد تین طویل حصوں پر مشتمل ہے۔ شائع شدہ تصنیف "نصف اول" میں پہلی جلد کے پہلے دو حصے شامل ہیں۔ "نصف دوم" کبھی بھی منظرِ عام پر نہ آیا۔

شائع ہونے والے دو حصوں میں سے پہلے کا عنوان "The preparatory fundamental analysis of Being-there" ہے۔ "Being-there" یا ہستی انسانی وجود کے لیے ہیڈگر کی اصطلاح ہے جو اُسے جانوروں اور دیگر اشیا سے الگ کرتی ہے۔ ہیڈگر کی دلچسپی کا اصل مرکز "وجود کا مفہوم" ہے۔ لیکن وہ پتا چلاتا ہے کہ یہ دلچسپی بذاتِ خود" کچھ ہستیوں (یعنی انسانوں) کے وجود کا وسیلہ ہے۔" اور وہ دیباچے میں دکھانے کی کوشش کرتا ہے کہ ہستی تک رسائی پانے کے لیے ہمیں چیزوں کا نہیں بلکہ ہستی کے طریقے کا مطالعہ کرنا چاہیے؛ اور ہمارے لیے سب سے واشگاف وسیلۂ وجود اپنی ہستی ہے۔ ہیڈگر نے اس کا ایک مظہریاتی تجزیہ کرنے کی تجویز دی۔ وہ یقیناً ایڈمنڈ ہسرل سے بہت زیادہ متاثر تھا۔

کیرکیگارڈ نے پیشہ ورانہ طریقوں کو مسترد کر کے انتہائی نوعیت کے تجربات پر توجہ مرکوز کی، اور نطشے نے احساسِ گناہ، ضمیر اور موت کے بارے میں اس طرح لکھا کہ جیسے وہ علمی مباحثوں سے بالکل نا آشنا ہو۔ موت کے بارے میں ہیڈگر کی بحث کو سمجھنے کے لیے اُس کی دو بنیادی اصطلاحات کو سمجھنا ضروری ہے۔ پہلی اصطلاح *Das Man* ہے۔ جرمن لفظ *man* انگریزی کے لفظ one یعنی کوئی کا ہم معنی ہے...... مثلاً کوئی ایسے نہیں کرتا (one does not do that)۔ اِسی لیے کبھی کبھی *Das Man* کا ترجمہ "لوگ" یا "عوام" بھی کیا گیا۔ دوسرا اہم تصور *Angst* ہے۔ *Angst* کو خوف سے بالکل الگ سمجھنا چاہیے جس کا مرکز اشیا ہوتی ہیں۔ یہ انگریزی لفظ "Anxiety" یا تشویش کا ہم معنی ہے۔

یہ درست ہے کہ انسان کبھی کبھی باعثِ خوف چیز کو بیان کرنے کی قابلیت کے بغیر تشویش

(Anxiety) کا تجربہ کرتے ہیں۔ فرائیڈ نے بھی تشویش اور خوف کے درمیان فرق کیا: ''تشویش کا تعلق حالت سے ہے اور یہ معروض کو نظر انداز کر دیتی ہے، جبکہ خوف براہِ راست معروض کے ساتھ منسلک ہوتا ہے۔''

موت پر ہیڈگر کی گفتگو زیادہ تر ٹالسٹائی کی ''ایوان الائچ کی موت'' کے اِردگرد گھومتی ہے۔ ''حتیٰ کہ موت کے بارے میں سوچنا بھی بزدلانہ خوف قرار دیا جاتا ہے.... آپ موت کی تشویش کو اُبھر کر سامنے آنے دینے کی ہمت نہیں رکھتے۔'' خوش اطواری ایوان کو خوف میں چیخنے چلانے نہیں دیتی۔ اُسے ہمیشہ یہی ظاہر کرنا ہے کہ وہ اچھا ہو جائے گا۔ لیکن انجام کار وہ خوش اطواری کو مسترد کر کے روتا اور چلاتا ہے۔ خودفریبانہ لاتعلقی کا خول اُتار پھینکنے پر ہی ایوان اپنے آپ میں واپس آتا اور محبت کرنے کی صلاحیت کا مالک بنتا ہے۔

تمام انسان ایوان الائچ جیسے نہیں ہوتے۔ مَیں خود اِس قطعی یقین کے ساتھ زندہ ہوں کہ ایک روز مجھے موت آ جائے گی۔ میرے دور میں (دوسری عالمی جنگ کے بعد) کروڑوں نوجوان لوگ اِس سوچ کے ساتھ زندگی گزارتے رہے۔ بہت سوں نے شادیاں کیں اور خود سے کہا: ''میرے پاس زیادہ وقت باقی نہیں، لیکن میں کم از کم ایک ہفتے یا چند دنوں تک ضرور زندہ رہنا چاہتا ہوں۔'' اور ہیڈگر والی نسل (وہ 1889ء میں پیدا ہوا) نے پہلی عالمی جنگ میں بالکل یہی تجربہ کیا تھا۔

1915ء میں فرائیڈ نے ''Timely Thoughts on War and Death'' کے زیرِعنوان دو مضامین لکھے۔ دوسرے مضمون کا ایک اقتباس میں یہاں دینا چاہوں گا۔

....جنگ نے موت کے ساتھ ہمارے سابقہ تعلق کو پریشان کر دیا ہے۔ یہ تعلق مخلصانہ نہیں تھا۔ اگر کوئی ہماری بات سنتا تو یقیناً ہم یہ اعلان کرنے کو تیار تھے کہ موت زندگی کا لازمی انجام ہے، کہ ہم میں سے ہر ایک کو مرنا ہے......یعنی موت فطری، ناگزیر اور ناقابلِ گریز ہے۔ تاہم، حقیقت میں ہم اِسے کچھ مختلف انداز میں لیتے تھے۔ ہم نے موت کو زندگی سے الگ کرنے کا رجحان ظاہر کیا۔ ہم نے موت کے متعلق خوف ناک خاموشی اختیار کرنے کی کوشش کی۔ آخر آپ کی اپنی موت تصور سے ماورا ہے، اور جب بھی کبھی ہم اِسے تصور کرنے کی کوشش کریں تو خود کو بطور تماشائی ہی دیکھ سکتے ہیں۔ گہرائی میں کوئی بھی شخص اپنی موت پر یقین نہیں رکھتا۔ ہر شخص لاشعور میں اپنی لافانیت کا یقین جمائے بیٹھا ہے۔ جہاں تک دوسروں کی موت کا تعلق ہے تو کوئی مہذب شخص کسی موت گرفتہ شخص

کے پاس بیٹھ کر اِس امکان کے متعلق بات کرنے سے گریز کرے گا۔ صرف بچے اِس اصول کو نظر انداز کرتے ہیں.....ہم ہمیشہ موت کی حادثاتی وجہ، بیماری، انفیکشن، بڑھاپے وغیرہ پر حد سے زیادہ زور دے کر موت کو ایک لازمی امر کی بجائے محض ایک حادثہ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم متوفی کی جانب بھی ایک خاص رویہ اختیار کرتے ہیں، کہ جیسے ہم اُسے کوئی نہایت مشکل کام کرنے پر سراہ رہے ہوں۔ ہم اُس پر تنقید ختم کر دیتے، اُس کی ناانصافیوں کو معاف کرتے اور جنازے و تدفین کے موقع پر نہایت اچھے کلمات کہتے ہیں؛ حالانکہ متوفی کو ان سب چیزوں کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ مگر ہم اُس کی خاطر سچائی کو بھی بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ ہم اُسے زندہ لوگوں سے بھی زیادہ اہمیت دینے لگتے ہیں۔

یہ نہایت سادہ اور بے تصنع تاثرات ہیڈگر کی فصیح اللسانی کے ہم پلہ نہیں ہو سکتے تھے۔

موت کے متعلق ہیڈگر کے خیالات نے آگے چل کر زیادہ صراحت اختیار کی: ''آگے آگے بھاگنا ہستی کا اپنی ذات میں ضم ہونا آشکار کرتا ہے۔ تاہم، موت کے لیے پرجوش آزادی تشویش اور پریشانی سے بھرپور بن جاتی ہے۔'' اپنی لازمی موت کی حقیقت کی قبولیت مجھے اپنے لیے دستیاب نہایت قلیل مدت کی یاد دلاتی ہے۔ اِس طرح یہ مجھے یہاں اور ابھی اِسی وقت اپنے وجود کو زیادہ سے زیادہ بامعنی بنانے پر اُبھارتی ہے۔ لیکن ہیڈگر اِس قسم کے سوالوں کو تحریک نہ دے سکا کہ ''کیا یہ لازمی ہے کہ اپنی موت کی پرعزم قبولیت کے ساتھ تشویش کا احساس بھی آئے؟''

ہیڈگر نے مسیحی مصنفین پر بہت زیادہ انحصار کیا: لیو ٹالسٹائی، کیرکیگارڈ، جیکب بوہمے اور شیلنگ۔ برازیل کے صدر Vargas کی جانب سے عوام کے نام اُس خط پر غور کریں جو اُس نے خودکشی سے پہلے لکھا تھا۔ اِس کا اختتام یوں ہوتا ہے:

'میں برازیل کو لوٹے جانے کے خلاف لڑا۔ میں نے لوگوں کو لوٹے جانے کے خلاف آواز اُٹھائی۔ میں سینہ تان کر جدوجہد کرتا رہا۔ نفرت، بدنامی اور مصیبتیں میرا جذبہ ماند نہ کر سکیں۔ میں نے تمہیں اپنی زندگی دے دی۔ اب میں اپنی موت پیش کرتا ہوں۔ کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ میں نہایت سکون کے ساتھ ابدیت کی شاہراہ پر پہلا قدم رکھ رہا ہوں اور زندگی کو چھوڑ کر تاریخ میں داخل ہو رہا ہوں۔

یا ''The Divine Wind'' میں شامل اُس خط پر غور کریں خودکش مشن کے لیے تربیت یافتہ جاپانی پائلٹ نے اپنے والدین کے نام لکھا تھا:

برائے مہربانی مجھے مبارک دیں۔ مجھے مرنے کا ایک شان دار موقع نصیب ہوا ہے..... میں چیری
کے درخت سے پھل کی طرح گروں گا.....آپ کا شکریہ کہ آپ نے تیس برس تک میرا خیال رکھا۔
مجھے اُمید ہے کہ میرا یہ کارنامہ کچھ حد تک آپ کے احسانات کا بدلہ چکا دے گا۔

یا ڈیوڈ ہیوم کی قطعی بے تشویش حالت پر غور کریں جس نے اُس کے عیسائی "دوستوں" کو بہت ناراض کیا جنہیں پوری امید تھی کہ وہ بستر مرگ پر کفر سے تائب ہو جائے گا۔ سقراط نے بڑی طمانیت کے ساتھ موت کا سامنا کیا۔ سقراط کے مداح رواقی اولیاً عمر کی نویں دہائی میں پہنچ کر پرسکون انداز میں خودکشی کیا کرتے تھے۔

1920ء کی دہائی میں خوف زدہ محسوس کرنے کا اعتراف فیشن ایبل بن گیا تھا۔ Remarque کی "All Quiet on the Western Front" (1929ء) میں صاف نظر آتا ہے کہ یہ نئی ایمان داری عسکریت کے خلاف تھی۔ آرنلڈ زویگ کے عظیم ناول میں سارجنٹ گریشا کو جب گولی لگی تو اُس کی آنتوں میں سے فضلہ باہر گرا۔ تمیز کو بالائے طاق رکھ کر یہ تسلیم کرنے کے لیے کچھ ہمت درکار تھی کہ کچھ آدمی موت کو سامنے دیکھ کر ڈر جاتے ہیں اور کچھ آدمیوں کو گولی لگنے پر اُن کا پیشاب نکل جاتا ہے۔ ہیڈگر نے اِس قسم کے مشاہدات کو ہستی کے متعلق عمومی سچائیوں کے طور پر استعمال کیا۔ اُس پر کوئی اعتراض نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اُس نے سب کچھ نہایت الجھی ہوئی اور پیچیدہ زبان میں کہا جسے پڑھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

2

سارتر نے "Being and Nothingness" میں موت پر بحث میں ہیڈگر پر ایک اہم تنقید پیش کی۔ ہیڈگر نے کہا کہ اپنی موت کے آگے آگے بھاگنا مجھے اپنی انتہائی ذات، اپنی معتبر ہستی تک لیجا سکتا ہے کیونکہ "مرنا ایک ایسی چیز ہے جو کوئی شخص کسی اور کے لیے نہیں کر سکتا۔..... مرنا دکھاتا ہے کہ موت وجودیاتی اعتبار سے ہمیشہ اپنا پن اور ہستی رکھتی ہے۔" کوئی بھی شخص میرے لیے سانس لینے یا سونے یا محبت کرنے کے قابل نہیں۔ اپنا کیا ہوا ہر تجربہ ایک ایسی چیز ہے جو کوئی شخص میرے لیے نہیں کر سکتا۔ میں اپنی بہت سی زندگی غیر معتبریت میں گزار سکتا ہوں جس میں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مَیں خود فلاں فلاں کام کر رہا ہوں یا نہیں؛ لیکن اِس انداز میں اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ گولی کسی اور کو لگی ہے یا مجھے، کہ میں خود مرا ہوں یا کوئی اور۔ لیکن اگر

میں ایسا انداز اختیار کروں جو دنیا کی جانب میرا رویہ بدل دے تو تب میں کسی مخصوص عورت سے محبت کرنے، یہ کتا . لکھنے، دیکھنے، سننے، محسوس کرنے کی جانب یہ رویہ اختیار کر سکتا ہوں۔ موت کی جانب بھی میرا رویہ یہی ہوگا۔ جیسا کہ سارتر نے کہا: "المختصر کوئی ایسا نجی وصف موجود نہیں جو میری موت کو خصوصی بنا دے۔ اس کے برعکس یہ موت تبھی میری بنتی ہے جب میں پہلے سے خود کو موضوعیت کے تناظر میں رکھ چکا ہوں۔"

ہیڈگر کے "ہستی بجانب موت" کے سارے تصور پر سارتر نے تنقید کی۔ اگرچہ ہم اپنی لازمی موت کا قیاس کر سکتے ہیں، مگر یہ ہرگز نہیں جان سکتے کہ ہم کب مریں گے؛ لیکن موت کا وقت ہی آپ کی زندگی کے مفہوم پر تمام فرق ڈالتا ہے۔

درحقیقت عین ممکن ہے کہ ہم اپنا کام پورا کرنے سے پہلے ہی مر جائیں۔ اور اگر صرف اتفاق ہی
ہماری موت اور نتیجتاً ہماری زندگی کا کردار متعین کرتی ہے تو پھر موت کا انتظار نہیں کیا جا سکتا۔

سارتر کے خیال میں خودکشی کوئی حل نہیں۔ اس کا مفہوم مستقبل پر منحصر ہے۔ "اگر فائز مس ہو گیا تو کیا میں بعد میں خودکشی کو اپنی بزدلی سے تعبیر نہیں کروں گا؟..... خودکشی ایک لغویت ہے جو میری زندگی کو لغویت میں ڈبو دیتی ہے۔"

سارتر نے موت کی جانب انسانی رویے پر اپنے کچھ ڈراموں اور افسانے "دیوار" میں بحث کی۔ لیکن یہاں ہم اُس کے ڈراموں اور افسانوں پر بات کرنے سے قاصر ہیں۔ اوپر دیے گئے خیالات کی قدر افزائی سے پہلے آیئے البیر کامیو کے خیالات پر غور کرتے ہیں۔

3

اگرچہ سارتر کی نسبت کامیو کی سیاست نوبیل پرائز کمیٹی کے لیے زیادہ قابل قبول تھی، لیکن ہنری Peyre کا یہ کہنا یقیناً درست تھا کہ "The Myth of Sisyphus" اور "The Rebel" نہ صرف متضاد بلکہ کنفیوژڈ اور غالباً کھوکھلے اور ناپختہ بھی ہیں۔ کامیو سسی فس کی اسطورہ کا آغاز یوں کرتا ہے: "صرف ایک حقیقی معنوں میں سنجیدہ فلسفیانہ مسئلہ ہے، اور وہ مسئلہ خودکشی ہے۔" جلد ہی ہمیں بتایا جاتا ہے کہ دنیا "لغو" (Absurd) ہے۔ کچھ ہی آگے چل کر وہ کہتا ہے: "میں نے کہا تھا کہ دنیا لغو ہے، لیکن تب میں نے عجلت بازی سے کام لیا تھا۔ یہ دنیا اپنے آپ میں معقول نہیں، اور بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اصل لغویت اس غیر استدلالی پن سے سامنا کرنے اور صراحت کی

بے تاب کوششوں میں ہے۔ لغویت کا منبع دنیا کے ساتھ ساتھ انسان بھی ہے۔" یہ الفاظ دیگر چیزوں کے متعلق صراحت حاصل کرنے اور اُن کی وضاحت کرنے کی کوشش ہی حقیقی لغویت ہے۔ لغو انسان کے بارے میں کامیو کا کہنا ہے: "دیوانگی اور موت اُس کے ناقابل اصلاح رجحانات ہیں۔"

موت کی جانب انسانی رویوں کی زیادہ بہتر تفہیم کے خواہش مند لوگ وجودیت پسندانہ فلسفیانہ موشگافیوں کی نسبت سارتر اور کامیو کے فکشن کی بدولت زیادہ کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ہیڈگر اور مقلدین کی شان دار اور پیچیدہ اصطلاحات نے متعدد اہم امتیازات کی جانب سے توجہ ہٹا دی۔ میں اُن میں سے چار کا ذکر کروں گا:

اول، دنیا کے بڑے مذاہب نے موت کی جانب مختلف رجحانات کو فروغ دیا۔ اگرچہ کچھ ابتدائی عیسائی شہدأ نے ابدی رحمت حاصل کرنے کے شوق میں بے خوف وخطر جان کی بازی لگائی، لیکن عیسائیت نے بہ حیثیت مجموعی انسانوں کو موت سے ڈرا کر ہی اپنی دھاک بٹھائی۔ گوتم بدھ کا رویہ بالکل مختلف تھا: نروان کا تجربہ کرنے کے بعد وہ تمام ذہنی تشویش اور اُلجھن سے ماورا ہو گیا، اور اُس کی موت کی کہانیاں مسیح کی دہشت ناک موت کی کہانیوں کا ایک اینٹی تھیسس پیش کرتی ہیں۔

دوم، ہمیں یہ سوال کرنا چاہیے کہ قوائیت موت کی جانب رویے پر کس حد تک اثر انداز ہوتی ہے؛ لیکن وجودیت پسندوں نے مریضوں اور فوجیوں کے درمیان فرق نہیں کیا۔ اِس نکتۂ نظر سے مالراکس کا ناول "La Condition Humaine" ہیڈگر کی نسبت کہیں زیادہ دلچسپ ہے۔ بالخصوص اِس کے آخری حصے میں موت کی جانب مختلف رویوں کا ہی مطالعہ کیا گیا ہے۔

سوم، آپ کو یہ سوال کرنا چاہیے کہ موت کی جانب رویے اِس یقین دہانی کے باعث کس حد تک تبدیل ہوں گے کہ ہم سب کے مرنے پر دنیا ختم ہو جائے گی...... کہ کچھ بھی ایسا باقی نہیں رہے گا جس سے محروم ہونے پر ہم دکھی ہوں۔

چہارم، ایک بھی وجودیت پسند نے موت کا سامنا کرنے کے انداز میں فرق ڈالنے والے ایک بھی اہم امتیاز کو سمجھا نہیں۔ نٹشے نے "The Gay Science" میں کہا:

ایک چیز کی ضرورت ہے: کہ ایک انسان اپنے آپ میں مطمئن ہو...... چاہے یہ اطمینان شاعری یا پھر آرٹ کے ذریعہ سے حاصل ہو، تبھی کوئی انسان قابل دید بنتا ہے۔ اپنے آپ سے غیر مطمئن کوئی

بھی شخص اپنے آپ سے اس کا بدلہ لینے کو تیار رہتا ہے؛ ہم دوسرے لوگ اُس کا شکار بنتے ہیں۔ کسی شخص کی بدصورتی دوسروں کو ہمیشہ اُداس اور خفا کرتی ہے۔

لیکن جو شخص اپنی زندگی کا کوئی مصرف ڈھونڈ لے وہ بلا تشویش موت کا سامنا کر سکتا ہے: "میں نے ایک بار دیوتاؤں جیسی زندگی گزاری اور مزید کسی چیز کا حاجت مند نہیں۔"

والٹر کوف مین

حصہ چہارم

تاثرات
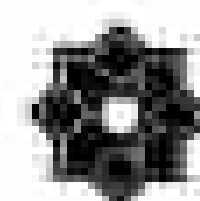
14

ایک سائنس دان کی موت

میں اب تک چھ مرتبہ موت کو اپنے رُوبرو دیکھ چکا ہوں۔ اور چھ مرتبہ موت نے اپنی نظر پھیر کر مجھے زندہ چھوڑ دیا۔ یقیناً انجامِ کار موت مجھے آئے گی...... جیسا کہ وہ ہم سب کے ساتھ کرتی ہے۔ سوال صرف کب اور کیسے کا ہے۔

میں نے مخالفتوں اور اختلاف رائے سے بہت کچھ سیکھا ہے...... بالخصوص خوب صورتی اور زندگی کی میٹھی تکلیف دہی کے بارے میں، دوستوں اور اہل خانہ کی انمول حیثیت کے بارے میں، اور محبت کی تخلیقی قوت کے بارے میں۔ درحقیقت مرنا ایک طرح سے مثبت، کردار ساز تجربہ ہے جسے میں ہر ایک کے لیے تجویز کروں گا۔ بلاشبہ اِس میں خطرہ کافی زیادہ ہے۔

میں اِس یقین کا دلدادہ ہوں کہ مرنے کے بعد میں دوبارہ زندہ ہوں گا، کہ میری ہستی کا کوئی سوچنے، محسوس کرنے اور یاد رکھنے والا حصہ جاری وساری رہے گا۔ لیکن میں اِس چیز پر جتنا زیادہ یقین کرنا چاہتا ہوں، اور دنیا بھر کی تہذیبوں میں حیات بعد از موت کا عقیدہ موجود ہونے کے باوجود، مجھے کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی جو اِس سوچ کو حقیقی یا منطقی ظاہر کرے۔

میں اپنی پیاری بیوی اینی (Annie) کے ساتھ بڑھاپے کی عمر تک زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ میں اپنے بچوں کو پھلتا پھولتا دیکھنا اور اُن کی شخصیت سازی اور عقلی ترقی میں کردار ادا کرنا چاہتا ہوں۔ میں ان پوتوں پڑپوتوں کو دیکھنا چاہتا ہوں جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے۔ کچھ ایسے سائنسی مسائل

ہیں جن کے نتائج دیکھنے کی مجھے خواہش ہے...... مثلاً ہمارے نظامِ شمسی میں دیگر دنیاؤں کی کھوج اور دوسری جگہوں پر زندگی کی تلاش۔ مجھے یہ جاننے کی تمنا ہے کہ انسانی تاریخ میں نمایاں رجحانات کیسے کارکردگی دکھاتے ہیں: مثلاً ہماری ٹیکنالوجی کے خطرات اور فائدے؛ عورتوں کی آزادی؛ چین کی بڑھتی ہوئی سیاسی، معاشی اور ٹیکنالوجیکل رفعت؛ بین الکواکب پرواز۔

اگر موت کے بعد زندگی ہوتی تو میں مرتے وقت اِن عمیق تجسسات اور خواہشات کے حوالے سے پرسکون ہوسکتا تھا۔ لیکن اگر موت محض ایک غیر مختتم بے خواب نیند سے زیادہ کچھ نہیں تو یہ ایک بے بس امید ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ تناظر مجھے مزید زندہ رہنے کے لیے تھوڑی سی اور تحریک دیتا۔

دنیا اِس قدر پرکشش ہے، یہ اِس قدر محبت اور اخلاقی گہرائی رکھتی ہے کہ چھوٹی موٹی، غیر مسلم الثبوت کہانیوں سے دھوکا کھانے کی کوئی وجہ نہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اِس کی بجائے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا اور ہر روز زندگی کی فراہم کردہ مختصر مگر دل کش مہلت کا شکر ادا کرنا کہیں بہتر ہوگا۔

اپنے شیونگ والے آئینے کے قریب کئی سالوں سے میں نے ایک فریم کیا ہوا پوسٹ کارڈ لگا رکھا ہے (لہٰذا میں روزانہ صبح اُسے دیکھتا ہوں)۔ اِس کی پچھلی جانب Swansea Valley، ویلز کے کسی مسٹر جیمز ڈے کا پنسل سے لکھا ہوا پیغام موجود ہے:

Dear Friend,
Just a line to show that I am alive & kicking and going grand. It's a treat.

Your's
WJR

اِس پر کیے ہوئے کسی ولیم جان راجرز نامی شخص کے دستخط تقریباً ناقابلِ فہم ہیں۔ کارڈ کی سامنے والی طرف ایک سٹیمر کی تصویر ہے جس کے نیچے لکھا ہے: "White Star Liner Titanic."۔ ڈاک خانے کی مہر اِس قوی الجثہ جہاز کے غرق ہونے سے ایک دن پہلے کی ہے۔ اِس واقعہ میں مسٹر راجرز سمیت 1,500 افراد کی جانیں تلف ہوئیں۔ اینی اور میں نے یہ پوسٹ کارڈ

ایک خاص وجہ سے وہاں لگایا۔ ہمیں معلوم ہے کہ "بوڑھا ہونا" (Going grand) نہایت عارضی اور سرابی نوعیت کی حالت ہوسکتی ہے۔ ہم خود بھی اِسی حالت میں تھے۔

ہماری صحت بظاہر بالکل ٹھیک تھی، بچے پھل پھول رہے تھے۔ ہم کتابیں لکھتے۔ ٹیلی ویژن کے اور فلمی پروگرام بناتے، لیکچرز دیتے، اور میں نہایت پرجوش انداز میں سائنسی تحقیق میں مصروف رہتا۔

1994ء کی ایک رات کو میری بیوی اَینی پوسٹ کارڈ کے قریب کھڑی تھی کہ اُس نے میری بازو پر ایک بدنما سا نیلا۔ کالا دھبہ دیکھا جو کئی ہفتوں سے وہاں موجود تھا۔ اینی نے پوچھا: "یہ ابھی تک ختم کیوں نہیں ہوا؟" چنانچہ میں اُس کے اصرار کرنے پر نہ چاہتے ہوئے بھی ڈاکٹر کے پاس گیا تاکہ اپنے معمول کے خون کے ٹیسٹ کرواسکوں۔

کچھ ہفتے بعد ہم آسٹن، ٹیکساس میں تھے کہ ڈاکٹر نے ہمیں پریشانی کے ساتھ بتایا کہ شاید خون کے نمونوں میں کوئی گڑبڑ ہوگئی تھی اور مجھے فوراً ہی دوبارہ ٹیسٹ کروانے کا مشورہ دیا۔ رپورٹ کے مطابق وہ کسی نہایت بیمار شخص کا خون تھا۔ میں نے دوبارہ ٹیسٹ کروائے مگر پہلے والی رپورٹ کی تصدیق ہوگئی۔

میرے خون کے سرخ سیل (جو آکسیجن کو سارے جسم میں لیجاتے ہیں) سفید سیل (جو بیماری سے لڑتے ہیں) دونوں میں ہی کافی کمی آگئی تھی۔ ممکن ترین وضاحت یہ تھی: کہ میرے Stem سیلوں میں کوئی مسئلہ تھا جو ہڈیوں کے گودے میں پیدا ہوتے ہیں اور انہی سے خون کے سرخ اور سفید سیل جنم لیتے ہیں۔ ماہرین نے تشخیص کی توثیق کردی۔ میں نے خود کو لاحق بیماری کا نام پہلے کبھی نہیں سنا تھا: Myelodysplasia۔ اِس کا بیماری کا سبب تقریباً نامعلوم ہے۔ میں یہ سن کر حیران رہ گیا کہ اگر میں نے کچھ نہ کیا تو میرے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں اب بھی خود کو بالکل ٹھیک محسوس کررہا تھا۔ میں مستعد اور ذہنی سرگرمیوں میں صحت مند تھا۔ اپنی موت سے اِس قدر قریب ہونے کی بات مجھے ایک فضول سا لطیفہ معلوم ہوتی تھی۔

میری بیماری کے تدارک کا صرف اور صرف ایک طریقہ معلوم تھا: ہڈیوں کے گودے کا ٹرانس پلانٹ۔ لیکن یہ صرف ممکن تھا جب کوئی شخص مجھے اپنی ہڈیوں کا گودا بطور عطیہ دینے پر تیار ہو جائے۔ اگر ایسا ہو جاتا تب بھی میرے مدافعتی نظام کو مکمل طور پر ختم کرنا ضروری تھا تاکہ میرا جسم

عطیہ دینے والے کی ہڈیوں کے گودے کو مسترد نہ کردے۔ تاہم، مکمل طور پر ختم کیا ہوا مدافعتی نظام مجھے اور بھی متعدد طریقوں سے ہلاک کر سکتا تھا۔ مثلاً اس صورت میں میرے اندر بیماری سے لڑنے کی صلاحیت نہ رہتی اور میں کسی قریب سے گزرتے ہوئے جرثومے کا شکار بن جاتا۔ المختصر، میں نے کچھ بھی نہ کرنے کا سوچا اور طبی تحقیق میں کوئی نیا علاج ڈھونڈے جانے کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن یہ امید نہ ہونے کے برابر تھی۔

ہماری تحقیق کے تمام راستے "فریڈ ہچنسن کینسر ریسرچ سنٹر،" سیاٹل تک جاتے تھے۔ یہ دنیا میں ہڈیوں کے گودے کا ٹرانس پلانٹ کرنے والے اولین اداروں میں سے ایک تھا۔ یہاں کے ڈاکٹروں اور نرسوں کی اعلیٰ قابلیت اور زبردست دیکھ بھال کی سہولیات ہی نے ہمیں یہاں سے علاج کروانے پر مائل کیا۔

پہلا مرحلہ یہ دیکھنے کا تھا کہ کیا کوئی سازگار عطیہ دہندہ مل پاتا ہے یا نہیں۔ کچھ لوگوں کو ایسا شخص ڈھونڈنے میں ناکامی ہوئی تھی۔ اینی اور میں نے اپنی واحد عزیزہ کو بلایا...... میری چھوٹی بہن کیری (Cari)۔ میں نے بڑے گول مول انداز میں بات کی۔ کیری کو تو میری بیماری کا علم تک نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اصل مدعا بیان کرتا، کیری نے کہا: "ٹھیک ہے، سب کچھ تمہارا ہے۔ جگر..... پھیپھڑا..... جو بھی چاہے لے لو۔" آج بھی کیری کی فیاضی کے بارے میں سوچ کر میرے حلق میں کچھ پھنس جاتا ہے۔ مگر بلاشبہ اس بارے میں کوئی گارنٹی نہ تھی کہ اُس کی ہڈیوں کا گودا میرے موافق ہوگا۔ اُس کے متعدد ٹیسٹ لیے گئے، اور تطابق کے چھ کے چھ معیار موزوں نکلے۔ وہ میرے لیے نہایت سازگار تھی۔ میں حیرت انگیز حد تک خوش قسمت تھا۔

البتہ "خوش قسمت" ایک تقابلی اصطلاح ہے۔ بہترین حالات میسر آجانے کے باوجود میرا علاج کامیاب ہونے کا امکان 30 فیصد سے زیادہ نہیں تھا۔ لیکن میرے پاس اور کوئی صورت نہ تھی۔

اینی کے والدین سمیت ہمارا سارا خاندان سیاٹل منتقل ہو گیا۔ ہسپتال میں، اور بعد ازاں صحت یابی کے دوران ہمیں مسلسل لوگ ملنے آتے رہے...... جوان بچے، میرا پوتا، دیگر عزیز واقارب۔ مجھے یقین ہے کہ ان لوگوں اور بالخصوص اینی کی محبت نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔

جیسا کہ آپ اندازہ کر سکتے ہیں، بہت سے ڈراؤنے پہلو بھی تھے۔ مجھے یاد ہے کہ طبی

ہدایات کے مطابق ایک رات کو میں 2 بجے بیدار ہوا اور Busulfan ٹیبلٹس کے 12 پلاسٹک بیگز میں سے ایک کو کھولا۔ Busulfan ایک نہایت طاقت ور کیموتھراپیک ایجنٹ ہے۔ بیگ پر لکھا تھا:

CHEMOTHERAPY DRUG
BIOHAZARD BIOHAZARD
TOXIC
Dispose of as BIOHAZARD

میں نے یکے بعد دیگر تمام 72 گولیاں اپنے حلق میں انڈیل لیں۔ یہ مقدار مہلک تھی۔ اگر تھوڑی دیر بعد ہی میرا ہڈیوں کا گودا ٹرانس پلانٹ نہ ہونا ہوتا تو یہ تدارکی اقدام ہی مجھے مار ڈالتا۔ یہ آرسینک یا سایانائیڈ کی مہلک خوراک لینے اور یہ امید رکھنے والی بات تھی کہ بروقت درست نسخہ مل جائے گا۔

میرے مدافعتی نظام کو زیر کرنے والی ادویات کے کچھ براہ راست اثرات تھے۔ میں متواتر متلاہٹ کی حالت میں تھا، لیکن دوسری ادویات نے اس پر قابو پایا اور یہ اتنی بری نہیں تھی کہ میں کچھ کام نہ کر پاتا۔ میرے تقریباً سبھی بال گر گئے اور میں دیکھنے میں مردہ سا لگتا تھا۔ لیکن اُس وقت میں مسکرا اُٹھا جب میرے چار سالہ بیٹے سام نے مجھے دیکھ کر کہا: "ڈیڈ، زبردست ہیئر سٹائل۔ مجھے آپ کے بیمار ہونے کے بارے میں تو کچھ نہیں پتہ۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ آپ اب صحت مند ہو رہے ہیں۔"

اس علاج کے اختتام پر میرے جسم نں مو۔ خون کے زیادہ تر سرخ اور سفید سیل کیری کے تھے۔ یہ بالکل انتقالِ خون جیسا عمل تھا۔ میری ،ہن کی ہڈیوں کے گودے کے سیل میری ہڈیوں کے گودے میں جگہ تلاش کر رہے تھے۔ علاج کے کچھ پہلو واقعی نہایت دردانگیز تھے، لیکن جب درد کا دور بیت جائے تو وہ آپ کو یاد بھی نہیں رہتی۔

علاج ختم ہونے پر میرے جسم میں زیادہ تر سرخ اور سفید سیل کیری والے تھے۔ سیکس کروموسومز XX جبکہ میرے جسم کے باقی تمام کروموسومز XY تھے۔ میرے جسم میں نسوانی سیل اور platelets گردش کر رہے تھے۔ میں انتظار میں تھا کہ کیری کی کچھ دلچسپیاں میرے اندر کب پیدا ہوتی ہیں...... مثلاً گھوڑ سواری کا شوق، یا درجن بھر ڈرامے دیکھنا...... لیکن ایسا کبھی نہ ہوا۔

اینی اور کیری نے میری زندگی بچالی۔ میں ان کی محبت اور لگن کا ہمیشہ شکر گزار رہوں گا۔

ہسپتال سے فارغ ہونے کے بعد مجھے ہر قسم کی طبی دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔ دن میں کئی بار مجھے دوا کھلانا ضروری تھا (حلق میں ڈالی ہوئی ایک نالی کے ذریعہ)۔ اینی نے مرکزی ذمہ داری سنبھالی...... کپڑے بدلنا، بہتری کی علامات پر نظر رکھنا اور جذباتی و طبعی مدد فراہم کرنا۔

طبی تحقیق نے مجھے کچھ مہلت دلا دی۔ اس کے علاوہ کارنیل یونیورسٹی اور ''رائٹرز گلڈ آف امیریکا'' کی جانب سے ملنے والی طبی امداد نے بھی موت کو مجھ سے دور کیا۔ امریکہ میں لاکھوں کروڑوں لوگ اس قسم کی امداد سے محروم ہیں۔ اگر اُن کے اوپر کوئی ایسا وقت آیا تو وہ کیا کریں گے؟

اپنی تحریروں میں مَیں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ہم کس حد تک قریبی طور پر دیگر جانوروں کے ساتھ منسلک ہیں، اُنہیں تکلیف دینا کتنا ظالمانہ فعل ہے اور لپ سٹک وغیرہ بنانے کی خاطر اُن کو ذبح کرنا کس حد تک اخلاقی دیوالہ پن کی علامت ہے۔ پھر بھی جیسا کہ ڈاکٹر تھامس نے اپنے نوبیل انعام کے لیکچر میں کہا، ''ہڈیوں کے گودے کی پیوندکاری پر تحقیق جانوروں پر تحقیق کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی تھی۔'' اس حوالے سے میں کافی اختلافِ رائے کا شکار ہوں۔ اگر جانوروں پر تحقیق نہ کی گئی ہوتی تو آج میں زندہ نہ ہوتا۔

سو زندگی معمول پر واپس آ گئی۔ میں، اینی اور میرے گھر والے واپس اِتھاکا، نیویارک آ گئے جہاں ہم رہا کرتے تھے۔ میں نے متعدد تحقیقی پراجیکٹس مکمل کیے اور ''توہمات کی دنیا'' کتاب کی پروف ریڈنگ کی۔ ہماری ملاقات Bob Zemeckis سے ہوئی جس نے میرے ناول کی بنیاد پر بنائی گئی فلم "Contact" کو ڈائریکٹ کیا تھا۔ میں نے اور اینی نے مل کر فلم کا سکرپٹ لکھا۔ ہم نے ٹیلی ویژن اور فلموں کے لیے کچھ نئے پراجیکٹس کے لیے بھی بات چیت کی۔ میں نے ''گلیلیو'' خلائی تحقیقاتی مشن کی سیارہ مشتری کی جانب روانگی کے ابتدائی مراحل میں حصہ لیا۔

لیکن اگر میں نے کوئی سبق سیکھا تو وہ یہ تھا کہ مستقبل کی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔ جیسا کہ ولیم جان راجرز نے پوسٹ کارڈ پر اپنے دستخط کرتے ہوئے دریافت کیا تھا کہ آنے والے دنوں کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ میں کئی ماہ تک گھر پر رہا۔ میرے بال دوبارہ اُگ آئے، وزن ٹھیک ہو گیا، خون کے سرخ اور سفید سیلوں کی تعداد دوبارہ نارمل ہو گئی اور میں بالکل صحت مند محسوس کر رہا تھا۔ پھر خون کا ایک اور ٹیسٹ ہوا اور میرے غبارے میں سے ساری ہوا نکل گئی۔

ڈاکٹر نے مجھ سے کہا: ''مجھے ڈر ہے کہ میرے پاس تمہارے لیے ایک بری خبر ہے۔'' میری

ہڈیوں کے گودے میں خطرناک، تیزی سے بڑھتے ہوئے سیلوں کی نشوونما کی علامات دوبارہ ظاہر ہونے لگی تھیں۔ دو دن کے اندر اندر سارا خاندان دوبارہ سیاٹل میں تھا۔ میں یہ صفحات ہچنسن سنٹر میں اپنے بیڈ پر بیٹھا ہوا لکھ رہا ہوں۔ ایک نئے تحقیقاتی طریقے سے یہ تعین کیا گیا کہ ان سیلوں میں ایک اینزائم کا فقدان تھا جو انہیں دو سٹینڈرڈ کیموتھراپک ایجنٹس سے محفوظ رکھتا۔ قبل ازیں مجھے یہ کیمیکلز نہیں دیے گئے تھے۔ ان ایجنٹس کے پہلے راؤنڈ کے بعد میری ہڈیوں کے گودے میں کوئی خلافِ معمول سیلز نہ ملے۔ انہیں قابو میں رکھنے کے لیے مجھے کیموتھراپی کے مزید دو راؤنڈز سے گزرنا تھا...... اور اس کام کے لیے میری بہن کے کچھ مزید سیلز درکار تھے۔ میں ایک بار پھر مکمل صحت یاب ہو گیا۔

"National Marrow Donor Program" کی رجسٹری میں 20 لاکھ سے زائد امریکیوں کے نام درج ہیں جو کسی انجانے شخص کی خاطر اپنی ہڈیوں کا گودا دان کرنے کو تیار ہیں۔ لاکھوں لوگ امریکی ریڈ کراس اور دیگر اداروں کو کسی مالی کشش کے بغیر خون کا عطیہ دیتے ہیں تاکہ کسی نامعلوم زندگی کو بچا سکیں۔

سائنس دان اور ٹیکنیشنز سال ہا سال محنت کرتے ہیں (اور عموماً بہت کم تنخواہوں پر) اور انہیں اپنی کامیابی کی کوئی ضمانت بھی نہیں ہوتی۔ ان کے کام کرنے کے عمل میں ایک تحریک دوسروں کی مدد کرنا، بیماریوں کا تدارک کرنا اور موت کو دور بھگانا بھی ہے۔ جب بہت زیادہ تنگی پن ہمارے لیے خطرہ بن جاتا ہے تو نیکی کے غالب پن کو یاد کرنا باعث مسرت ہوتا ہے۔

نیویارک سٹی کے سینٹ جان دی ڈیوائن گرجا گھر میں ایسٹر کی تقریب کے موقع پر میرے لیے پانچ ہزار افراد نے دعا کی۔ ایک ہندو پروہت نے دریائے گنگا کے کناروں پر میرے لیے خصوصی عبادت کروائی۔ شمالی امریکہ کے امام نے مجھے بتایا کہ وہ میری صحت یابی کے لیے دعاگو ہے۔ بہت سے عیسائیوں اور یہودیوں نے بھی اپنے خطوط میں اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا۔ اگرچہ میں ایسا نہیں سوچتا کہ اگر کوئی دیوتا یا خدا موجود ہے تو یہ دعائیں میرے لیے اُس کے ارادوں کو بدل دیں گی، مگر میں ان لوگوں کا تہہ دل سے مشکور ہوں جنہوں نے مجھے یاد رکھا۔

بہت سے لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ حیات بعد از موت پر یقین کے بغیر موت کا سامنا کرنا کیسے ممکن ہے۔ میں بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ کافی مشکل ثابت ہوا۔ میں ''کمزور روحوں'' کے

متعلق تحفظات کے حوالے سے اپنے ایک ہیرو، البرٹ آئن سٹائن کا ہم خیال ہوں:

> میں کسی ایسے دیوتا کا تصور نہیں کر سکتا جو اپنی مخلوق کو انعام یا سزا دیتا ہے یا اُس جیسا کوئی ارادہ رکھتا ہے جس کا ہم اپنے اندر تجربہ کرتے ہیں۔ میں کسی ایسے شخص کا تصور نہیں کر سکتا اور نہ ہی کرنا چاہتا ہوں کہ جو اپنی طبعی موت سے بچ گیا ہو؛ کمزور روحیں خوف کے عالم میں چاہے ایسی سوچیں سوچتی رہیں۔ میں زندگی کی ابدیت کے راز پر مطمئن ہوں اور موجودہ دنیا کے شاندار خدوخال کی ایک جھلک پر ہی قانع ہوں.....

پس تحریر

ایک سال قبل یہ باب لکھنے کے بعد کافی کچھ واقع ہوا۔ میں نے ہچنسن سنٹر سے چھٹی پائی، واپس اِتھاکا آیا، لیکن چند ماہ بعد ہی بیماری دوبارہ اپنا اثر دکھانے لگی۔ اس مرتبہ یہ زیادہ زوردار تھی...... شاید اس لیے کہ سابقہ علاج کی وجہ سے میرا جسم کافی کمزور ہو چکا تھا۔ گھر والے ایک بار پھر میرے ساتھ سیاٹل پہنچے۔ ایک بار پھر مجھے وہی پر محبت دیکھ بھال اور علاج کی سہولیات میسر آئیں۔ ایک مرتبہ پھر انہی نے میرا حوصلہ بلند رکھا۔ ایک مرتبہ پھر میری بہن نے بلا پس و پیش اپنی ہڈیوں کا گودا مہیا کیا۔ ایک مرتبہ پھر نیک لوگوں نے مجھے گھیرے میں لیے رکھا۔ یہ الفاظ لکھتے وقت میرے جسم میں تمام سیلز میری بہن کے نسوانی سیل (XX) ہی ہیں۔ میرا اپنا ایک بھی مذکر (XY) سیل میرے جسم میں موجود نہیں۔ لوگ اپنے چند اصل سیلز کے ساتھ بھی کئی کئی سال زندہ رہ لیتے ہیں۔ مجھے اس کا یقین تبھی آئے گا جب میں مزید ایک دو سال زندہ رہ لوں گا۔ تب تک میں صرف امید ہی کر سکتا ہوں۔

سیاٹل، واشنگٹن
اِتھاکا، نیویارک
اکتوبر 1996ء۔

دل خراش ابہام کے سامنے اس مخصوص رجائیت پسندی کے ساتھ کارل سیگاں نے یہ آخری صفحات لکھتے وقت بھی بقیہ کتاب کا اچھوتا پن قائم رکھا۔ چند ہی ہفتوں بعد، دسمبر میں وہ ہمارے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھا اور اپنے پسندیدہ کھانے کو کچھ حواس باختگی کے عالم میں دیکھا۔ ہمارے

درمیان نظروں کا تبادلہ ہوا۔ میں نے فوراً ہی اس مفروضے کا تانا بانا بننا شروع کر دیا کہ بھوک نہ ہونے کا اُس کی بیماری کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ کبھی کبھی کوئی صحت مند شخص بھی تو کھانے سے رغبت نہیں رکھتا۔ کارل نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ دے کر کہا: "ہو سکتا ہے۔" لیکن تب کے بعد اُسے زبردستی کھانا کھانا پڑا اور بھوک کی خواہش دن بدن خراب سے خراب تر ہوتی گئی۔ اس کے باوجود اُس نے دو لیکچر دیے۔ دوسرے لیکچر سے واپسی کے بعد ہوٹل میں پہنچ کر وہ بالکل نڈھال تھا۔ اُس نے سیاٹل کال کی۔

ڈاکٹروں نے زور دیا کہ ہم فوراً ہچنسن سنٹر میں آ جائیں۔ میں نے سام اور ساشا کو بتایا کہ ہم وعدے کے مطابق اگلے روز گھر واپس آنے کی بجائے چوتھی بار سیاٹل جا رہے ہیں۔ بچے دم بخود رہ گئے۔ ہم انہیں یہ تسلی کیسے دے سکتے تھے کہ کارل ایک مرتبہ پھر صحت مند ہو کر گھر آ جائے گا۔ میں نے ایک بار پھر ہمت بندھانے کی کوششیں شروع کیں: ڈیڈی زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ وہ مجھے معلوم بہادر ترین آدمی ہیں۔ ڈاکٹر دنیا کے بہترین ڈاکٹر ہیں......

اگلے روز سیاٹل میں ایک ایکسرے سے پتا چلا کہ کارل کو نمونیہ ہو گیا تھا۔ بار بار کیے جانے والے ٹیسٹ بھی کسی بیکٹیریا یا وائرس وغیرہ کا سراغ لگانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ کارل کے پھیپھڑوں میں سوزش تھی جس کی وجہ غالباً چھ ماہ قبل کھائی ہوئی ادویات تھیں۔ سٹیرائیڈز کی زبردست خوراکوں نے اُس کے پھیپھڑوں کو اچھا کرنے کی بجائے محض اُس کی تکلیف میں اضافہ ہی کیا۔ ڈاکٹر مجھے عظیم ترین صدمہ سہنے کے لیے تیار کرنے لگے۔ جب میں ہسپتال کے ہال میں واپس آئی تو سٹاف کے چہروں پر دو نہایت مختلف قسم کے تاثرات دکھائی دیے۔ انہوں نے ہمدردانہ مسکراہٹ دی یا پھر اپنی نظریں پھیر لیں۔ اب بچوں کو بھی سیاٹل بلوانے کا موقع آ گیا تھا۔

جب کارل نے ساشا کو دیکھا تو اُس پر معجزانہ اثر ہوا۔ اُس نے ساشا سے کہا: "پیاری پیاری ساشا۔ تم نہ صرف پیاری بلکہ زبردست بھی ہو۔ اگر میں زندہ بچ گیا تو اِس میں تمہاری یہاں موجودگی کا بھی عمل دخل ہو گا۔" اگلے کئی گھنٹوں کے دوران ہسپتال کے مانیٹرز نے کافی بہتری دکھائی لیکن اپنے دماغ کے کسی گوشے میں یہ خیال موجود تھا کہ ڈاکٹر میرے جیسے پر جوش نہیں ہیں۔ وہ اِس عارضی بہتری کو بخوبی سمجھتے تھے...... مکمل طور پر بجھنے سے پہلے چراغ کا بھڑکنا۔

کارل نے مجھ سے کہا: "میں مرنے والا ہوں۔" میں نے احتجاج کیا: "نہیں، تم جیت جاؤ

گے، جیسا کہ پہلے بھی مایوس کن صورت حال میں فاتح بن کر آئے تھے۔" اُس نے میری جانب وہی نگاہ ڈالی جو میں بیس سال ایک ساتھ کام کرنے کے دوران دیکھ چکی تھی۔ اُس نے مذاق اور تشکیک کے ملے جلے انداز میں کہا: "چلو دیکھتے ہیں کہ کس کی بات ٹھیک ثابت ہوتی ہے۔"

سام، جواب پانچ سال کا ہے، آخری مرتبہ اپنے باپ سے ملنے آیا۔ اگر چہ کارل کی سانس اُکھڑ رہی تھی اور اسے بات کرنا مشکل ہو رہا تھا، مگر اُس نے خود کو سنبھالا تا کہ ننھا بیٹا خوف زدہ نہ ہو جائے۔ وہ بس اتنا ہی کہہ سکا: "سام، میں تم سے پیار کرتا ہوں۔" سام محبت بھرے انداز میں بولا:

"ڈیڈی، میں بھی آپ سے پیار کرتا ہوں۔"

بنیاد پرستوں کی امیدوں کے برعکس کارل نے مرتے وقت مذہب کی جانب رجعت اختیار نہ کی۔ اُس کی بجھتی ہوئی آنکھوں میں جنت یا حیات بعد از موت کا کوئی خواب نہیں سجا ہوا تھا۔ کارل کے لیے سب سے زیادہ اہمیت درست بات کی تھی، نہ کہ اُس بات کی جو ہمیں بہتر محسوس ہوتی ہو۔ ہماری نظریں ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں کہ ہمارا شاندار ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

کارل سیگان
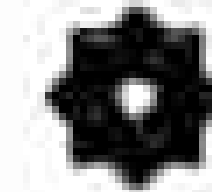
15

اقتباسات

مشہور لوگوں کے آخری لمحات

یہاں ہم کچھ مشہور ادیبوں، شاعروں، آرٹسٹوں، اداکاروں اور سیاسی رہنماؤں کے آخری کلمات دے رہے ہیں۔ زیادہ تر لوگوں کے آخری تاثرات میں طنز کا رنگ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ اِن کی مدد سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ مشہور لوگوں نے موت کو واضح اور مطلق طور پر محسوس کر لینے پر کیا ردِعمل دیا تھا۔

اِبسن، ہنرک Ibsen, Henrik(1828-1906)...... نارویجین ڈرامہ نگار جس نے "A Doll's House" جیسے کلاسکس کے ذریعہ بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ اُسے 1900ء میں دل کا دورہ پڑا اور موت تک بستر سے لگا رہا۔ ایک روز اُس نے اپنی نرس کو کسی تیماردار سے کہتے سنا کہ اب وہ ٹھیک محسوس کر رہا تھا۔ حالانکہ اِبسن اُس وقت آخری دموں پر تھا۔ لہٰذا اُس نے ٹوکا:

"اِس کے برعکس۔"

ارشمیدس Archimedes(298-212 B.C.)...... ہیلینیائی عہد کا نمائندہ ریاضی دان۔ جب رومنوں نے سیراکیوس کو فتح کیا تو ایک رومن فوجی نے ارشمیدس کو مار ڈالا۔

"ذرا ٹھہرو، میں اپنا مسئلہ حل کر لوں۔"

اونیل، یوجین O'Neill, Eugene(1888-1953)...... اُسے امریکہ کا اہم ترین ڈرامہ

نویس خیال کیا جاتا ہے۔ اُس نے اپنی زندگی میں ہی نوبیل اور Pulitzer انعام حاصل کیا۔ وہ نیویارک سٹی کے ایک ہوٹل میں پیدا ہوا، اور ساری زندگی پارکنسن بیماری کا شکار رہا۔

''ہوٹل میں پیدائش، اور ہوٹل میں ہی موت...... خدا کی لعنت۔''

او ہنری Henry, O.(1862-1910)......اصل نام ولیم سڈنی پورٹر۔ مشہور امریکی افسانہ نگار۔ اُس کے آخری الفاظ ایک گیت کا حصہ تھے جو اُن دنوں مقبول تھا۔

''روشنی مت بجھاؤ۔ مجھے اندھیرے میں گھر جانے سے ڈر لگتا ہے۔''

ایبے لارڈ، پیٹر Abelard, Peter(1079-1142)...... بارہویں صدی عیسوی کے نصف اول کا مشہور ترین سائنس دان۔

''مجھے نہیں پتا۔''

ایڈمز، جان کیو Adams, John Q.(1767-1848)......جان ایڈمز کا بیٹا اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا چھٹا صدر۔

''یہ آخری زمین ہے۔ مگر میں مطمئن ہوں۔''

ایڈمز، جان Adams, John(1735-1826)......اُس نے پہلے اور دوسرے آئینی کنونشنز میں میساچوسٹس کی نمائندگی کی اور امریکی انقلاب کے لیے یورپی حمایت حاصل کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔

''تھامس جیفرسن زندہ رہے گا۔''

ایڈیسن، تھامس ایلوا Edison, Thomas A(1847-1931)......1929ء کے موسم بہار میں تھامس ایڈیسن نیوجرسی سے مشی گن گیا تا کہ اپنی اہم ترین ایجاد برقی بلب کی گولڈن جوبلی تقریب میں شرکت کر سکے۔ صدر ہوور سے متعارف کروائے جانے کے بعد ایڈیسن نے مختصری تقریر کی اور گر گیا۔ اگست میں اُس کے ساتھ دوسری مرتبہ یہی واقعہ پیش آیا اور بستر سے لگ گیا۔ آخری وقت میں اُس کی دوسری بیوی قریب بیٹھی تھی۔ وہ جھکی اور پوچھا: ''تکلیف تو نہیں ہو رہی؟'' ایڈیسن نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے جواب دیا:

''وہاں باہر بہت خوب صورت منظر ہے۔''

ایڈیسن، جوزف Addison, Joseph(1672-1719)...... ایک انگلش سیاست دان اور ایک ادبی حلقے کا رکن جس میں جوناتھن سوئفٹ بھی شامل تھا۔

''دیکھو، ایک عیسائی کس قدر سکون سے مر سکتا ہے۔''

ایلزبتھ اول Elizabeth I(1533-1603)...... بادشاہ ہنری ہشتم کی بیٹی اور انگلینڈ کی ملکہ (1558ء سے لے کر 1603ء میں اپنی وفات تک۔) وہ اپنے دربار کی شان و شوکت اور کامیاب پالیسیوں کی وجہ سے مشہور ہوئی۔ وہ آخری عمر میں پہنچی اُس کے سارے دوست دشمن اور محبوب مر چکے تھے۔ آخری ایام میں وہ اپنے کمرے کے فرش پر تکیے بچھا کر نیم بے ہوش حالت میں اوندھی پڑی رہتی تھی۔ موت سے کچھ دیر پہلے اُس نے نوکروں سے کہا کہ اُسے بستر پہ لٹا دیں۔

''میری تمام املاک بس لمحہ بھر کے لیے ہیں۔''

ایلن، ایتھان Allen, Ethan(1738-1789)...... امریکی محبِ وطن اور امریکی انقلاب کے دوران ''گرین ماؤنٹین بوائز'' کا قائد۔ آخری وقت میں ڈاکٹر نے اُس سے کہا تھا، ''جنرل، میرے خیال میں فرشتے تمہارا انتظار کر رہے ہیں،'' تو اُس نے جواب میں کہا:

''وہ انتظار کر رہے ہیں؟ وہ انتظار کر رہے ہیں؟ اُنہیں انتظار کرنے دو۔''

ایولر، لیونہارڈ Euler, Leonhard (1707-1783)......تاریخ کا نہایت کثیر نویس ریاضی دان جس نے 850 سے زائد کتب اور مضامین لکھے۔ ایک دوپہر کو کام کے دوران اُس نے اپنے پوتے کو کمرے میں بلوایا اور اُس کے ساتھ کھیلنے لگا۔ اچانک پائپ اُس کے منہ سے گر گیا اور وہ اپنی موت کا اعلان کرنے کے بعد ڈھیر ہو گیا:

''میں مر گیا۔''

ایئرہارٹ، ایمیلیا Earhart, Amelia(1897-1937)......اولین خاتون پائلٹ جس نے سولو فلائٹ میں بحر اوقیانوس عبور کیا۔ 1937ء میں اُس نے خطِ استوا کے اوپر ساری دنیا کے گرد فلائٹ کرنے کی کوشش کی۔ اُس کا جہاز نیوگنی سے ٹیک آف کرنے کے بعد پراسرار طور پر غائب ہو

گیا۔ ایمیلیا کے آخری الفاظ یہی سنائی دیے:

''ہمیں تمہارے اوپر ہونا چاہیے تھا، لیکن تم نظر نہیں آ رہے۔ گیس ختم ہو رہی ہے۔''

ایسٹ مین، جارج Eastman, George(1854-1932)......امریکی موجد جس نے فوٹو گرافک پلیٹیں بنانے کا عمل بہت سادہ بنا دیا۔ 1884ء میں اُس نے لچک دار فلم اور 1887ء میں کوڈک باکس کیمرہ متعارف کروایا۔

''میں اپنا کام کر چکا ہوں۔ تو پھر انتظار کیوں کروں؟''

آزیگلیو، ماسیمو Azeglio, Massimo(1798-1866)......اطالوی ریاست کار اور تاریخی ناولوں کا مصنف۔ موت سے کچھ عرصہ پہلے وہ اپنی بیوی لوئیزا سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ آخری وقت میں وہ اُس کے پاس دوڑتی چلی آئی۔

''آہ لوئیزا، تم ہمیشہ اُس وقت آتی ہو جب میں روانہ ہونے لگتا ہوں۔''

آسٹر، جان جیکب Astor, John Jacob, IV(1864-1912)...... بیسویں صدی کے آغاز میں وہ دنیا کا امیر ترین آدمی تھا۔ مین ہیٹن میں اُس کی 700 املاک تھیں اور وہ 20 مختلف کمپنیوں کا چیئرمین تھا۔ ٹائی ٹینک جہاز کے غرق ہونے والے 1500 مسافروں میں وہ بھی شامل تھا۔ اُس نے آخری وقت میں اپنی محبوبہ میڈلین سے کہا:

''خواتین کو پہلے جانا ہے۔ میری خاطر لائف بوٹ میں بیٹھ جاؤ۔ خدا حافظ، میری پیاری۔ پھر ملیں گے۔''

آسٹر، لیڈی نینسی Astor, Lady Nancy(1879-1964)...... پارلیمنٹ کی پہلی خاتون رکن۔ وہ اپنی حاضر جوابی کے لیے مشہور تھی۔ آخری وقت میں اُس نے سارے اہلِ خانہ کو ارد گرد کھڑے دیکھ کر کہا:

''میں مر رہی ہوں یا یہ میری سالگرہ ہے؟''

آئزن ہاور، ڈوائٹ Eisenhower, Dwight(1890-1969)......امریکہ کا 43 واں صدر اور مشہور ترین فوجی جنرل۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران اُس نے شمالی افریقہ، اٹلی اور فرانس میں

اتحادی فوجوں کی قیادت کی۔

''میں نے ہمیشہ اپنی بیوی، اپنے بچوں اور پوتوں، اور اپنے وطن سے محبت کی ہے۔ اب میں جانا چاہتا ہوں۔ اے خدا، مجھے قبول کر۔''

باری مور، ایتھل Barrymore, Ethel(1879-1959)......مشہور امریکی ایکٹریس۔ آخری وقت میں اُس نے اپنی نوکرانی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا:

''کیا تم خوش ہو؟ میں تو خوش ہوں۔''

باری مور، جان Barrymore, John(1882-1942)......تھیٹر کا مشہور اداکار۔ بسترِ مرگ پر اُس نے اپنے پادری کو بلوایا اور اعتراف کیا کہ وہ اب بھی جنسی خواہش رکھتا ہے۔ پادری نے پوچھا کہ کس کے لیے، تو اُس نے نرس کی جانب اشارہ کر دیا۔

بکانن، جیمز Buchanan, James(1791-1868)......اُس نے 1857ء میں امریکہ کے 15 ویں صدر کے طور پر حلف اٹھایا۔ وہ غلامی کے خاتمے کے خلاف ری پبلکنز کے پیش کردہ ہر ایک بل کو ویٹو کرتا رہا۔ جب ابراہام لنکن نے عہدہ سنبھالا تو وہ پنسلوانیا میں گمنامی کی زندگی گزارنے چلا گیا۔

''نتیجہ چاہے کچھ بھی ہو، لیکن میں اس شعور کے ساتھ قبر میں جاؤں گا کہ میں اپنے ملک کا بھلا چاہتا تھا۔''

براؤن، جان Brown, John(1800-1859)......اُس نے امریکہ میں غلامی کے خلاف مسلح جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا۔

''مجھے پورا یقین ہے کہ اس مجرم دھرتی کے گناہ صرف خون سے دھوئے جا سکتے ہیں۔''

برن سٹین، لیونارڈ Bernstein, Leonard(1918-1990)......ممتاز امریکی کمپوزر، پیانو نواز اور کنڈکٹر۔

''یہ کیا ہے؟''

بروس، رابرٹ Bruce, Robert(1274-1329)...... انگلینڈ کا بادشاہ۔ 1305ء میں سکاٹ لینڈ کے قومی ہیرو ولیم والیس کو سزائے موت دیے جانے کے بعد بروس نے بھی سکاٹش

نصب العین اختیار کر لیا اور اُس کے پرانے دشمن جان کومین کو قتل کیا۔ اُس نے اپنی زیادہ تر زندگی آئر لینڈ میں انگلینڈ کے خلاف لڑتے ہوئے گزاری؛ حتیٰ کہ انگلینڈ نے 1328ء میں سکاٹ لینڈ کی خود مختاری باقاعدہ انداز میں تسلیم کر لی۔

''میرے بچو، اب خدا تمہاری حفاظت کرے۔ میں نے تمہارے ساتھ ناشتہ کر لیا اور رات کا کھانا خداوند کے ساتھ کھاؤں گا۔''

بروس، لینی Bruce, Lenny(1925-1966)...... وہ اچھوتی فحش کامیڈیئن تھی۔ اُس نے اسٹیبلشمنٹ کی شدید مخالفت کی اور کئی مرتبہ جیل کی ہوا کھائی۔ اُس نے بہت زیادہ نشہ کرنا شروع کر دیا اور ایک روز اپنے باتھ کے فرش پر برہنہ حالت میں بے ہوش پائی گئی۔

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ مجھے shit کہاں سے ملے گی؟''

برونٹے، ایملی Bronte, Emily(1818-1848)...... انگلش مصنفہ، '' Wuthering Heights '' کی خالق۔ 1847ء میں اُس کی عظیم تصنیف شائع ہوئی لیکن وہ جلد ہی بیمار ہوئی اور مرگئی۔

''شفیق آسمان تلے، میں اُن کے اردگرد پھرتی رہتی ہوں۔ میں نے تتلیوں کو منڈلاتے دیکھا ہے، گھاس میں ہوا کی سرسراہٹ سنی ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ کیا کبھی کوئی شخص ساکت مٹی تلے سوئے ہوئے لوگوں کی بے چینی کا تصور کر سکتا ہے؟''

بوتھ، جان ولکز Booth, John Wilkes(1839-1865)...... اُس نے صدر لنکن کے سر میں گولی ماری تھی۔ وہ فرار تو ہو گیا لیکن ایک ساتھی نے خبر کر دی اور وہ کچھ ہی عرصے بعد فوج کے ہتھے چڑھ گیا۔

''میری ماں کو بتا دو، میری ماں کو بتا دو، میں اپنے وطن کی خاطر مر گیا.... بے کار.... بے کار۔''

بوربینک، لوتھر Burbank, Luther(1849-1926)...... ایک امریکی ہارٹیکلچرسٹ جس نے سینکڑوں نئی سبزیاں، پھل اور پھول بنائے۔ وہ ڈارون کے خیالات سے بہت متاثر تھا۔

''مجھے اچھا محسوس نہیں ہو رہا۔''

بولین، آین Boleyn, Anne(1507?-1536)...... ہنری ہشتم کی دوسری ملکہ اور ایلز بتھ

اول کی ماں۔ ہنری کی منظور نظر نہ رہنے کے بعد اُسے موت کی سزا سنائی گئی۔ پھانسی کے چبوترے پر کھڑے ہو کر اُس نے لوگوں سے مختصر خطاب کیا:

''اچھے عیسائی لوگو، میں مرنے کے لیے یہاں آئی ہوں، کیونکہ قانون کے مطابق مجھے موت کی سزا سنائی گئی ہے۔ اِس لیے میں اِس فیصلے کے خلاف کچھ نہیں کہوں گی۔ لیکن خدا سے میری دعا ہے کہ بادشاہ طویل عرصہ تک حکومت کرے، کیونکہ آج تک کبھی اُس جیسا نرم دل بادشاہ نہیں آیا۔ اور اُس نے میرے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ اے خدا میری روح پر رحم کر۔''

بوہورس، ڈومینیک Bouhours, Dominique(1628-1702)...... ممتاز فرانسیسی یسوعی گرامیرئین جس نے فرانسیسی زبان کو صحیح تلفظ کے ساتھ بولنے کی تحریک چلائی۔

''میں مرنے والا ہوں۔ یا میں مر رہا ہوں۔ دونوں ہی جملے ٹھیک ہیں۔''

بیتھوون، لڈوگ وان Beethoven, Ludwig van(1770-1827)...... دنیا کا عظیم ترین جرمن موسیقار۔ وہ آخری عمر میں بہرہ ہو گیا تھا۔

''دوستو، خوشی مناؤ! کامیڈی ختم ہوئی۔''

بیچر، ہنری وارڈ Beecher, Henry Ward(1813-1887)...... ہیریئٹ بیچر سٹوو کا بھائی، غلامی کے خاتمے کا پرجوش حامی اور 1800ء کی دہائی میں امریکی مذہبی طبقے کا اہم ترین رکن تھا۔ بدکاری کے ایک مقدمے اور ڈارون ازم کو درست ماننے کے بعد اُسے مسیحی مقدس برادری سے خارج کر دیا گیا۔

''اب پراسرار موقع آیا ہے۔''

بیلی، جین سلویان Bailly, Jean Sylvain(1736-1793)...... فرنچ اکیڈمی آف سائنسز کا رکن جو 1789ء میں پیرس کا پہلا انقلابی میئر بنا۔ تاہم، رد انقلاب ہونے پر اُسے موت کی سزا سنائی گئی۔ گلوٹین دیے جانے سے قبل ایک تماشائی نے دیکھا کہ وہ کانپ رہا تھا۔ جین بیلی اُسے مخاطب کر کے بولا:

''میرے دوست، صرف سردی کی وجہ سے۔''

بیل، الیگزینڈر گراہم Bell, Alexander Graham(1847-1922)...... سکاٹ لینڈ کا مشہور موجد جس نے زیادہ تر عرصہ امریکہ میں کام کرتے ہوئے گزارا۔ ٹیلی فون ایجاد کرنے کے دنوں میں اُسے بوسٹن یونیورسٹی میں پروفیسر تعینات کیا گیا۔ وہاں وہ اپنی ایک بہری طالبہ میبل کی محبت میں گرفتار ہوا۔ چالیس سال شادی شدہ زندگی گزارنے کے بعد وہ مرض الموت کا شکار ہوا۔ آخری وقت میں میبل نے اُس سے کہا، ''مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔'' گراہم نے جواب دیا:

''نہیں۔''

بیہن، برینڈن Behan, Brendan(1923-1964)...... آئرش ڈرامہ نویس اور آئرش ری پبلکن آرمی کا رکن۔ وہ اپنے طنز و مزاح کے لیے خاص طور پر مشہور تھا۔ آخری وقت میں اُس نے اپنے قریب کھڑی نن سے کہا:

''سسٹر، تم پر خدا کی رحمت ہو۔ خدا کرے تمہارے سارے بیٹے بشپ بنیں۔''

پکاسو، پبلو Picasso, Pablo(1881-1973)...... ہسپانوی مصور، سنگ تراش اور سرامسٹ جس نے Cubism مکتبۂ فکر کی بنیاد رکھی جو جدید مصوری میں اہم ترین حیثیت رکھتا ہے۔

''ایک جام میرے نام۔''

پومپاڈور، جین Pompadour, Jeanne(1721-1764)...... فرانسیسی دربار کی ایک معزز خاتون اور لوئی XV کی محبوبہ۔ اُس نے وسط اٹھارہویں صدی کی فرانسیسی سیاست پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ مرنے سے کچھ دیر پہلے اُس نے خدا سے ''ایک سیکنڈ'' ٹھہرنے کی دعا کی۔ اور جب مہلت مل گئی تو فوراً اپنے رخساروں پر غازہ لگا کر آرام سے لیٹ گئی۔

''ایک سیکنڈ ٹھہرو۔''

تھربر، جیمز Thurber, James(1894-1961)...... امریکی کارٹونسٹ اور مصنف جو اکثر نیویارک میگزین میں کام کرتا رہا۔ 1961ء میں اُس کے دماغ کا آپریشن ہوا۔ عارضی بحالی کے بعد اُس نے کہا:

''خدا کی رحمت..... خدا کی لعنت۔''

ٹالسٹائی، لیو Tolstoy, Leo(1828-1910)...... روسی ادیب جس نے کریمیائی جنگ میں بطور فوجی افسر خدمات انجام دیں۔ اُس نے امن پسندی اور ریاضت پر مبنی زندگی گزاری اور آرتھوڈوکس کلیسیا کی تعلیمات کو مسترد کیا۔ آخری وقت میں پادری نے اُسے توبہ کرنے کی پیش کش کی تو اُس نے جواب دیا:

''موت کی وادی میں بھی دو اور دو چھ نہیں ہوتے۔''

چارلی، چیپلن Chaplin, Charles(1889-1977)...... برطانوی اداکار جو ہالی ووڈ کا سٹار بنا۔ اُسے سینما کی تاریخ کا بہترین کامیڈین قرار دیا جاتا ہے۔ آخری وقت میں قریب موجود پادری نے کہا: ''خداوند تمہاری روح پر رحم کرے۔'' چارلی چیپلن نے جواب دیا:

''کیوں نہیں کرے گا؟ یہ اُسی کی تو ہے۔''

چنگیز خان Genghis Khan(1155?-1227)...... تاریخ کی سب سے بڑی بادشاہت کا بانی جو مشرق قریب سے زرد دریا تک محیط تھی۔

''میری موت کی وجہ سے ہتھیار نہ پھینک دینا، اور میرے لیے ہرگز آنسو نہ بہانا۔ دشمن کو میری موت سے خبردار کردو۔''

چی گویرا Guevara, Ernesto "Che"(1928-1967)...... ارجنٹائن کا مشہور انقلابی جس نے کیوبا کے کیمونسٹ انقلاب میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ 1966ء میں اُس نے بولیویا میں ایک گوریلا فورس قائم کی اور جلد ہی زخمی ہو کر پکڑا گیا۔ بولیویا کی فوج نے اُسے گولی سے اُڑانے کا حکم دیا۔

''مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے ہلاک کرنے آئے ہو۔ گولی چلاؤ، بزدل۔ تم ایک انسان کو مارنے والے ہو۔''

چیخوف، انتونی Chekhov, Anton(1860-1904)...... روسی طبیب اور مصنف۔ 1880ء میں اُس نے اخبار اور میگزین میں کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ وہ تپ دق کا شکار ہوا۔

''بہت عرصہ ہوا میں نے شیمپین نہیں پی۔''

ڈارون، چارلس Darwin, Charles(1809-1882)...... اُس نے انواع حیات کا مطالعہ

کر کے نتیجہ اخذ کیا کہ جاندار اشیأ فطری انتخاب کے عمل کے ذریعہ ارتقأ پاتی ہیں۔ مذہبی بنیاد پرستوں نے اُس پر شدید حملے کیے اور اس نظریے کو بائبل کے عقائد کے خلاف قرار دیا۔

''میں موت سے بالکل بھی خوف زدہ نہیں ہوں۔''

ڈانٹن، جارجیز جیکس Danton, Georges Jacques(1759-1794)......فرانسیسی انقلابی۔ انقلاب مخالف عدالت نے اُسے موت کی سزا سنائی۔ گلوٹین دیے جانے سے قبل اُس نے اپنے جلاد کو آخری ہدایات دیں، اور کہا:

''میرا سر عوام کو دکھانا۔ یہ واقعی دیکھنے کے قابل ہے۔ تم میرا نام تاریخ کی عبادت گاہوں میں پاؤ گے۔''

ڈبروف، جیسیکا Dubroff, Jessica(1989-1996)......چار فٹ دو انچ قد اور 42 پونڈ وزن کی سات سالہ بچی جس کے والدین نے اُسے سب سے کم عمر ہواباز کا ریکارڈ قائم کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ چار ماہ کی تربیت کے بعد جیسیکا، اُس کا باپ اور انسٹرکٹر مشہور سفر پر روانہ ہوئے۔ جیسیکا کا جہاز جلد ہی گر کر تباہ ہو گیا اور تینوں مارے گئے۔ جیسیکا نے اپنی ماں سے فون پر آخری بات کی تھی:

''ماں، تم بارش کی آواز سن رہی ہو؟ سن رہی ہو نا؟ ماں میں ہوائی جہاز کو اُڑانا چاہتی ہوں۔''

ڈریسر، تھیوڈور Dreiser, Theodore(1871-1945)......ایک امریکی ناول نگار جس کی بہترین تصنیفات ''Sister Carrie'' اور ''An American Tragedy'' ہیں۔

''شیکسپیئر میں آرہا ہوں۔''

ڈکنسن، ایملی Dickinson, Emily(1830-1886)......عظیم ترین امریکی شاعرہ۔ اُس کی زندگی میں بس سات نظمیں ہی شائع ہوئی تھیں، اور وہ بھی کسی فرضی نام سے۔ اُس نے زیادہ تر زندگی میساچوسٹس میں ایمہرسٹ کے مقام پر گزاری۔

''......دھند چھا رہی ہے۔''

ڈی آنزو، گابرئیل D'Annunzo, Gabriele(1863-1938)......اطالوی شاعر، ناول

نگار، ڈرامہ نویس، پلے بوائے، جنگی ہیرو اور فاشسٹ مہم جُو۔ وہ چالیس برس تک اٹلی کے ثقافتی حلقوں میں چھایا رہا اور عموماً اپنے معاشقوں کو ہی ادبی موضوعات بنایا۔

''میں بہت بور ہو رہا ہوں، میں بہت بور ہو رہا ہوں۔''

ڈی مولے، جیکس DeMolay, Jacques(1244?-1313)...... وہ نائٹس ٹمپلر کا ماسٹر منتخب ہوا۔ کچھ ہی عرصہ قبل مسلمانوں نے اس فرقے کو ارضِ مقدس سے بے دخل کیا تھا۔ ڈی مولے یورپ بھر میں دورہ کر کے ایک نئی صلیبی جنگ کے لیے حمایت اکٹھی کرنے لگا، لیکن پوپ کلیمنٹ اور بادشاہ فلپ چہارم کے ساتھ جھگڑا ہو گیا۔ فلپ نے ڈی مولے کو کافی عرصہ تک قید میں رکھا، تشدد کا نشانہ بنایا۔ پھر اُسے سزائے موت دینے کے لیے ایک چھوٹے سے جزیرے پر بھجوا دیا گیا۔ ڈی مولے کو دہکتے ہوئے کوئلوں کے اوپر زندہ بھونا گیا۔ وہ آخری سانس تک فلپ اور کلیمنٹ پر لعنتوں کی بارش کرتا رہا۔ (33 روز بعد پوپ کلیمنٹ پنجم کینسر کے باعث مر گیا اور سات ماہ بعد فلپ کو شکار کے دوران موت نے آلیا۔)

''خدا انہیں جلد ہی غارت کرے جنہوں نے ہم پر جھوٹا الزام لگایا ہے۔ خدا ہمارا بدلہ لے گا۔''

ڈیانا، پرنسس آف ویلز Diana, Princess of Wales(1961-1997)...... ڈیانا اور شہزادہ چارلس نے سرِعام بدکاری اور بے وفائی کا اعتراف کرنے کے بعد 1996ء میں طلاق کا فیصلہ کیا۔ ایک سال کے اندر اندر ڈیانا ایک بین الاقوامی پلے بوائے اور کروڑ پتی دودی الفائد کے ساتھ معاشقے میں مشغول ہو گئی۔ دونوں پیرس میں فوٹو گرافرز سے بچنے کی کوشش میں تیز کار چلاتے ہوئے خوف ناک حادثے کا شکار ہوئے۔

''او میرے خدا۔ یہ کیا ہو گیا۔''

رابلیس، فرانسوئز Rabelais, Francois(1494?-1553)......فرانسیسی مصنف جو پہلے فرانسسکی راہب، بینیڈکٹی صوفی، ایک سیکولر پادری اور طبیب رہ چکا تھا۔ اپنی عظیم ترین طنزیہ کتاب ''Gargantua and Pantagruel'' کی وجہ سے اُسے دین بدر کیا گیا۔

''پردہ گرا دو، کھیل ختم ہو گیا۔''

رولینڈ، مادام Roland, Madame(1754-1793)......ژاں ژاکس روسو کی معتقد اور جین

میری رولینڈ کی بیوی۔ وہ ایک مشہور ادبی سیلون چلاتی تھی۔ اُسے انقلابی سرگرمیوں کی وجہ سے سزائے موت دی گئی۔ سزا پانے سے قبل وہ مجسمہ آزادی کے سامنے جھکی اور کہا:

''اے آزادی! آزادی! تیرے نام پر کیسے کیسے جرائم کیے گئے ہیں۔''

ریوز، جارج ''سپرمین'' Reeves, George "Superman"(1914-1959)...... امریکی اداکار اور 1950ء کی دہائی کے دوران کلاسیکی ٹیلی ویژن سیریز ''سپرمین'' کا مرکزی کردار ریوز نے ہی ادا کیا تھا۔ اگرچہ وہ ''Gone With the Wind'' جیسی فلموں میں کام کر چکا تھا لیکن سپرمین کی چھاپ نے اُسے مزید کام ملنا ناممکن بنا دیا۔ وہ آخری عمر میں اپنی ایک دوست کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک رات کو کافی دیر سے کوئی اور دوست ملنے آیا اور ریوز کو جگایا گیا تو وہ بہت غصے میں آیا اور مندرجہ ذیل الفاظ بول کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ کبھی نہ اُٹھا:

''میں تھکا ہوا ہوں۔ واپس سونے جا رہا ہوں۔''

ززکا، جان Zizka, Jan(1358-1424)...... چیک جنرل جس نے جان ہس کی سزائے موت کے بعد بوہیمیائی پروٹسٹنٹس کی قیادت سنبھالی۔ اُس نے مقدس شہنشاہ روم سجسمنڈ کو بوہیمیا کا بادشاہ ماننے سے انکار کیا۔ اُس نے متواتر جنگیں کر کے اپنے ملک کو آزاد کروالیا۔ وہ جون 1424ء میں پراگ میں داخل ہوا۔ لیکن یہ کامیابی عارضی ثابت ہوئی۔ طاعون نے اُس کی جان لے لی۔

''میری کھال سے ڈھول بنا کر بوہیمیائی نصب العین کا اعلان کرو۔''

زیگفیلڈ، فلورنز Ziegfeld, Florenz(1869-1932)...... مشہور براڈوے پروڈیوسر جس کے میوزیکل پروگراموں میں شاندار سیٹ اور خوب صورت عورتیں ہوتی تھیں۔ وہ مخبوط الحواس حالت میں یہی ظاہر کرتے ہوئے دنیا سے گیا کہ جیسے ایک شو کو ڈائریکٹ کر رہا ہو۔

''پردہ! فاسٹ میوزک! لائٹس! فائنل سین کے لیے تیار! زبردست! شو اچھا لگ رہا ہے۔ شو اچھا لگ رہا ہے۔''

سقراط Socrates(469-399 B.C.)...... عظیم ترین یونانی فلسفی جس نے روایت سے انحراف کرتے ہوئے اخلاقیات اور منطق دونوں پر بات کی۔ اُسے ایتھنز کے نوجوانوں کو گمراہ کرنے کے الزام میں زہر کا پیالہ پینے کی سزا دی گئی۔ اُس نے زہر پینے سے پہلے اپنے شاگرد

کرائٹو سے کہا:

''کرائٹو، میں نے ایسکولاپیئس سے ایک مرغ لیا تھا۔ اُس کا قرض چکانا یاد رکھنا۔''

سیزر، جولیس Caesar, Julius Gaius(100-44 B.C.)...... مارکس جونیئس بروٹس نے سیزر کا ایک قریبی دوست اور ساتھی ہونے کے باوجود اُس کے قتل کی سازش میں حصہ لیا۔ جب سینیٹ کے ارکان نے سیزر پر حملہ کیا اور زخمی سیزر نے بروٹس کو خنجر ہاتھ میں لیے اپنی جانب آتے دیکھا تو حیرت کے عالم میں بولا:

''بروٹس، تم بھی؟''

سینڈرز، جارج Sanders, George(?-1972)...... برطانوی اداکار جس کا فلمی کیریئر چار عشروں پر محیط تھا۔ اُس نے چار مرتبہ شادی کی۔ اپریل 1972ء میں اُس نے بارسلونا کے ایک ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لیا، مختصر سا نوٹ لکھا اور نیند کی گولیاں کھا کر خودکشی کر لی۔

''پیاری دنیا، میں جا رہا ہوں کیونکہ بہت بور ہو گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے کافی زندگی گزار لی۔ میں تمہیں تمہاری پریشانیوں کے پاس چھوڑے جا رہا ہوں۔ گڈ لک۔''

فرائیڈ، سگمنڈ Freud, Sigmund(1856-1939)...... تحلیلی نفسیات کا بانی فرائیڈ سگریٹ نوشی کا عادی تھا۔ وہ روزانہ بیس سگار پی جاتا۔ اُس کے تیس سے زائد آپریشنز ہوئے تا کہ رسولیاں نکالی جا سکیں۔ 1923ء میں اُسے کینسر میں مبتلا بتایا گیا۔

''میری پیاری Schur، تمہیں ہماری پہلی گفتگو یاد ہے نا! تم نے وعدہ کیا تھا کہ جب مجھ میں مزید ہمت نہ رہے گی تو تم میرا سہارا بنو گی۔ اب تو صرف اذیت ہی اذیت ہے؛ اور کسی چیز کا کوئی مفہوم نہیں رہا۔''

فروہمین، چارلس Frohman, Charles(1860-1915)...... 1890ء اور 1915ء کے درمیان ایک ممتاز امریکی تھیٹریکل منیجر۔ جب 1915ء میں جرمن آب دوز نے Lusitania نامی بحری جہاز کو ڈبویا تو فروہمین بھی اُس پر سوار تھا۔ 1900 میں سے تقریباً 1200 مسافر ڈوب مرے۔ فروہمین کو آخری مرتبہ چلا چلا کر مسافروں کو ہمت دلاتے ہوئے دیکھا گیا۔ وہ کہہ رہا تھا:

"موت سے خوف کس بات کا۔ موت تو بس ایک خوب صورت ایڈونچر ہے۔"

فریڈرک ولیم اول Frederick William I(1688-1740)...... پروشیا کا بادشاہ اور فریڈرک اعظم کا باپ جو پروشیا کو ایک طاقت ریاست بنانے کی وجہ سے شہرت رکھتا ہے۔ بستر مرگ پر پادری اُس کی ڈھارس بندھانے آیا اور بائبل کی "کتاب ایوب" میں سے ایک آیت پڑھ کر سنائی: "میں اپنی ماں کی کوکھ سے ننگا باہر آیا تھا اور ننگا ہی قبر میں جاؤں گا۔" یہ سن کر فریڈرک نے کہا:

"نہیں، بالکل ننگا نہیں۔ میں نے اپنا یونیفارم پہنا ہوا ہوگا۔"

فشر، ایڈولف Fischer, Adolf(1859-1887)...... جرمن نراجیت پسند اور انٹرنیشنل ورکنگ پیپلز ایسوسی ایشن کی شکاگو برانچ میں مرکزی رہنما۔ اُسے پھانسی کی سزا ملی۔

"یہ میری زندگی کا مسرور ترین لمحہ ہے۔"

فیلڈز، ڈبلیوسی Fields, W.C.(1880-1946)...... ایک کامیڈین جو "Never Give a Sucker an Even Break" جیسی فلموں میں بہت بڑا اسٹار بنا۔ کثرتِ شراب نوشی نے اُس کی زندگی کو بہت نقصان پہنچایا اور یہی اُس کی موت کی وجہ تھی۔ موت کے وقت اُس کی محبوبہ کارلوٹا مارٹی قریب بیٹھی تھی۔ فیلڈز نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا:

"ساری دنیا اور اِس میں رہنے والے ہر انسان پر خدا کی لعنت، سوائے تمہارے۔"

فیلڈ، جان Field, John(1782-1837)...... ایک برطانوی پیانو نواز اور موسیقار جس کے کام نے شوپین پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اُس نے کبھی اپنے مذہب کا ذکر نہیں کیا تھا۔ آخری وقت میں کسی نے اُس سے پوچھا: "تم پوپ نواز ہو یا کیلون نواز؟" فیلڈ نے جواب دیا:

"میں پیانو نواز ہوں۔"

فیورس، مارکوئس ڈی Favras, Marquis de(1744-1790)...... انقلابِ فرانس کے کارکنوں نے مارکوئس کو اس الزام میں قید کیا کہ اُس نے لوئی XVI کو فرار ہونے میں مدد دی تھی۔ دو ماہ طویل مقدمے کے بعد اُسے پھانسی گھر کی جانب جاتے وقت اُس کی موت کا سرکاری حکم پکڑایا گیا۔ مارکوئس نے حکم نامے کو غور سے دیکھا اور کہا:

"میں دیکھ رہا ہوں کہ تم نے سپیلنگ کی تین غلطیاں کی ہیں۔"

فیئر بینکس، سینئر Fairbanks, Douglas, Sr.(1883-1939)...... ہالی ووڈ کے نمایاں سٹارز میں سے ایک جس کی فلموں میں "رابن ہڈ"، "دی تھیف آف بغداد" اور "مارک آف زورو" بھی شامل تھیں۔ آخری وقت میں اُس نے قریب موجود کسی شخص سے کھڑکی کھولنے کو کہا۔ اُس شخص نے پوچھا کہ اب کیسا محسوس ہو رہا ہے؟ فیئر بینکس نے آخری سانس لیتے ہوئے جواب دیا:

"پہلے کبھی اتنا اچھا محسوس نہیں ہوا۔"

کافکا، فرانز Kafka, Franz(1883-1924)...... بیسویں صدی کے نہایت متاثر کن ادیبوں میں سے ایک۔ وہ تپ دق کا شکار ہوا۔ ہسپتال میں اُس نے ڈاکٹر سے درخواست کی کہ وہ تکلیف سے نجات دلانے کے لیے اُسے مارفین کی زیادہ مقدار دیدے۔

"مجھے مار دو، ورنہ تم قاتل کہلاؤ گے۔"

کرینمر، تھامس Cranmer, Thomas(1489-1556)...... کینٹر بری کا آرک بشپ۔ ملکہ میری نے جب کیتھولک عقیدے کو دوبارہ انگلینڈ کا سرکاری مذہب بنایا تو کرینمر کے خلاف تکفیر دین کا مقدمہ چلایا گیا۔ اُس نے چھ مرتبہ معافی نامہ لکھ کر دیا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ آخر کار اُسے سب کے سامنے آ کر توبہ کرنے کو کہا گیا۔ لیکن اُس نے پوپ کو برا بھلا کہا۔ آگ میں ڈالے جانے پر اُس نے کہا:

"یہ ہے وہ ہاتھ جس نے معافی نامہ لکھا تھا۔ سب سے پہلے اِسے ہی سزا ملنی چاہیے۔"

کرین، ہارٹ Crane, Hart(1899-1932)...... امریکی شاعر۔ میکسیکو سے واپس آتے ہوئے وہ سٹیم شپ کے عرشے پر آیا، تمام ساتھی مسافروں کو ہاتھ ہلا کر الوداع کہا اور یہ کہتے ہوئے پانی میں کود گیا:

"سب کا خدا حافظ۔"

کزولگوز، لیوں Czolgosz, Leon(1873-1902)...... ایک نراجیت پسند، جس نے ایما گولڈ مین سے متاثر ہو کر 1901ء میں صدر ولیم مک کنلے کو قتل کر دیا تھا۔ اُسے 1902ء میں سزائے

موت دی گئی۔

''میں نے صدر کو اِس لیے مارا کیونکہ وہ اچھے محنتی لوگوں کا دشمن تھا۔ مجھے اپنے جرم پر کوئی افسوس نہیں۔''

کونتے، آگست (1798-1857) Comte, Auguste...... فرانسیسی فلسفی جس نے سماجی ڈھانچوں کا مطالعہ کرنے کے لیے سائنسی طریقہ کار وضع کیا جو آج سوشیالوجی کی بنیاد ہے۔ اُس کے فلسفۂ ثبوتیت میں مافوق الفطرت قوت کی بجائے انسانیت محترم ٹھہری۔

''کیسا ناقابلِ تلافی نقصان ہے!''

کیتھرین آف اراگون (1485-1536) Catherine of Aragon...... اراگون کی کیتھرین فرڈینںڈ اور ازابیلا کی بیٹی اور ہنری ہشتم کی بیوی تھی۔ بیٹا پیدا نہ کر سکنے کے باعث اُسے طلاق ہوئی اور بعد میں پراسرار طور پر مرگئی۔

''میری آنکھیں صرف تیری خواہش مند ہیں۔ الوداع۔''

کیسانووا، جیاکومو (1725-1798) Cassanova, Giacomo...... وینس کا کلیسیائی رکن، سپاہی، موسیقار اور الکیمیادان جو 1750ء میں ساحری کے الزام میں قید ہوا۔

''میں ایک فلسفی کی طرح زندہ رہا اور ایک مسیحی کی طرح مرا۔''

کیلی، جارج (1887-1974) Kelly, George...... امریکی ڈرامہ نویس اور گریس کیلی کا چچا۔ بسترِ مرگ پر اُس کی ایک بھانجی اُس سے ملنے آئی اور الوداع کہتے وقت بوسہ دینے کو جھکی۔

''میری پیاری، الوداعی بوسہ دینے سے پہلے اپنے بال سنوار لو۔ یہ بہت الجھے ہوئے ہیں۔''

کیوویئر، لیوپولڈ (1769-1832) Cuvier, Leopold...... اپنے عہد کا ممتاز ماہرِ حیاتیات۔ اُس نے ثابت کیا کہ صورت ہائے حیات معدوم ہو سکتی ہیں۔ وہ فرنچ نیشنل میوزیم آف نیچرل ہسٹری میں جانوروں کی اناٹومی کا پروفیسر تعینات ہوا۔ بسترِ مرگ پر جب ایک نرس اُس کا خون نکال رہی تھی تو اُس نے کہا:

''نرس، میں نے ہی دریافت کیا تھا کہ جونکوں میں سرخ خون ہوتا ہے۔''

کیویل، ایڈتھ (1865-1915) Cavell, Edith...... برطانوی ریڈ کراس کی ایک سینئر میٹرن۔ پہلی عالمی جنگ کے دوران وہ برسلز میں خدمات انجام دیتی رہی۔ جرمن فوج نے وہاں قبضہ کیا تو کیویل اور دیگر نرسوں کی ٹیم نے چوری چھپے اتحادی فوجیوں کا علاج جاری رکھا۔ 1915ء میں وہ گرفتار ہوئی، اُس کا کورٹ مارشل کر کے جاسوسی کے جرم میں موت کی سزا سنادی گئی۔

''میں سزا ملنے کی قوی اُمید رکھتی تھی اور مجھے یقین ہے کہ یہ سزا غلط نہیں۔ خدا کے حضور کھڑے ہوئے میں محسوس کرتی ہوں کہ وطن پرستی ہی کافی نہیں۔ لازمی ہے کہ میرے دل میں کسی سے بھی نفرت کا جذبہ موجود نہ ہو۔''

گریگوری، ہفتم پوپ (1020?-1085) Gregory, VII, Pope...... قرونِ وسطیٰ کے عظیم اصلاح پسند پوپس میں سے ایک۔ اُس نے کلیسیائی عہدے بادشاہوں کو دینے کے دستور کی شدید مخالفت کی۔ یوں رومن شہنشاہ ہنری چہارم اُس کا جانی دشمن بن گیا۔ آخر کار گریگوری نے اُسے دین بدر کیا۔ جواب میں ہنری نے حملہ کر کے گریگوری کو روم سے فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ وہ جلاوطنی میں ہی فوت ہوا۔

''میں نے انصاف سے محبت اور نابرابری سے نفرت کی ہے؛ اِسی لیے مجھے جلاوطنی میں موت آئی ہے۔''

گرین، جوزف ہنری (1791-1863) Green, Joseph Henry...... اُنیسویں صدی کا ایک ممتاز برطانوی سرجن۔ بسترِ مرگ پر اُس نے گہری سانس لے کر کہا: ''دم گھٹ رہا ہے۔ پھر اُس نے اپنی نبض دیکھی اور اعلان کیا ''رُک گئی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ مرگیا۔

گورڈن، جارج، لارڈ بائرن (1788-1824) Gordon, George...... اپنے دور کا مقبول اور بدنام ترین شاعر۔ بہت سے لوگوں کے خیال میں ''Don Juan'' اور اُس کی کچھ دیگر تحریریں سوانحی تفصیلات پر مشتمل ہیں۔ مرنے سے پہلے طویل بے ہوشی کے بعد آخری سانس سے پہلے وہ ہوش میں آیا اور کہا: ''شب بخیر۔''

گوئٹے، جوہان، وولف گینگ (1749-1832) Goethe, Johann...... جرمن مصنف،

ماہر حیاتیات اور دانش ور۔

''دوسرا روشن دان بھی کھول دو تا کہ مزید روشنی اندر آئے۔''

گوین، ایڈمنڈ Gwenn, Edmund(1875-1959)......ایک انگلش سٹیج ایکٹر جسے جارج برنارڈ شا نے متعارف کروایا تھا۔ بعد میں وہ ہالی ووڈ کا سٹار بنا۔ دو مرتبہ اکیڈمی ایوارڈ کے لیے نام زد ہوا اور ایک مرتبہ آسکر جیتا۔

''مرنا آسان ہے، کامیڈی مشکل ہے۔''

گیرٹ، جانی فرینک Garrett, Johnny Frank(?-1991)......گیرٹ نے 1981ء میں ایک کیتھولک نن کو قتل کیا اور موت کی سزا پائی۔

''میں تمام محبتوں اور چاہتوں کے لیے اپنے گھر والوں کا شکر گزار ہوں۔ باقی ساری دنیا جائے بھاڑ میں۔''

لارنس، سینٹ Lawrence, Saint(?-258)......رومن شہدا میں سے مشہور ترین۔ شہنشاہ ویلریئن کے دور میں عیسائیوں کے خلاف سخت تادیبی کارروائی شروع ہوئی۔ لارنس کلیسا کے خزانے کا انچارج بھی تھا۔ حکومت نے اُس سے کہا کہ سارا خزانہ حوالے کر دے اور اپنی جان بچا لے۔ لارنس مان گیا اور کہا کہ خزانہ جمع کرنے میں آٹھ دن لگیں گے۔ آٹھویں روز لارنس واپس آیا اور اُس کے ساتھ سینکڑوں غریب اور اپاہج آدمی، عورتیں اور بچے تھے۔ اُس نے کہا: ''یہ کلیسا کی دولت ہیں۔'' افسر نے غضب ناک ہو کر حکم دیا کہ لارنس کو برہنہ کر کے دہکتے ہوئے کوئلوں کے اوپر باندھ دیا جائے۔ اِس ساری آزمائش کے دوران لارنس مسکراتا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس کا رویہ دیکھ کر کئی رومن سینیٹر عیسائی بن گئے اور سینکڑوں شہریوں نے بھی مسیحی مذہب اختیار کیا۔

''پہلو بدل دو۔ میرا ایک پہلو پوری طرح بھن گیا ہے۔''

ماتا ہری Hari, Mata(1876-1917)......ایک ڈچ فوجی افسر کی بیوی جس نے 1904ء میں گھر بار چھوڑا، نام بدلا اور پیرس منتقل ہو گئی۔ وہاں اُس نے ایک برہنہ ''انڈین'' ڈانسر کے طور پر بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ فروری 1917ء میں اُسے جرمن چیف آف انٹیلی جنس کے ساتھ تعلق

کی بنا پر گرفتار کر لیا گیا۔ اُسے گولی مارنے کا حکم جاری ہوا۔ ماتا ہری نے ایک نرس سے کہا تھا:

''یہ سب کچھ نا قابلِ یقین ہے۔ موت اور نہ ہی زندگی کی کوئی حقیقت ہے۔ لہٰذا، موت، نیند اور معدومیت میں کوئی فرق نہیں۔ ہر چیز ایک سراب ہے۔''

مارکس، کارل Marx, Karl(1818-1883)......جرمن ماہر معیشت، فلسفی اور انقلابی جس نے اپنے دوست فریڈرک اینگلس کے ساتھ مل کر جدید سوشلزم اور کمیونزم کے نظریات پیش کیے۔ موت سے کچھ پہلے کسی نے آخری الفاظ ادا کرنے کو کہا تو اُس نے جواب دیا:

''چلے جاؤ یہاں سے! آخری الفاظ صرف وہی بے وقوف کہتے ہیں جنھوں نے زندگی میں کافی کچھ نہ کہا ہو۔''

مشیما یوکیو Mishima Yukio(1925-1970)......دائیں بازو کا جاپانی ناول نگار اور ڈرامہ نویس۔ اُس نے ہاری کیری رسم کے تحت خودکشی کی۔

''انسانی زندگی محدود ہے، لیکن میں ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہوں۔''

مور، تھامس More, Thomas(1478-1535)......ممتاز انگلش ریاست کار اور فلسفی جس کی مشہور تصنیف ''یوٹوپیا'' منطق پر مبنی مثالی معاشرے کا تصور پیش کرتی ہے۔ اُسے غداری کے الزام میں موت کی سزا دی گئی۔ اُس نے اپنا سر کٹنے کے لیے رکھنے سے قبل لمبی ڈاڑھی کو اچھی طرح سنوارا تا کہ جلاد کے وار سے وہ بھی نہ کٹ جائے۔

''یہ بات تو بادشاہ کو ناگوار نہیں لگے گی۔''

نوسٹراڈیمس Nostradamus(1503-1566)......اُس کی پیش گوئیوں کو تب شہرت ملی جب اُس نے طاعون کا علاج دریافت کرنے کا دعویٰ کیا۔ ہنری دوم کی توہم پرست بیوی کیتھرین ڈی میڈیچی نے نوسٹراڈیمس کی ایک پیش گوئی کو اپنے شوہر سے متعلق خیال کیا۔ ''نوجوان شیر ایک قومی میدان میں بوڑھے شیر پر فوقیت حاصل کر لے گا۔ وہ ایک سنہری پنجرے میں اُس کی ایک آنکھ پھوڑ ڈالے گا۔'' 1559ء میں ہنری ایک ٹورنامنٹ میں نیزہ بازی کا مقابلہ کرتے ہوئے ہلاک ہو گیا کیونکہ مخالف کھلاڑی کا نیزہ اُس کی آنکھ میں لگا تھا۔ تب کے بعد نوسٹراڈیمس کو بہت زیادہ شہرت مل گئی۔ اُس نے اپنی موت سے ایک روز قبل یہ تحریر چھوڑی تھی:

"کل میں یہاں نہیں رہوں گا۔"

ہالر، البریخت واں Haller, Albrecht von(1708-1777)......سوئس ڈاکٹر، سائنس دان اور شاعر۔ اُس نے گوٹنجن یونیورسٹی قائم کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

"میرے دوست، شریان کی دھڑکن ختم ہوگئی ہے۔"

ہائنے، ہائنرخ Heine, Heinrich(1797-1856)......جرمن شاعر، جس نے اپنی زندگی کے آخری برس پیرس میں گزارے اور انقلابی سیاسی صحافت میں مشغول رہا۔ 1845ء میں اُسے ریڑھ کی ہڈی کا ایک مرض لاحق ہوگیا اور وہ موت تک بستر سے لگا رہا۔ موت سے کچھ دیر پہلے اُس نے قریب موجود لوگوں سے کہا: "خدا مجھے معاف کر دے گا۔ یہ اُس کا پیشہ ہے۔" لیکن لگتا ہے کہ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اُس کے آخری الفاظ تھے:

"لکھو......لکھو......پنسل......کاغذ......"

ہل، جو Hill, Joe(1879-1915)...... ایک سویڈش تارکِ وطن جس نے امریکہ میں مزدوروں کو منظم کرنے کے لیے گیت لکھے۔

"میری موت کا سوگ نہ مناؤ۔ منظم ہو جاؤ۔"

ہیگل، جارج ولہلم Hegel, Georg Wilhelm(1770-1831)......جرمن فلسفی جس کی تحریروں نے مارکسزم پر گہرا اثر ڈالا اور اپنے ابہام کی وجہ سے بدنام تھیں۔

"صرف ایک آدمی مجھے سمجھ پایا۔ اور وہ بھی صحیح طرح سے نہیں سمجھا۔"

ہیل، ناتھان Hale, Nathan(1755-1776)......امریکی انقلابی۔ 1776ء میں اُس نے نیویارک سٹی میں برطانیہ کی جاسوسی کرنے کے لیے رضاکارانہ خدمات انجام دیں۔ پکڑے جانے پر اُسے پھانسی کی سزا ملی۔

"افسوس کہ مجھے اپنے ملک پر قربان کرنے کے لیے صرف ایک زندگی ملی ہے۔"

✿
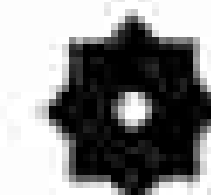
16

اقتباسات

ارسطو......"پڑھے لکھے اور اَن پڑھ میں وہی فرق ہے جو زندہ اور مردہ شخص میں۔"......"تعلیم یافتہ شخص غیر تعلیم یافتہ شخص سے اُسی قدر مختلف ہے جتنا کہ زندہ شخص مردے سے۔"

البرٹ آئن سٹائن......"تحیر اور تحسین کی اہلیت سے محروم ہو چکا شخص مردہ ہوتا ہے۔"......"موت کا خوف تمام قسم کے خوفوں میں سب سے زیادہ ناقابلِ توجیہہ ہے، کیونکہ مر جانے والے شخص کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آنے کا خطرہ نہیں ہوتا۔"......"میں روزانہ خود کو سینکڑوں مرتبہ یاد دلاتا ہوں کہ میری داخلی اور خارجی زندگی کا دار و مدار دیگر زندہ یا مردہ انسانوں کی محنتوں پر ہے، اور میں جواب میں اُنہیں بھی اُتنا کچھ دینے کے لیے سخت محنت کرتا ہوں۔"

البیر کامیو......"تو کیا سزائے موت سب سے زیادہ منظم قتل نہیں، جس کا موازنہ کسی بھی جرم سے نہیں کیا جا سکتا؟"

اتوک ایمی......"کوئی کائناتی حادثہ اُتنا دل گداز نہیں ہوتا جتنا کہ گھر کے کسی کونے میں چڑیا کے بچے کی موت کو غور سے دیکھتا ہوا بچہ۔"

ایپی قورس......"دیگر خرابیوں سے بچنا ممکن ہے، لیکن جہاں تک موت کا معاملہ ہے تو ہم ایک بے فصیل شہر میں رہتے ہیں۔"

ایڈی امین دادا......"کسی بھی ملک میں ایسے لوگ موجود ہونا لازمی ہیں جو مرنے کو تیار ہوں۔ وہ

امن وامان حاصل کرنے کی خاطر دی ہوئی قربانیاں ہوتے ہیں۔"

ایڈمنڈ برک...... "مردہ، زندہ اور آئندہ پیدا ہونے والے انسان کے درمیان معاہدے کا نام تاریخ ہی ہے۔"

ایڈورڈ جارج...... "دنیا کی تمام مخلوقات میں سے صرف انسان ہی سوال کرتا ہے: کیا مردہ شخص ہمیشہ کے لیے مرجاتا ہے؟ اور اِس سوال کو تحریک دینے والی جبلت انسان کو خدا کا جواب ہے، کیونکہ کوئی بھی جبلت بیکار نہیں۔"

ایرمالوئرے بوسیک...... "اگر کوئی شخص یکے بعد دیگرے تین فٹ بال میچ دیکھ تو اُسے قانونی لحاظ سے مردہ قرار دے دینا چاہیے۔"...... "کبھی کسی ایسے ڈاکٹر کے پاس نہ جائیں جس کے آفس میں رکھے پودے مرجھائے ہوئے ہوں۔"

ایسوپ...... "صرف بزدل ہی مرنے کے عمل کی شان وشوکت کو داغ دار کرتے ہیں۔"

ایگنس ڈی ملے...... "زندہ رہنا ایک بے یقینی ہے، یعنی یہ معلوم نہ ہونا کہ آئندہ میں کیا ہے۔ یہ معلوم ہوتے ساتھ ہی آپ تھوڑا تھوڑا مرنے لگتے ہیں۔"

ایلزبتھ کوبلرراس...... "کسی انسان کی پرسکون موت کو دیکھتے ہوئے ہمیں کسی ٹوٹے ہوئے ستارے کی یاد آتی ہے؛ آسمان پر جگمگاتی ہوئی لاکھوں روشنیوں میں سے ایک، جو لمحہ بھر میں ہمیشہ کے لیے جل بجھتی ہے۔"

ایلیشیا برنہارٹ...... "حقیقی محبت کبھی نہیں مرتی کیونکہ شہوت مندمل ہو جاتی ہے۔ محبت کے بندھن زندگی بھر قائم رہتے ہیں لیکن شہوت عارضی چیز ہے۔"

ایما گولڈمین...... "جب ہم مزید خواب دیکھنے کے قابل نہ رہیں تو مرجاتے ہیں۔"

ایمانوئیل کانٹ...... "خودکشی اِس لیے ناپسندیدہ نہیں کیونکہ خدا نے اُسے مکروہ قرار دیا ہے؛ بلکہ اُس کے ناپسندیدہ ہونے کی وجہ سے ہی خدا نے اُسے مکروہ قرار دیا۔"

ایمیلی ڈکنسن...... "کچھ لوگوں کے خیال میں کوئی لفظ بولے یا کہے جانے پر مرجاتا ہے۔ میرے خیال میں وہ اُسی روز جینا شروع کرتا ہے۔"

اے ای نیومین...... "موت فطرت کی جانب سے یہ بتانے کا طریقہ ہے کہ اب آپ اپنی رفتار سست کر دیں۔"

اے ساکس...... "موت زندگی سے زیادہ ہمہ گیر ہے۔ ہر ایک شخص مرتا تو ہے لیکن ہر شخص جیتا نہیں۔"

آسکر وائلڈ...... "جب دیوتا ہمیں سزا دینے کے خواہش مند ہوں تو ہماری دعا سن لیتے ہیں۔"

آلڈس ہکسلے...... "استقامت فطرت اور زندگی کے برعکس ہے۔ صرف مردے ہی مستقل ہوتے ہیں۔"

آئزک ایسی موف...... "زندگی خوش گوار اور موت پرسکون ہے۔ بس اِن کا عبوری مرحلہ پریشانی کا باعث بنتا ہے۔"

برائن آلڈس...... "جب بچپن مرجائے تو اُس کی لاش کو بالغ کہتے ہیں اور تب فرد معاشرے میں داخل ہوتا ہے جو جہنم کا ہی ایک نام ہے۔ اِسی لیے ہم بچوں سے خوف کھاتے ہیں؛ چاہے ہم اُن سے محبت ہی کرتے ہیں، لیکن وہ ہمیں ہماری حالتِ انحطاط دکھاتے ہیں۔"

برٹرینڈ رسل...... "محبت سے خوف کھانا زندگی سے خوف کھانا ہے، اور زندگی سے ڈرنے والے لوگ تین چوتھائی مردہ ہو چکے ہوتے ہیں۔"...... "بہت سے لوگ سوچنے کی بجائے مرنے کو ترجیح دیں گے۔"

بنجمن فرینکلن...... "اگر تم چاہتے ہو کہ موت کے فوراً بعد تمہیں فراموش نہ کر دیا جائے تو کچھ پڑھنے کے قابل لکھ جاؤ، یا پھر کوئی ایسا کام کر ڈالو جس کے بارے میں کچھ لکھا جا سکتا ہو۔"...... "موت اور ٹیکسوں کے سوا اِس دنیا کی کوئی بھی چیز یقینی نہیں۔"

جی بینڈر...... "میں نے جب بھی کوئی قابلِ قدر کام کیا...... فوراً موت سے خوف آنے لگا۔"

پال ایلرج...... "انسان کسی نظریے کے لیے مرنے کو تیار ہوتا ہے، بشرطیکہ وہ نظریہ اُس پر پوری طرح واضح نہ ہو۔"

پرل بیلی...... "عزم سے عاری زندگی بے جان ہے۔ محبت سے عاری باعزم انسان مردہ ہے۔ باعزم اور پرمحبت انسان ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔"

تھامس ایلوا ایڈیسن...... "کسی روز سائنس کے دماغ سے ایک اس قدر خوف ناک مشین یا قوت ابھرے گی کہ انسان بھی حیران رہ جائے گا اور ہمیشہ کے لیے جنگ کرنا چھوڑ دے گا۔"

تھامس براؤن...... "جب زندگی موت سے زیادہ خوف ناک ہو، تبھی جینا ایک حقیقی بہادری کا کام

ہوتا ہے۔" ..... "خدا کا شکر ادا کرو کہ موت تک جانے والی ہزاروں راہیں موجود ہونے کے باوجود ہم صرف ایک بار ہی مرتے ہیں۔"

تھامس کارلائل..... "ماضی کی کوئی بھی قابلِ قدر چیز رخصت نہیں ہوتی؛ نہ ہی انسان کی حاصل کردہ سچائی یا نیکی کبھی مرتی ہے۔"

تھامس مان..... "کسی شخص کی موت اُس کی بجائے پسماندگان کے لیے زیادہ اہم معاملہ ہوتی ہے۔"

جارج برنارڈ شا..... "شہادت واحد ایسا طریقہ ہے جس کے ذریعہ کوئی انسان اہل نہ ہونے کے باوجود مشہور ہو سکتا ہے۔" ..... "قتل سنسرشپ کی انتہائی صورت ہے۔"

جارج گورڈن بائرن..... "یہ احساس میری زندگی میں مہلک اور بوجھل ترین تھا کہ اب میں لڑکا نہیں رہا۔ اُسی لمحے سے میں بوڑھا ہونے لگا۔"

جان ڈن..... "کوئی بھی انسان ایک جزیرہ نہیں، بلکہ ایک براعظم کا حصہ ہے، کُل کا جزو۔ ہر انسان کی موت مجھ میں سے کچھ گھٹا دیتی ہے۔"

جان مینارڈ کینز ..... "طویل المدت میں ہم سب مردہ ہیں۔"

جوآن بوآز..... "آپ یہ انتخاب نہیں کر سکتے کہ کب اور کیسے مریں گے۔ آپ صرف یہ انتخاب کر سکتے ہیں کہ زندگی کو کیسے جئیں گے۔"

جورج لوئس بورجیس..... "کسی مذہب پر قطعی انداز میں عمل کرنے کی نسبت اُس کی خاطر مرنا زیادہ آسان ہے۔"

جیمز فرانسس بائرنس..... زیادہ تر لوگ موقعے کی بجائے تحفظ کے متعلق سوچتے ہیں۔ وہ موت سے زیادہ زندگی سے خوف زدہ لگتے ہیں۔"

خلیل جبران..... "ہزاروں سال قبل مر چکے ستاروں کی روشنی اب بھی ہم تک آتی ہے۔ یہی معاملہ عظیم لوگوں کا ہے جو صدیوں پہلے مر گئے لیکن اُن کی شخصیت کی شعاعیں اب بھی ہم تک پہنچتی ہیں۔" ..... "زندگی کے تمام اسرار دریافت کر لینے کے بعد آپ موت کی خواہش کرتے ہیں کیونکہ یہ زندگی کا ایک اور راز ہے۔"

ڈاکٹر آر جھناٹ..... "تمام سیاسی جماعتیں انجامِ کار اپنے ہی جھوٹ نگل کر جان دے دیتی ہیں۔"

ڈیل کارنیگی..... "کیا آپ زندگی سے اکتا گئے ہیں؟ تو خود کو کسی ایسے کام میں منہمک کر لیں جس پر دلی ایمان رکھتے ہوں، اُسی کی خاطر جئیں اور اُسی کی خاطر مریں۔ تب آپ کو ایک انوکھی اور کمیاب مسرت حاصل ہوگی۔"

ڈینیئل ڈیفو..... "بہترین انسان اپنے مقدر کو ٹال نہیں سکتے: اچھے لوگ جلد اور برے لوگ دیر سے مرتے ہیں۔"

رابندر ناتھ ٹیگور..... "چراغ کو گل کرنے کا نام موت نہیں؛ بلکہ صبح آ جانے کی وجہ سے چراغ کو بجھانا موت ہے۔"

رالف والڈو ایمرسن..... "موت یا تکلیف نہیں بلکہ موت یا تکلیف کا خوف اصل دہشت کا باعث ہے۔"

رچرڈ ایڈمز..... "مفکر کو موت آ جاتی ہے، لیکن اُس کے خیالات فنا کے دائرے سے ماورا ہیں۔ انسان فانی مگر نظریات لافانی ہیں۔"

سامرسیٹ ماہم..... "موت ایک نہایت غم ناک اور افسردہ معاملہ ہے؛ اور میرا مشورہ ہے کہ اس سے کوئی تعلق نہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔"

سٹیوارڈ السوپ..... "مرتا ہوا شخص مرنا چاہتا ہے، بالکل اُسی طرح جیسے خمار آلود شخص سونا چاہتا ہے، اور ایک وقت ایسا آتا ہے جب مدافعت کرنا غلط اور بے کار بھی ہو جاتا ہے۔"

سروانتیس..... "موت کے سوا تمام چیزوں کا علاج موجود ہے۔ موت ہمیں کسی نہ کسی دن ضرور چت کر دیتی ہے۔"

سورین کیرکیگارڈ..... "جابر فرماں روا کے مرتے ہی اُس کی حکومت ختم ہو جاتی ہے؛ جبکہ شہید کے مرنے پر اُس کی حکومت شروع ہوتی ہے۔"

سوفوکلیز ..... "موت سب سے بڑی برائی نہیں۔ اس سے بھی زیادہ بری چیز مرنے کی خواہش ہونے کے باوجود موت نہ آنا ہے۔"

سیمون دی بووا..... "انسان زندگی دینے کی بجائے زندگی کو خطرے میں ڈالنے کے ذریعہ حیوان کے درجے سے بلند ہوا؛ اسی لیے انسانیت میں برتری سیکس کی بجائے مارنے کی صلاحیت کو حاصل ہوئی۔"

سیموئل ٹیلر کالرج...... ''غضب کے عالم میں ہماری عجیب وغریب مابعدالطبیعیاتی آرا بستر مرگ پر لیٹے بچے کے پاس پڑے ہوئے کھلونوں جیسی ہوتی ہیں۔''

سینیکا...... ''کچھ لوگوں کے لیے موت ایک سزا، کچھ کے لیے تحفہ اور کچھ کے لیے ایک مہربانی ہوتی ہے۔''

شیکسپیئر...... ''کون ہے جو اپنی موت کا مرثیہ خود پڑھ سکے؟''

فرانسس بیکن...... ''اگر کوئی شخص قطعی یقین کے ساتھ آغاز کرے تو انجام کار شکوک سے دوچار ہو گا۔ لیکن اگر وہ شکوک کے ساتھ آغاز کرے تو انجام کار یقین تک پہنچے گا۔''..... ''انسان موت سے اُسی طرح خوف کھاتے ہیں جیسے بچے اندھیرے میں جاتے ہوئے ڈرتے ہیں؛ اور جس طرح کہانیوں کے ذریعہ بچوں میں یہ فطری خوف بڑھتا ہے اُسی طرح بڑوں میں بھی ہوتا ہے۔''....... ''مرنا بھی بالکل پیدا ہونے جیسا فطری عمل ہے؛ اور کسی ننھے بچے کے لیے یہ دونوں عمل شاید ایک جتنے ہی تکلیف دہ ہوں گے۔''....... ''پیدائش کے وقت بھی موت کچھ دور آ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ وہ ہر روز ہمیں دیکھتی اور یہ سوچ کر خوش ہوتی ہے کہ آج نہیں تو کل ہم پر جھپٹ پڑے گی۔''

فرینک گیلٹ برجیس...... ''اگر گزشتہ چند برس میں آپ نے کسی بڑی رائے کو رد نہیں کیا یا کوئی نئی رائے اختیار نہیں کی تو اپنی نبض چیک کریں، ہو سکتا ہے کہ آپ مر گئے ہوں۔''

کارل سیگاں...... ''میں اِس یقین کا دلدادہ ہوں کہ مرنے کے بعد میں دوبارہ زندہ ہوں گا، کہ میری ہستی کا کوئی سوچنے، محسوس کرنے اور یاد رکھنے والا حصہ جاری وساری رہے گا۔ لیکن میں اِس چیز پر جتنا زیادہ یقین کرنا چاہتا ہوں، اور دنیا بھر کی تہذیبوں میں حیات بعد از موت کا عقیدہ موجود ہونے کے باوجود، مجھے کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی جو اِس سوچ کو حقیقی یا منطقی ظاہر کرے۔''

کنفیوشس...... ''اگر ہم زندگی کو نہیں جانتے تو موت کو کیسے جان سکتے ہیں؟''

گلبرٹ کیتھ چیسٹرٹن...... ''بہادری اپنے مفہوم میں ایک تضاد رکھتی ہے۔ اِس کا مطلب ہے کہ مرنے کے لیے تیار حالت میں جینے کی خواہش۔''

گوتم بدھ...... ''آگ اور نہ ہی ہوا، پیدائش اور نہ ہی موت ہمارے نیک اعمال کو مٹا سکتی ہے۔''.....

''ہر چیز رو بہ تغیر ہے۔ ہر چیز ظاہر اور غائب ہوتی ہے۔ زندگی اور موت کے کرب سے ماورا ہوئے بغیر کوئی پُر مسرت طمانیت نہیں ملتی۔''

گیئس جولئس سیزر...... ''موت ایک سانحہ ہے۔''

لیونارڈ داونچی...... ''ہماری زندگی دوسروں کی اموات پر مشتمل ہے۔''..... ''ایسے لوگوں کی بات برداشت کرنا بہت مشکل ہے جو کہتے ہیں کہ 'موت کی کوئی حقیقت نہیں۔' موت موجود ہے۔ اور ہر موجود چیز اہمیت رکھتی ہے۔ اور ہر واقعے کے نتائج ہوتے ہیں۔ ویسے تو آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ پیدائش کی بھی کوئی اہمیت نہیں۔''

مارٹن لوتھر...... ''اگر انسان کو کوئی ایسی چیز نہ ملے جس کی خاطر وہ مر سکے تو اُسے جینے کا حق نہیں۔''

مارک ٹوین...... ''ہم تہہِ دل سے آدم کے ممنون ہیں۔ وہ دنیا میں موت لے کر آئے۔''

مارکس آریلیئس...... ''ایسا رویہ اختیار نہ کرو کہ جیسے تمہارے پاس زندہ رہنے کو دس ہزار برس ہوں؛ موت کسی بھی وقت آ سکتی ہے۔ جتنا بھی وقت ملا ہے، نیکی کرو۔''..... ''انسان کو موت سے نہیں بلکہ جینا شروع نہ کرنے سے خوف زدہ ہونا چاہیے۔''

مارگریٹ میڈ...... ''جب کوئی پیدا ہوتا ہے تو ہم خوشی مناتے ہیں، اُس کی شادی پر جشن بپا کیا جاتا ہے، لیکن جب وہ مر جائے تو ہم یوں ظاہر کرتے ہیں کہ جیسے کچھ بھی نہیں ہوا۔''

مائیکل اینجلو...... ''اگر ہم زندگی سے خوش رہے ہوں تو موت سے ناخوش نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ دونوں ایک ہی مالک کی دین ہیں۔''

مدر ٹریسا...... ''اُن لوگوں کی موت خوب صورت ہے جو جانوروں کی طرح زندہ رہتے اور فرشتوں کی طرح مرتے ہیں۔''

مہاتما گاندھی...... ''اِس طرح تعلیم حاصل کرو کہ جیسے تم نے ہمیشہ زندہ رہنا ہے۔ اور اِس طرح جیو کہ جیسے تم نے کل ہی مر جانا ہے۔''

میل بروکس...... ''ٹریجڈی یہ ہے کہ میری انگلی کٹ جائے۔ کامیڈی یہ ہے کہ میں کسی کھلے ہوئے گٹر میں گروں اور مر جاؤں۔''

نامعلوم...... ''کیا آپ جانتے ہیں کہ اِس علاقے میں موت کی شرح کیا ہے؟''--- ''جی ہاں، ایک فی فرد۔''

نامعلوم...... ''موت کی طرح محبت بھی ہر چیز کو بدل دیتی ہے۔''

نکوس کازانزاکس...... ''شاید آپ ٹھیک کہتے ہوں، باس۔ اِس کا دارومدار آپ کے سوچنے کے انداز پر ہے۔ دیکھو، ایک دن میں کسی چھوٹے سے گاؤں میں گیا۔ تقریباً نوے سال کا ایک بوڑھا ایک بادام کا درخت لگانے میں مصروف تھا۔ میں نے پوچھا، 'دادا جی، کیا آپ بادام کا درخت لگا رہے ہیں؟' وہ اُسی طرح جھکے جھکے گھوما اور کہنے لگا، 'بیٹا، میں ایسے کام کرتا ہوں کہ جیسے مجھے کبھی موت ہی نہیں آئے گی۔' میں نے جواب دیا، 'اور میں ایسے کام کرتا ہوں کہ جیسے اگلے ہی لمحے شاید مجھے موت آ جائے۔' باس، ہم دونوں میں سے کون ٹھیک ہے؟''

نکولو مکیاویلی...... ''میں مرنے کے بعد جنت کی بجائے دوزخ میں جانا چاہتا ہوں۔ دوزخ میں پوپس، بادشاہوں اور شہزادوں کی رفاقت حاصل ہوگی، جبکہ جنت میں صرف فقیر، راہب، تارک الدنیا اور پیغمبر ہوں گے۔''

نپولین بوناپارٹ...... ''مرنے کی نسبت تکلیف سہنے کے لیے زیادہ ہمت درکار ہے۔''

وٹگنسٹائن...... ''موت اِس دنیا کی حقیقت نہیں ہے۔''

ولیم لائبنز...... ''میں اکثر کہتا ہوں کہ ایک جرنیل کی نسبت ڈاکٹر کے ہاتھوں زیادہ انسان مرتے ہیں۔''

ونسٹن چرچل...... ''پیچھے مڑ کر دیکھنے پر مجھے ایک بوڑھے آدمی کی کہانی یاد آتی ہے جس نے کہا تھا کہ اُس نے زندگی میں کافی دکھ سہا، جس میں سے زیادہ تر کبھی حقیقی صورت میں ہی نہیں آ سکا تھا۔'' ......''میں اپنے خالق سے ملنے کو تیار ہوں۔ لیکن یہ الگ معاملہ ہے کہ میرا خالق مجھ سے ملنے کو تیار ہے یا نہیں۔''

ووڈ، ووڈسن...... ''کبھی کسی ایسے آدمی کو قتل نہ کرو جو خودکشی کرنے والا ہو۔''

ووڈی ایلن...... بات یہ نہیں کہ میں مرنے سے ڈرتا ہوں۔ بس اِتنا چاہتا ہوں کہ یہ واقعہ میری موجودگی میں پیش نہ آئے۔''

والٹیئر...... ''میں آپ کی رائے کو مسترد کرتا ہوں، لیکن آپ کے رائے دینے کے حق کی خاطر آخری دم تک لڑوں گا۔''

ویلا کارٹر...... ''میں زکام سے نہیں بلکہ جی کر مروں گی۔''

ہرمن ہیسے...... ''موت کی پکار محبت کی پکار ہے۔ اگر ہم اِس پکار کا جواب مثبت انداز میں دیں تو موت بہت پیاری چیز بن سکتی ہے۔''

ہنری وان ڈائک...... ''کچھ لوگ مرنے سے اتنا ڈرتے ہیں کہ کبھی جینا شروع ہی نہیں کر پاتے۔''

ہوریس...... ''حال کو تھام لو، کل کا کوئی بھروسہ نہیں۔''

ہولی نیئر...... ''لوگ یہ ثابت کرنے کے لیے قتل کیوں کرتے ہیں کہ لوگوں کو قتل کرنا غلط ہے؟''

ہومر...... ''اصل مشکل کسی دوست کی خاطر مرنا نہیں بلکہ کوئی ایسا دوست تلاش کرنا ہے جس کی خاطر مرا جا سکے۔''

ہیلن کیلر...... ''موت ایک سے دوسرے کمرے میں منتقل ہونے سے زیادہ کچھ نہیں۔ لیکن میرا معاملہ کچھ مختلف ہے۔ کیونکہ اُس دوسرے کمرے میں مَیں دیکھنے کے قابل ہوں گی۔''

یوجین ہیج...... ''دوست کے بغیر زندگی ایسے ہی ہے جیسے کسی گواہ کے بغیر موت۔''

یوری پیڈیز...... ''کوئی بھی شخص مرنے سے پہلے تک خوش نہیں ہوتا۔''
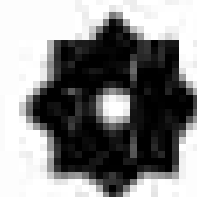
کتابیات

Encyclopaedia Britannica 2005 Deluxe Edition CD-ROM.

Encarta Encyclopedia Standard 2005.

Encyclopedia of Religion (Macmillan).

Encyclopedia of Religion and Ethics (Edited by James Hastings).

Death and Dying, by Elizabeth Kubler Ross.

Billions and Billions, by Carl Sagan.

The Meaning of Death, Edited by Herman Feifel.

Life and Death Instincts, by James Hammond.

Scientific Theories of NDE, by Jean Richie.

Death and Dying, by Digvijay Singh and S.H.Nizaie.

Sacred Art of Dying, by Kenneth Kramer.

The Child's Dicovery of Death, Anthony, S Harcourt.

.*Suicide as a Magical Act, by* Wahl, C.W.

Internet Encyclopedia of Quotations.